

مکمل کتابیں آن لائن اور آڈیو کتابیں

سے اونی

ابھار

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.



www.PakistaniPoint.Com

aanchalpk.com aanchalnovel.com

سے افاق

دکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
دکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ڈائریکٹرز
دکن جوائنٹ ایف ایس ایس



پاکستان (فی پرچہ) 50 روپے
پاکستان (سالانہ) 600 روپے



0300-8264242



aanchalpk.com

aanchalnovel.com

 naeyufaqonlinemagazine

aanchal.com.pk/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

editorufaq@aanchal.com.pk



مدیر اعلیٰ
مشفق احمد قریشی
مدیر
اقبال جینی
مدیر معاون
طس ابرار احمد قریشی
مستقیمین
نور الدین



جلد	41
شمارہ	09
اکتوبر 2017	





پبلشر مشتاق احمد مندریشی پرنٹرز جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 مندریدہ جمیہ سردار عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی



دستک

مشتاق احمد قریشی

موتے تم دوست جس کے

قیام پاکستان کو ستر سال پورے ہوئے اس عرصے میں کئی حکمران آئے گئے لیکن وطن عزیز کے مصائب ممالک سے معاملات، درست ہونے کی بجائے روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہیں مسئلہ کشمیر کو بھی یوں تو ستر برس ہی ہونے لگائے مسئلہ کشمیر کے معاملے میں تو اقوام متحدہ بھی ایک فریق ہے ستر برس قبل اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ کشمیری عوام کو حق خود اختیاری دیا جائے گا لیکن آج تک اس قرارداد پر عملدرآمد ہونا تو دور کی بات اقوام متحدہ اس کے بارے میں ذکر تک نہیں کرتی نہ ہی ہمارے حکمرانوں کو اتنا ہوش ہوتا ہے کہ وہ جنرل اسمبلی کے موقع پر ہی کچھ اس بارے میں بات کریں اور اقوام عالم پر زور دیں کہ وہ خطے کے امن کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرائے دو جو ہری قوت کے ممالک بھارت اور پاکستان دونوں ہی مسئلہ کشمیر سے جڑے ہوئے ہیں اور مسئلہ کشمیر کوئی معمولی یا غیر اہم مسئلہ نہیں ہے اگر خدا نخواستہ کسی وقت بھارتی حکمرانوں کا بھیجا گھوم گیا اور انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور بائبل پن کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھالیا جس سے خطہ میدان جنگ میں بدل جائے تو یقیناً دونوں اطراف کی خیر نہیں صرف مسئلہ کشمیر ہی اتنا اہم اور غیر معمولی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے جس کی وجہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے پاکستانی حکمرانوں کی کاہلی سستی اور مفاد پرستی ہی ہے جو بھارتیوں کو شہ دیتی ہے اور وہ بھی پاکستانیوں کا حوصلہ چپک کرنے کے لیے پاک بھارت سرحد پر تخریبی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں جس کا فوری جواب افواج پاکستان دے کر انہیں اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے دونوں اطراف کی افواج آئے سانسے کھڑی رہتی ہیں ماضی میں بھی بھارت نے اپنی من مانی کی تھی اور منہ کی کھا کر وہ گئے تھے بھارتی حکمرانوں اور سیاست دانوں کا بس نہیں چلتا کہ وہ پاکستان تو کیا مسلمان قوم کو ہی ختم کر دیں یہ معاملہ صرف بھارتیوں کا ہی نہیں بلکہ تمام یہود و نصاریٰ کا یہی موقف ہے بھارت میں آئے دن مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہتا ہے کشمیر میں بھی ہر روز خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے کشمیری نوجوانوں نے خصوصاً اور تمام کشمیری مسلمانوں نے عموماً اپنی بقا اور آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے وہ اپنی تحریک کو اپنے خون سے تنیخ رہے ہیں کشمیری جوانوں کی یوں تو کئی تحریکیں کام کر رہی ہیں اس وقت جو سب سے پیش پیش ہے وہ تنظیم حزب المجاہدین ہے جسے بھارت نے اپنے سفارتی ذرائع کے ذریعے امریکا سے دہشت گرد تنظیم قرار دلوادیا ہے اس سے قبل امریکا اور اس کے حواری لشکر طیبہ کو وہ دہشت گرد قرار دے چکے ہیں کیونکہ بھارت کی پوری کوشش ہے کہ لشکر طیبہ کے سربراہ مولانا مسعود اظہر کو بھی کسی نہ کسی طرح دہشت گرد قرار دلوادیا جائے وہ تو چھپن پاکستان کی حمایت کے باعث آڑے آ گیا اس نے محل کر مولانا مسعود اظہر کو وہ دہشت گرد گردانے کی کوشش کو واضح الفاظ میں رد کر دیا۔ مسلم دنیا حیران ہے کہ سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کشمیر کے مسئلے پر ستر برس گزرنے کے باوجود نہ صرف خاموش ہے بلکہ بھارت کی طرف داری کر رہی ہے بھارتی افواج کی کثیر تعداد کشمیر میں موجود ہے اور وہ کشمیری مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑ رہی ہے دنیا تماشا دیکھ رہی ہے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی اس کی تمام تر ذمہ داری ہمارے حکمرانوں پر آتی ہے بھارتی افواج مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی لہر کو دبانے کے لیے بھرپور ظالمانہ کارروائیاں کر رہی ہے پاکستانی حکمران زبانی کھلی کمزور سے بیان دے کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں حالانکہ کشمیر کو شہ رگ کہتے اور سمجھنے والوں کو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ آج کشمیری قوم اپنے سردھڑ کی بازی لگا کر سر سے کفن باندھے پاکستان سے الحاق کا نعرہ لگا رہی ہے اور پاکستان کے پرچم لہرا رہی ہے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں پاکستان کا مطلب کیا کہ نعرے لگا رہے ہیں وہ تو پاکستان

سے گلے ملنے کے لیے سردھڑکی بازی لگا رہے ہیں لیکن پاکستانی کانوں میں تیل ڈالے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

بھارتی حکمران اور اہل سیاست نے یہ شیوا لٹا لیا ہے کہ پاکستان کو داخلی مسائل میں اس قدر الجھا دو کہ وہ اپنی بوئیاں نوچتا رہے اسے اس کا ہوش ہی نہ رہے کہ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے بھارتی ایجنسی راکا ایک بہت فاعل ہر کار اٹھو شٹن یادو ہاتھ لگا اور سب کچھ اس نے اگل بھی دیا لیکن سب بے سود نہ حکومت نے عالمی سطح پر نہ خارجی سطح پر کوئی موثر احتجاج یا کوئی ایسی مہم جوئی نہیں کی جس سے بھارت کی سیاہ کارستانیوں کا پردہ فاش ہوتا اور اقوام عالم کو گروہوں نہ جی آتا تو بین الاقوامی سطح پر بھارتی جرائم کا ڈھنڈو تو پٹا لیکن ہمارے مہربان حکمرانوں اور اہلکاروں کے باعث بھارت مظلوم بن کر عالمی عدالت چلا گیا اور ہم اب اپنی صفائیاں پیش کرتے رہیں گے اقبالی مجرم ہاتھ آنے کے باوجود اپنی آزادی کا منتظر ہے حالانکہ اب تک تو اسے وصل جنم ہو جانا چاہیے تھا لٹا چور کو تو ال کو ڈالنے کے مصداق بھارت پاکستان پر جارحیت کی الزام تراشی کر رہا ہے جبکہ وہ خود جارحیت کر رہا ہے وطن عزیز میں گزشتہ ساڑھے تین سال سے کوئی وزیر خارجہ ہی نہیں رہا تو کون تھا جو بھارت کے خلاف اس کے الزام تراشیوں اور مذموم کاررائیوں کا جواب دیتا ہماری مصلحت پسندی اور اہل سیاست کا جاہلانہ غریبوں کے باعث بھارت کو شہ ملتی رہی ہے اس سبب ہی تجزیہ نگار اکثر نااہل ہونے والے وزیر اعظم میاں نواز شریف پر الزامات لگاتے رہتے تھے کہ ان کا تجارتی تعلق چونکہ بھارت سے ہے اس لیے وہ بھارتی حکمرانوں سے دیتے ہیں اور ان سے دوستی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے مالی مفادات کے لیے مجبور ہیں کہ بھارت کی من مانیوں پر خاموشی اختیار کریں یا بہت کمزور سیانیاں دیں میاں صاحب کی ان ہی کمزوریوں کے باعث بھارت نے وہ پر پرزے نکلے ہیں کہ قوم حیران و پریشان ہے آخر افواج پاکستان کہا تک اہل سیاست کی کمزوریوں پر پردہ ڈالتی رہے گی اور آپریشن پر آپریشن کا سہارا لیتی رہے گی میاں صاحب کی نااہل ہونے پر بھی آنکھیں نہیں کھل رہیں اور اب بھی خواب غفلت کا شکار ہیں بھارت دو طرفہ کاروائیاں کر رہا ہے ایک طرف افغانستان اور ایران سے مل کر سرحدوں پر اور اندرون سرحد خراجی کارروائیاں کر رہا ہے تو دوسری طرف مشرقی سرحد پر جارحانہ کارروائی کر رہا ہے اور کشمیر میں نت نئے جرائم و مظالم کر کے پاکستان کو بدنام کر رہی مہم کر رہا ہے پاکستان کو غیر منظم کرنے کے لیے وہ طرح کے حربے استعمال کر رہا ہے میاں صاحب نااہل ہونے سے پہلے اور بعد میں سازش سازش کاروٹا تو رہے ہیں لیکن انہیں یہ نظر نہیں آ رہا کہ ان کے خلاف سازش ان کے من پسند اور دوست زیندہ رمودی کر رہا ہے اس کے ہی اشارے پر اس اس کے خاص الخاص قوی سلامتی کے شیر اپنی پوری قوت سے برس بیکر ہے وہ اپنے دست راست مٹھوشن یادو کو ہر قیمت اور ہر حال میں چھڑانا چاہتا ہے چاہے اس کے لیے اسے پورے پاکستان کو بارود سے اڑنا پڑے وہ اس سے گریز نہیں کرے گا میاں صاحب اور ان کے تمام شیران و احباب کے سر پر اس وقت ایک ہی بھوت سوار ہے کہ کس طرح عدلیہ کو ناکام ثابت کر کے اپنی نااہلی کو ختم کیا جائے اس کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار بیٹھے ہیں، ادارے تباہ ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں عوام کا کیا ہے اگر ہمارے عوام جہنم میں جاتے ہیں تو بلا سے جائے لیکن میاں صاحب کا الو جس طرح بھی ہو سکتا ہے سیدھا ہو جائے تاکہ وہ ایک بار پھر مند اقتدار پر براجمان ہو سکیں عدلیہ کے فیصلے نے میاں صاحب اور ان کے حواریوں کو ہوا سا باختہ کر دے ان کا بس نہیں چل رہا کہ وہ ہر ایک کو بس نہیں کر دیں جو ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو انہیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ مشرقی اور مغربی سرحدوں پر کیا ہو رہا ہے اندرون ملک اور بیرون ملک پاکستان کی کیسی بدنامی ہو رہی ہے کیسے وطن عزیز کی لٹا ڈوبنے کی کوشش کی جا رہی ہے اگر دیکھا جائے تو میاں صاحب خود بھی اس کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں ہمیں کسی بیرونی دشمنی کی کیا ضرورت ہے ہم تو خود اپنے دشمن بنے ہوئے ہیں ہونے تم دوست جس کے دشمن آسمان کیوں ہو۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہمارے وطن عزیز کی ہر طرف سے ہر طرح سے حفاظت فرمائے اور دشمنان پاکستان کا منہ کالا کرے آمین۔



گفتگو

اقبال بھٹی

”حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم و تکریم کی تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو اس کی تعظیم کرے گا۔“ (الترمذی)

عزیزان محترم..... سلامت باشند۔

تمام مسلمانوں کو جبری سال نومبارک ہو۔

اکتوبر کا شمارہ حاضر مطالعہ ہے اس ماہ محترم ابن صفی کی برسی کے حوالے سے ”گوشہ ابن صفی“ کا دوسرا حصہ شامل اشاعت ہے مضامین کی تعداد اور ان کے چاہنے والوں کی محبت کے پیش نظر ہم نے فن پاروں کے صفحات بھی ان کے لیے مختص کر دیے ہیں یہ مضامین یقیناً قارئین کو پسند آئیں گے یہ تحریریں بھی کسی طور فن پاروں سے کم نہیں۔

اس ماہ محترمہ مریم جہانگیر کا طویل ناول ”حصار“ کا پہلا حصہ شامل اشاعت روایات سے ہٹ کر لکھے جانے والے اس ناول کو آپ یقیناً پسندیدگی کی سند دیں گے مریم جہانگیر نے یہ ناول بطور خاص نئے افق کے لیے لکھا ہے آئندہ ماہ سے معروف ناول نگار فارس مغل کا تین حصوں پر مشتمل ناول ”ہم جان“ شامل اشاعت ہوگا فارس مغل اکیسویں صدی کے ابھرتے ہوئے ناول نگار ہیں بقول خالد شریف کے فارس مغل کا قلم معجزے تخلیق کرتا ہے وہ نثر میں شاعری کرتا ہے یقیناً وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ اب آئیے اپنے خطوط کی طرف۔

دستگیر شہزاد..... ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ میرے اپنے بھائی اقبال بھٹی صاحب السلام علیکم آپ سے اور محترم طاہر احمد قریشی صاحب جیسے ادبی قطب میناروں کو بھائی کہتے ہوئے مجھے وہی سرور آتا ہے جو ہمارے ایک دیرینہ محبت سردار محمد عظیم کو اپنے دو بھائیوں کو بیک وقت لیفٹیننٹ جنرل کے ریک پر فائز دیکھ کر آیا تھا آپ تو ادب کے چار اشار جنرل ہیں نئے افق کا تازہ شمارہ پاکر خوش ہو گیا اتنا دلکش اور پرکشش تحفہ جس کا طشت ہیروں جیسے الفاظ کا ڈھیر ہے پھول بھی ہیں انکارے بھی شعر و ادب کے نفس میں بند بچپاں بھی ہیں۔ نئے افق پڑھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ جگہ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب، محترم عمران احمد قریشی صاحب، محترم طاہر احمد قریشی صاحب اور آپ ہاتھوں اور قلم سے نہیں عاشقی کی انگلیوں سے سرشاری کی سیاحتی میں ڈبو کر لکھتے ہیں میں اکادمی ادبیات پاکستان کے ”ادبیات“ اخبار اردو، ماہ نور عطا الحق قاسمی صاحب کے معاصر حسن عباس کے ارڈنگ روزنامہ جنگ لاہور اور نئے افق میں لکھتا ہوں نئے افق میں شائع ہونے کے بعد اگر کسی دوسرے پرچے نے میری کہانی شائع کی ہے تو مجھے معلوم نہیں میری کہانیاں ہندوستان کے معروف ادبی میگزین نیا ورق ایڈیٹر شاداب رشید واستعارہ ایڈیٹر محمد صلاح الدین پرویز اور پاکستان سے نئے افق میں بیک وقت شائع ہوتی ہیں کسی صاحب نے خط لکھ کر

کمال کر دیا بھلا کبھی لال بیک بھی گھڑوں کی صفائی کرتے دیکھے گئے ہیں ہم اندھوں سے راستہ پوچھتے ہیں لنگڑوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچنا چاہتے ہیں ہم بیک وقت بھیک مانگنا اور سکھول چھپانا چاہتے ہیں ہم وحشی وائی کنگز سے عقل کی حکمرانی چاہتے ہیں ہم بردہ فروشوں سے اپنے بچوں کی رکھوالی مانگتے ہیں ہم نے مردار خور گدھوں کو شاہین سمجھ رکھا ہے ہم نے اپنی ہاتھکڑیوں کو سونپ دی ہے ہم نے زخموں کے علاج کے لیے کوئے اور کیڑے پال رکھے ہیں ہم تہذیبی کے لیے زلزلہ اور زرخیزی کے لیے سیلاب پسند کرتے ہیں ہم دھوکے سے بچنے کے لیے آگ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں ہم گھروں کی بنیادیں نمک کے ڈلوں سے تیار کرتے ہیں ہمیں دست قاتل پر بوسے دینے کی بیماری ہے ہم بونوں کے بل بوتے پر آسمان چھونا چاہتے ہیں ہم کھوپڑیوں کی بجائے معدوں میں دماغ ڈھونڈتے ہیں ہمارا بارود گیلا، تلواریں زنگ آلود اور ڈھالیں لکڑی کی ہیں ہم سانپوں کی رسی سے کمند بنا کر قلعہ فتح کرنا چاہتے ہیں گدھوں پر بیٹھ کر ڈربی نہیں جیتی جاسکتی، عالم بغیر عمل کے درخت بغیر پھل پھول اور سائے کے توپ بغیر گولے کے قانون بغیر عمل درآمد کے کنواں بغیر پانی کے انسان بغیر تقیم و ضبط کے معاشرہ بغیر انصاف کے سب را کھ کا ڈھیر ہے لیکن اس وقت جعلی اردو دانی کی کمائی کتنا میرا موضوع نہیں میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان کے اندر چھپے ہوئے انسان کو لگام دینے کے لیے ہزاروں سال سے کیا کچھ نہیں لکھا گیا؟ اس عظیم الشان ناکام انسانی جدوجہد کی طرف یہ چند اشارے ہی کافی ہوں گے انسان کے انسان ہونے کا امکان ہوتا تو الہامی کتابوں کے بعد بصد کسی تحریر کی ضرورت تھی لیکن یہاں تو اقبال تک کو اعتراف کرنا پڑا کہ

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

ایسے میں انسانی تحریریں اس کی جہلت اور رعلت سے کہاں تک برسر پیکار رہ سکتی ہیں کراچی تو کراچی ہے نیو یارک میں بجلی چلی جائے یا لندن میں انسانی فیوز اڑ جائے تو اچھے بھلے انسانوں کے اندر سے حیوانوں کے غول در غول برآمد ہوتے ہیں ہزاروں سال کی مسلسل مشقت کے بعد بھی انسان پر انسان کا صرف میک اپ ہی کیا جاسکتا ہے غیظ و غضب یا خود غرضی کی ایک بارش یہ میک اپ اتار دیتی ہے تو انسانی چہروں کے اندر سے بھیڑیے نکلتے ہیں اور پوری بند لاشوں کے بازار سج جاتے ہیں اگر جہلت اور خصلت ہی یہ ہے تو یہاں کنفیوشن کے قول اور کالی داس کی گیتا کیا کرے گی فردوسی کے شاہنامہ سے کوئی کیا سیکھے گا؟ مثنوی مولانا روم کہاں بیٹھ کر روئے گی اور سعدی کی گلستان بوستان ٹارگٹ کلر کو کتنی سمجھا نہیں گی کلیہ وضع ہو یا الف لیلا، دلہلی دانستے کی ڈیوائن کامیڈی ہو یا بلھے شاہ کا کلام حافظ و عمر خیام کے دیوان اور رباعیات ہوں یا ڈیکارت کی میڈی ٹیٹنر میکسم گورکی ماں ہو یا روسو کا معاہدہ عمرانی سور کی یوٹیو پیہا ہو یا نالسانی کا دار اینڈ ٹین جینوف موسپاں یا منٹو کی کہانیاں ہوں یا میاں محمد کی شاعری بھگوت گیتا یا مونٹین کے مضامین جان ملٹن کی Paradise Lost یا استاد دم سمٹھ کی دلی ویٹھ آف نیشنز یا گوگول کی مردہ روح کا لٹھس کا نظریہ بادی ہو تھا س کا رلائل ہمنگوئے کی فیمر ویل ٹو اور کوئی موٹی پا سچر ہو یا ایڈی سن اور فورڈ برراٹ ہو یا جیک کلی فرانس کرک ہو یا رابرٹ گیلو، کوئی برنزلی ہو یا نیورنگ جو انسان کو نیشنلوجی کے آسان تک پہنچا دیتے ہیں لیکن نتیجہ کیا آرٹ میں پکا سو میوزک میں مائیکل جیکسن جیسا جنین سائنس و فزکس میں نیوٹن کا راڈے اور فورڈ یا اسٹیفن لی کنگ جیسی جدید بلائیں یا جان ڈائن اور کارل پانگ جیسے کیمیا گر انسان کو

غصہ خود غرض ہوں لالچ سے نجات نہیں دلا سکے تو میری کہانی نئے افق سے لے کر دوسری جگہ چھاپنا کیا پدی کیا پدی کا شور بہ۔ دوستوں دنیا میں شاید ہی کوئی ملک پوچھ کے حوالے سے پاکستان کا مقابلہ کر سکے کہ ان جیسی بھاری اکثریت شاید ہی کسی ملک کو نصیب ہو کہ یہ جوانی نیا گرافال سے زیادہ مشہور کن تاج محل سے زیادہ خوب صورت سندربن سے زیادہ پراسرار پسیا کے مینار سے زیادہ ٹیڑھی، اہرام مصر اور دیوار چین سے زیادہ حیران کن سپر پاور سے زیادہ طاقت ور اندھی ڈولفن سے زیادہ اندھی خود کش بمبار سے زیادہ بے وقوف پہلے سے زیادہ پیچیدہ ارسطو سے زیادہ دانا حاتم سے زیادہ سخی پھول سے زیادہ نرم، نازک فولاد سے زیادہ سخت سورج سے زیادہ روشن بلیک ہول سے زیادہ ناقابل فہم پانی سے زیادہ پتلی خون سے زیادہ گاڑھی لیکن لیکن ریت کی دیوار سے زیادہ ناپائیدار ہوتی ہے، میں نے ہمیشہ سچ لکھا ہے علم اور انفارمیشن کا تخلیقی استعمال کبھی نہیں بھولا کہ مصوری سے لے کر موسیقی اور مجسمہ سازی سے لے کر شاعری و نثر نگاری تک جب کوئی فن اپنے عروج کو پہنچتا ہے تو اس میں تین خصوصیات لازمی ہوتی ہیں اول سادگی دوم برجستگی اور سوم اور بچکنی خدام ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

اجید احمد جانی ملتان شریف، مزاج گرامی! اُمید ہے خیر و عافیت سے خوشیوں بھری زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام بیماروں کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور اسن و خوشیوں بھری زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رحمتوں، نعمتوں اور بے بہا خزانوں سے نوازتا رہے۔ آمین ثم آمین! ماہ ستمبر 2017 کا نئے افق عید الاضحیٰ کی مبارک باد دیتا ہوا بروقت ملا گیا۔ لگے ہاتھوں ہماری طرف سے نئے افق کی تمام ٹیم اور قارئین لکھاریوں کو دلی طور پر عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ دستک میں محترم جناب مشتاق احمد قریشی ”کوئی تو ہے“ کے عنوان سے ملکی جمہوریت پر لکھ رہے تھے۔ جہاں اچھے لوگ ہوتے ہیں وہاں بُرے بھی ہوتے ہیں اسی طرح جہاں بُرے لوگ ہوتے وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں۔ ہمارا دتیرہ بن گیا ہے کہ ہم خامیاں تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اچھائی کی طرف ہم جانا نہیں چاہتے۔ بحر حال اچھے کی امید رکھتے ہیں اور مشتاق احمد قریشی کی آواز کے ساتھ بلیک کہتے ہیں کہ ”اؤنٹ گس کروٹ بیٹھے گا“ اللہ تعالیٰ پاک دُن کو ہر آفت، ہر مشکل اور شیطانی عناصر سے محفوظ رکھے اور آنے والے وقت میں نیک و صالح قیادت سے نوازے آمین! گفتگو کی محفل میں پہنچے تو محترم اقبال بھٹی کو اپنے روبرو پاکر دل خوشیوں سے نہال ہو گیا۔ دل سے دعا نکلی پونہی ہمارے درمیان رہیں اور صحت کی بادشاہت کے منصب پر فائز رہیں۔ آمین ثم آمین۔ ماہ اگست کے نئے افق کے پرچے میں میرا تبصرہ لگا۔ کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے عورت کو فساد کی جڑ لکھا گیا۔ آپ کا موقف بالکل درست ہے میرا مقصد تو بین نہیں۔ میں عورت کی قدر کرتا ہوں اور میری کہانیوں میں عورت کے کرداروں میں دیکھ سکتے ہیں کہ ہمیشہ عورت کے مقام، عزت و احترام کی جنگ لڑی ہے۔

اقراء ہمیشہ کی طرح زبردست ہے۔ انٹرویوز کے سلسلے میں دیگر شہزاد نے مختصر پیرائے میں خوبصورت اور مدلل اور جامع لفظوں میں عشنا کوثر سردار کے فن کا احاطہ کیا ہے۔ زریں قمر صاحبہ نے ایکس ون خوبصورت لکھا، عرفان رائے کا فن سامنے آ رہا ہے بازگشت کی صورت میں انہوں نے کمال تحریر دی۔ بچوں کی دُنیا میں چھائے ہوئے ہیں اور تجسس اور جاسوسی کہانیاں کمال کی تحریر کرتے ہیں۔ جرم، مہتاب خان صاحبہ نے زبردست لکھی۔ یہاں بھی ایک مرد قربانی دے رہا ہے لیکن صدر صاحب کی مہربانی سے اُسے رہائی مل گئی، یہ بھی خوش آئند بات

ہے اور کہانی کے حسن کو بڑھاتا ہے۔ مہتاب خان صاحبہ کی ہر تحریر جاندار اور شاندار ہوتی ہے۔ ”نفس کے قیدی“ ریاض بٹ صاحب اس بار آپ نے مایوس کیا۔ بے شک کہانی کا پلاٹ بہترین ہے لیکن اول تو اس میں غلطیوں کی بھر مار ہے 27 غلطیاں یا تو آپ کی لکھت کی وجہ سے ہیں یا کمپوزنگ کرتے ہوئے ہوئیں لیکن کہانی کی چاشنی اور مزہ جاتا رہا۔ اور ہاں نذیر نے بھیڑ یا گھر میں پال رکھا تھا، کوئی بھی درندہ پہلے وار سے باؤلا نہیں ہوتا وہ تو پھر بھی پالتو جانور تھا۔ نذیر اتنا دور تھا کہ وہ پہنچ کر بابا علی کو بچا نہیں سکتا تھا، جبکہ بھیڑیے نے تین بکریاں گرا دیں پھر بابا علی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اتنی دیر میں تو نذیر کا پہنچ جانا بنتا ہے۔ جانور تو اپنے مالک کی مانتے ہیں۔ اُمید ہے مجھ سے اتفاق کریں گے۔ بھوتوں کی جیل، تجربہ، تلخ یادیں، اجڑا عشق خوب رہیں اور گوشا ابن صفی خوب سجایا گیا۔ کیا ہی ممکن ہوتا ریاض بٹ صاحب سے ایک مضمون لکھوایا جاتا کیونکہ ان کا اسلوب ابن صفی سے ملتا ہے ان کی تحریریں پڑھ کر کہانیاں لکھنے شروع کی ہیں۔ مرشد اپنے رنگ میں رنگ رہا ہے۔ مستقل سلسلے خوب رہے۔ خط طوالت پکڑتا جا رہا ہے، اختتام کرتے ہیں باقی تفصیلی تبصرہ اگلی بار۔ بشرط زندگی۔

صائمہ نور..... ملتان آداب! اُمید کرنی ہوں ہنستے مسکراتے اور صراطِ مستقیم والی زندگی سے لطف لیتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم اور نوازشوں سے شاد اور آباد رکھے آمین۔ ماہِ ستمبر کانٹے افق اپنے تمام رنگوں سے مزین جلد مل گیا۔ حسین و جمیل لڑکی ماتھے پہ نیکا سجائے مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ عید کی تیاریاں کر رکھی تھیں اور ساتھ عید الاضحیٰ کی مبارک باد بھی دے رہی تھی۔ خیر مبارک۔ میری طرف سے تمام اہل ایمان، اہل مسلم کو عید کی خوشیاں ڈھیروں ڈھیروں مبارک ہوں۔ دستک میں میرے اکل مشتاق احمد قریشی صاحب خوب اور مدلل ملکی حالات پر کالم لکھ رہے تھے۔ آج کل دوہی پارٹیاں ایک دوسرے کے لئے لے رہی ہیں۔ کوئی تو ہے جو حق سچ کی کہہ رہا ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سچ کا زمانہ نہیں رہا۔ بحرِ حال اونٹ کس کر دٹ بیٹھتا ہے وقت کی رفتار ہی بتائے گی۔ گفتگو کی محفل میں حدیث مبارک پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے تو ریحانہ سعیدہ کو صدقات کی کرسی پر پر جمان دیکھا۔ کافی عرصہ بعد آئی ہیں۔ اب غیر حاضر نہیں ہوتا۔ ریاض بٹ حسن ابدال بھائی میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کی خیریت مطلوب چاہتی ہوں۔ آپ جیسے بھائیوں کی دعاؤں کے صدقے زندہ سلامت اور سکھی ہوں۔ آپ کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں تو تعریف ہوتی ہے ورنہ مکھن مجھے نہیں لگانے آتے۔ آپ کے علاقے حسن ابدال سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ خوبصورت علاقہ، خوبصورت لوگ اور وہاں کے لوگوں کا رہن سہن ملتان سے ملتا جلتا ہے۔ محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ مسکان ظفر بھٹی صاحبہ، ایک تو آپ تین تین چار چار ماہ غائب رہتی ہیں اور جب کبھی کسی پر کچھ اچھا نالہ ہو، اپنے اندر کا زہر باہر نکالنا ہو تو نئے افق کا پلیٹ فارم استعمال کرتی ہیں۔ آپ کے خط میں نئے افق پر درود و درتک تبصرہ نہیں ہے۔ محمد رفاقت صاحب مختصر خط، پُرس افضل شاہین اللہ تعالیٰ آپ کو سدا سلامت رکھے اور بھابھی جان کو بھی۔ ریاض حسین قرآپ کی حاضری سے دل خوش ہو جاتا ہے۔ سدا آتے رہیں۔ اقراء زبردست جا رہا ہے اور دیکھیں شہزادہ خوبصورت لفظوں کو تراش خراش کے عشنا سردار کوثر کے فنی جائزہ لے رہے تھے، ایکس ون نے اچھا تاثر قائم کیا۔ بازگشت کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ جرم میں مہتاب خان نے نئے موضوع میں جان ڈال کر بحسب اور اسرار بیت سے بھرپور تحریر لکھی اور آخر میں اُس کو رہائی مل گئی۔ زبردست۔ اجڑا عشق، تجربہ، بھوتوں کی جیل، جامن کا درخت، تلخ یادیں، نقش

چھوڑ گئیں۔ نفس کے قیدی نے اچھا سبق دیا اور باپ اعلیٰ بیچارہ اپنی بکریاں بجاتے بجاتے خود جان کی بازی ہار گیا۔ نذیر کو سزا ٹھیک ہی ملنی تھی کیونکہ بیٹھریا اسی کا تھا اور ٹل اسی کے سر جاتا ہے۔ گوشا ابن صفی زبردست کام کیا گیا ہے۔ اس طرح ضرور ہونا چاہیے۔ فن پارے کی تحریریں جاندار نہیں اور خوش بوئے سخن، مرشد، ذوق آگہی لا جواب تھیں۔

ریاضِ بٹ..... حسن ابدال۔ ماہ ستمبر 2017ء کا شمارہ دیدہ زیب اور خوب صورت سرورق لیے 22 اگست کو ہی مل گیا بہت شکریہ، وقت پر شمارہ ارسال کرنے کا سب سے پہلے کچھ باتیں ہو جائیں مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک کے متعلق محترم قریشی صاحب نے بڑی دلیری، بے باکی اور سچائی کے ساتھ حقیقت سامنے رکھ دی ہے کیونکہ کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے بلی چلی نہیں جاتی اب دیکھتے ہیں جن کے لیے یہ باتیں ہیں وہ اس کو سمجھ کر عمل کرتے ہیں یا نہیں، بہر حال وقت کی بساط بچھ چکی ہے اب اس پر صرف مہرے رکھنا باقی ہے گفتگو کی محفل میں داخل ہونے سے پہلے میں ذکر کرتا ہوں اپنے روحانی استاد محترم ابن صفی (مرحوم) صاحب کا ان کی قدردانہ منزلت، احترام اور محبت جتنی میرے دل میں ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے ان کی ادب کے لیے خدمات قابل تحسین ہیں بڑے بڑے ناقدوں نے انہیں ایشیا کا عظیم مصنف کہا ہے میں اس بات کا برملا اظہار کر چکا ہوں کہ وہ میرے روحانی استاد ہیں میں نے لکھنا ان کے جاسوسی ناول پڑھ کر سیکھا اور میں نے جاسوسی اور تفتیشی کہانیاں لکھنے والی لائن چتی اور میں اقبال بھٹی صاحب عمران قریشی صاحب مشتاق قریشی صاحب قارئین اور دیگر کا مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے پالش کیا اور اس مقام تک پہنچایا کہ میں ہر ماہ ایک تفتیشی کہانی لکھنے کے قابل ہوا ہوں، ویسے میرے خیال میں اگر آپ لوگ اس شمارے کو ابن صفی نمبر کا نام دیتے تو یہ قابل صدا احترام ایشیا کے عظیم مصنف کو زبردست خراج تحسین ہوتا بہر حال ان کے حوالے سے جتنی بھی تحریریں پرچے کی زینت بنی ہیں وہ زبردست ہیں ادب دوست لوگ اپنے ان ادیبوں کو بھی نہیں بھولتے جنہوں نے ادب کی خدمت کی ہے ان کی ہر تحریر ہمیں ان کی یاد دلاتی ہے اب بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف بہن ریحانہ سعیدہ کافی عرصے کے بعد محفل کی زینت بنی ہیں بہن کہاں غائب تھیں آپ نے خوب لکھا اور محفل لوٹ لی میری کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ میں پھر یہی بات لکھوں گا کہ اچھے پولیس افسر ہر دور میں رہے ہیں صائمہ نور بہن حسن معمول آپ کا تبصرہ خوب ہے آپ کے خیالات اچھے ہیں ہماری دعا ہے کہ خدا پاکستان کی حفاظت کرے آمین، میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی پر خوب تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے جس پسندیدگی کا اظہار کیا ہے وہ میرا خون بڑھانے کے لیے کافی ہے بہت شکریہ، جیتی رہو ایم حسن نظامی صاحب، خوب تبصرہ کیا ہے ویل ڈن میری کہانی سیانا کوئے کوٹا پوزیشن دینے کا شکریہ بارش علی سیر خوش آمدید آئندہ بھی آتے رہیں گے یہ بات آپ نے بالکل صحیح کہی کہ اتنے کم پیسوں میں اتنا اچھا اور معیاری پرچہ اور کوئی نہیں ہے اور آپ نے فقرے بڑے خوب صورت لکھے ہیں علی اعصر انصاری آپ کی حاضری بھی خوب ہے حسین خواجہ آپ کا خط بھی قابل تعریف ہے میری تحریر کردہ کہانی سیانا کوئے کوٹا پسند کرنے کا شکریہ مجید احمد جانی میں نے اپنی محفل سے غیر حاضری کی وجہ شروع میں بیان کر دی ہے کہ پچھلے ماہ مجھے رسالہ بہت لیٹ یعنی 10 جولائی کو ملا تھا میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ، پچھلی بار جس لفظ کے متعلق آپ نے پوچھا تھا وہ جلدی تھا جو غلطی سے چھٹی چھپ گیا تھا

مسکان ظفر بھٹی آپ کا تبصرہ بھی پسند آیا محمد اسلم جاوید آپ کی غزلوں کا انتظار ہے کہ کب شائع ہوتی ہیں اور ہمارے تبصرے کی زد میں آتی ہیں عبدالغفار عابد آپ کا خط بھی محفل میں آپ کی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے محمد رفاقت بھائی کیسے ہیں آپ کو دریا کوڑے میں بند کرنا آگیا ہے مختصر تبصرے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں کم سے کم لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرنے کا فن آپ کو آگیا ہے یہ بھی کسی کسی کا کام ہے پرنس افضل شاہین سب سے پہلے آپ کے شروع کے شعر کا جواب شعر میں حاضر ہے ضرور بتائیے کہ کیا جواب ہے۔

کبھی پھول سے ابھر کر کبھی چاندنی میں ڈھل کر
تیرا حسن چھیڑتا ہے مجھے رخ بدل بدل کر

آپ کے اشعار اور تبصرہ حسب معمول شاندار ہے بہت خوب میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی پسند کرنے کا شکریہ، ریاض حسین قمر بھائی سرورق پر آپ کا تبصرہ پسند آیا، جس لفظ کا مطلب سمجھنے کے لیے آپ نے لکھاری سے وضاحت مانگی ہے اس کا مطلب یا وضاحت ان کو ضرور کرنی چاہیے میں محفل سے اپنی غیر حاضری کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں خدا آپ کو خوش رکھے، میری کہانی (تفتیشی) سیانا کو احسب معمول پسند کرنے کا شکریہ، عمر فاروق ارشد بھائی تم میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ میرے روحانی استاد محترم ابن صفی مرحوم کی کوئی تحریر نئے افق کی زینت بنے تو کیا بات ہے بہر حال اس بار آپ کو میری تحریر سیانا کو امنفر داور بدلی ہوئی لگی، اور زیادہ پسند آئی جس کے لیے مشکور و ممنون ہوں آپ کا خط محفل کی جان ہے محمد فرقان رومان محفل میں پہلی انٹری پر خوش آمدید آئندہ ذرا مفصل تبصرے کے ساتھ تشریف لائے گا آپ کو بھی میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی سیانا کو پسند آئی جس کے لیے مشکور و ممنون ہوں اس بار بیٹے کی شادی کی مصروفیت کی وجہ سے باقی کہانیاں نہیں پڑھ سکا اس لیے باقی تبصرہ ادھار۔

علی اصغر انصاری..... منجن آباد۔ قابل قدر بھٹی صاحب اور عزیزم طاہر قریشی صاحب ماہ ستمبر کا پرچہ اکیس اگست کو ملا جو کہ ہمیشہ کی طرح شاندار اور جاندار تھا بھٹی صاحب آپ علیل کیا ہوئے لوگوں نے تو پرچے کا بیڑہ غرق کرنے کا پورا پورا منصوبہ بنالیا شاعر نے کیا خواب کہا ہے کہ اپنے ہی گراتے ہیں نیشن پر بجلیاں خیر جو ہوا سو ہوا اب آپ واپس آگئے ہیں امید کرتا ہوں مستقبل میں ایسا نہیں ہوگا دستک جناب مشتاق احمد قریشی صاحب آپ نے بجا فرمایا کہ کوئی تو ہے بس جی جب تک یہ کوئی تو ہے والا سلسلہ چلتا رہے گا تب تک دشمن ہمیں میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا آپ سلامت رہیں تا قیامت رہیں صدارت کی کرسی پر ریحانہ سعیدہ براجمان تھی تبصرہ سولہ آنے تھا پڑھ کر بہت اچھا لگا بہن مسکان ظفر بھٹی تینوں مولا خوش رکھے، آئین آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل گارڈن گارڈن ہو گیا سر عبدالغفار عابد صاحب لا جواب ہیں آپ آپ نے تبصرے کا حق ادا کر دیا ایم حسن نظامی صاحب آپ جملہ بندی بہت اچھی کرتے ہیں بارش علی سمیر میں امید کرتا ہوں اب آپ ہر ماہ حاضر ہوں گے آپ کا مختصر تبصرہ بھی خوب رہا جناب فرقان رومان صاحب آپ نے تو اتنا مختصر تبصرہ کیا ہے جیسے آپ کی فلائٹ چھوٹ رہی تھی پیارے بھائی ضرورت سے زیادہ مختصر تبصرہ پرچے کی حق تلفی کرتا ہے جو کہ اچھی بات نہیں باقی میں آپ کی مصروفیت سمجھ سکتا ہوں جناب خواجہ حسین صاحب آپ کا تبصرہ یقیناً کچھ لوگوں کو بہت برا لگا ان کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے بہن ربیعہ امجد کی کہانی جاسن کا درخت کمال کا شاہکار ہے بازگشت جناب

عرفان راے سپرہٹ فن پورے حوا کی بیٹی بہن ریحانہ سعیدہ بہت خوب رد عمل جناب شہباز اکبر الفت ذوق آگہی حسین خواجہ صاحب رومی انصاری گل مہر فوزیہ سلطانہ مجید جانی تم پرچے پر تبصرہ کیا کرونا کہ اپنی فلسفی جھاڑا کرو تمہارا تبصرہ کم اور اپنا فلسفہ زیادہ ہوتا ہے صرف تمہاری وجہ سے پوری محفل میں بد مزگی پیدا ہوگئی ہے۔ میں مانتا ہوں تمہارا غلط یہ مقصد نہیں ہوگا جو لوگوں نے اخذ کیا غلطی لوگوں کی بھی نہیں کیونکہ تمہارے الفاظ درست نہیں تھے بھٹی صاحب کی یہ مہربانی ہے جو تم کو ماہِ تمبر میں بھی جگہ عنایت فرمادی ہے اگر بھٹی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تم کو بلیک لسٹ کر دیتا۔ تم کو قبل از اسلام کا کہتا ہے تم چھوٹے بھائی ہو اور میں تمہاری دل سے عزت کرتا ہوں پیارے بات کو سمجھنے کی کوشش کرو ایسا ہرگز نہیں ہوتا جیسا تم سوچ رہے ہو دیکھو غلطی تمہاری ہے اور معذرت بھٹی صاحب کر رہے ہیں اب اس امر سے ہی تم بھٹی صاحب کی محبت کا اندازہ لگا لو تمام احباب سے گزارش ہے جانی کی غلطی کو نظر انداز کر کے موضوع کو ختم کر دیا جائے تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے تاکہ تنقید برائے تنقید بالا خر جانی اپنا بھائی ہے عقلمند ہمیشہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے اور یہی انسانی عقل کا تقاضہ ہے خدا کی رضا کے لیے سبھی سے معافی خدا حافظ۔

بارش علی سمیر..... جیوے والا۔ آداب پیارے انکل اقبال بھٹی صاحب سب سے پہلے تو آپ کا بہت بہت شکر یہ کہ آپ نے مجھے اپنی محفل میں جگہ عنایت فرمائی اور میرا حوصلہ مضبوط کیا جب تک آپ جیسے نکھارنے والے ہیں تب تک تو علم کی شمع نہیں بجھنے والی سردرق والی حیدہ بہت ظالم تھی دستک میں ہمیشہ کی طرح سوئی ہوئی قوم کو جگایا گیا۔ سسٹر ریحانہ سعیدہ آپ نے خوب سے خوب تر تبصرہ کیا ہے برادر ریاض بٹ اسلم جاوید پرنس افضل شاہین کے تبصرے بہت اچھے تھے سسٹر مسکان ظفر بھٹی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کے تبصرے کی تعریف کن الفاظ میں کروں میرے نزدیک اس سال کا بہترین تبصرہ آپ ہی کا ہے الفاظ کا چناؤ اور تسلسل لا جواب تھا کاش صائمہ مجید بھی آپ ہی کی طرح سوچنے لگ جائیں لیکن انسوس روشنی کا نزول بھی ہر ذہن پر نہیں ہوتا ہے علی اصغر انصاری عمر فاروق ارشد فاروق رومان نے سپرہٹ تبصرے کیے ہیں سید محمود حسن صاحب آپ کہاں رہ گئے مجھے آپ کی آمد کا بہت انتظار تھا میرے محسن عبدالغفار عابد صاحب آپ کا تبصرہ میرے نزدیک اسکول کی حیثیت رکھتا ہے جناب میری غلطیوں کی نشاندہی کر دیا کریں قابلِ قدر ایم حسن نظامی آپ نے سپر سے بھی اوپر ہیں میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں جناب خواجہ حسین صاحب مجھے نئے افق سے متعارف کرانے کے لیے بہت بہت شکر یہ رومی انصاری صاحب آپ محفل میں کب حاضر ہوں گے عامر زمان عامر امید کرتا ہوں خیر و عافیت سے ہوں گے ذوق آگہی سب پہ بھاری۔ ادارہ ہڈانے اس بار تو کمال کر دیا سبھی خطوط خندہ پیشانی سے شائع کر دیے وہ بھی حرف بہ حرف اچھا جی اب اجازت زندہ رہا تو پھر ملیں گے۔

ریاض حسین قمر..... متکلام ڈیم۔ لائق صدا احترام جناب اقبال بھٹی صاحب سلام مسنون کرو ڈیبا بار شکر ہے کہ اس پاکیزہ ہستی کا جو پیاروں کو شفا یاب کرتی ہے کہ اس مہربان ہستی نے آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازا اور آپ دوبارہ ہم میں موجود ہیں اور بفضلِ تعالیٰ صحت مند ہیں خدائے لم یزل اسی طرح آپ کو صحت مند رکھے، آمین، ماہِ ستمبر 2017ء کا نئے افق میرے سامنے ہے اس بار کا ٹائٹل مجھے گزشتہ سارے ٹائٹلوں سے زیادہ پیارا لگا بہت ہی سادہ مگر پر وقار ٹائٹل تھا دستک میں مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس طرح مدلل بات کی

ہے وہ سو فیصد درست ہے انہوں نے جناب نواز شریف صاحب کو معقول اور جائز مشوروں سے نوازا ہے کاش بات ان کی سمجھ میں آ جائے گفتگو کے شروع میں دی گئی حدیث مبارک ایمان کو تازہ کرنے والی ہے کرسی صدارت پر محترمہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ متمکن تھیں ان کا تہرہ بھی جاندار تھا محترم ریاض بٹ صاحب ایک لاجواب تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ان کی اس ماہ چھپنے والی کہانی نفس کے قیدی بھی لاجواب ہے ریاض بٹ صاحب آپ نے مجھے صبر کرنے کی تلقین فرما کر میرا حوصلہ بڑھایا ہے ویسے جیون ساتھی کے ٹیچر نے کادھک ایسا دکھ ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا بہر حال میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، محترمہ صائمہ نور کا خط بہت بامعنی ہے میں عرض کروں کہ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب جس انداز میں کالم لکھ رہے ہیں وہ ان کے شایان شان ہے اور ہم لوگ سیاسی حالات سے آگاہی بھی حاصل ہو جاتی ہے اور ان کی کہی ہوئی کوئی بات کسی کے دل میں بھی اتر سکتی ہے آپ نے ہماری محبتوں کو شرف قبولیت بخشا اس کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں، ایم حسن نظامی صاحب کا خط مختصر مگر مدلل تھا ویدل ڈن، جناب بارش علی سمیر صاحب محفل میں پہلی بار تشریف لائے ست بسم اللہ جی آیائے نوں ہم دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اب محفل کی رونق کو دوبالا فرماتے رہا کیجیے محترم جناب علی اصغر انصاری صاحب کا خط مختصر انصاری بھائی ایک لکھاری اپنی کاوش جب کسی جریدہ کو بھیجتا ہے تو وہ چھپنے تک کے انتظار کی سولی پر لٹک جاتا ہے جب انتظار بسیار کے بعد بھی وہ کاوش نہیں چھپتی تو وہ یہ کاوش کسی اور پرچے کو بھیج دیتا ہے جس کا اسے حق حاصل ہے اب اتفاق ہے وہ تحریر مختلف جریدوں چھپ جاتی ہے تو اس کا کوئی تصور نہیں جناب حسن خواجہ صاحب گفتگو میں چھپنے والے خط کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ، پیارے مجید احمد جانی صاحب آپ کا خط اور تہرہ کمال کا ہوتا ہے مگر لکھتے لکھتے نادانستہ طور پر قلم بعض اوقات بہک جاتا ہے آپ کے گزشتہ خط پر بہت سے قارئین کی دل آزاری ہوئی خدا را بہت احتیاط سے کام لیا کریں شکریہ محترمہ مکان ظفر بھی صاحبہ نے جس طرح عورت کا دفاع کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے انہوں نے بڑے پیارے انداز میں عورت کی عظمت اور رفعت کو اجاگر کیا ہے رب کریم انہیں اس عمل پر اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ محترم عبدالغفار عابد نے بھی بڑے دل نشین انداز میں عورت کے مقام و مرتبہ کو اجاگر کیا ہے ان کی تمام باتیں بڑی مدلل ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس عمل پر ڈھیروں اجر عطا فرمائے آمین جناب محمد رفاقت اپنے مختصر خط میں بہت کچھ کہہ گئے پرنس افضل شاہین صاحب نے بھی بڑا دلنشین خط لکھا افضل شاہین بھائی کلام پسند فرمانے پر میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں اللہ آپ کو خوش رکھے جان سے پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب بھی بڑے پیارے خط کے ساتھ تشریف لائے ہوئے ہیں آپ ہمیں شاعر سمجھتے ہیں یہ آپ کا بڑا پرن ہے رب کریم آپ کو زندگی میں کامیاب و کامران فرمائے آمین آخر میں محمد فرقان رومان صاحب جو محفل میں پہلی بار تشریف لائے اخیر رانگلے وہ اپنے مختصر خط میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں امید ہے آئے میں باقاعدگی رکھیں گے مگر جناب طاہر قریشی صاحب اقرا میں جس طرح ہمارے ایمانوں کو تازہ فرماتے ہیں یہ انہیں کو زبیا ہے میں کہانیوں میں سب سے پہلے ریاض بٹ صاحب کی تفتیشی کہانی پڑھتا ہوں اس بار بھی وہ کیا خوب کہانی نفس کے قیدی لائے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ فوق آگہی اور خوش بوئے سخن کا انتخاب بہت خوب ہے نیک تمناؤں کے ساتھ۔

ایم حسن نظامی قبولہ شریف۔ خلوص بیکراں، سلام مسنون امید ہے آپ اور پرچے سے جڑے سبھی

احباب بخیریت ہوں گے متبر کا من پسند پر چرافتی قوس قزح کے ساتوں رنگ سیٹے ملا اور مہینہ بھر کا شدتوں بھرا انتظار ختم ہوا، یا حجاب خوب رو دو شیزہ تر بجھے انداز سے عید الاضحیٰ کی مبارک باد دے رہی تھی گو یاد تک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی گفتگو کو دیکھنا یا کبھی پاکستانی سیاست میں کون الہکار ہے اور کون نا اہل مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی اور بات بڑھتی ہوئی سیاسی خانہ جنگی تک آن پہنچی ہے سبھی اپنی کرسی کی خاطر ایک دوسرے پر الزام تراشیاں لگاتے ہوئے کچڑا اچھال رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکا نے افغانستان میں اپنی شکست پر پاکستان کو مورد الزام ٹھہرا کر دھمکیاں دینا شروع کر دی ہیں بھارت جو ہمارے پاک وطن کا ازلی دشمن ہے وہ بھی پاکستانی کمزوریوں کی تاک میں ہے موجودہ صورت حال میں ہمارے سیاستدانوں کو متحد ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ گفتگو میں اقبال بھائی کی آمد خوش آئند بات ہے خداوند کریم ہر کسی کو تندرستی کی نعمت سے نوازے مجید جائی کے فقرات پر دلی دکھ ہوا اس بارے میں مسکان ظفر بھٹی صاحبہ بہن عبدالغفار عابد اور حسین خواجہ نے معیاری اور بامعنی وضاحت کی۔ خواجہ صاحب میں تو ابھی طفل مکتب ہوں چند ٹیڑھی تر چھی لکیریں کھینچنے سے تصویر بن جائے تو بندہ مصور نہیں بن جاتا، اسی طرح ریت سے ریت لکھنے والا لکھاری ہرگز نہیں کہلا سکتا، میرے خیال میں اپنی تحریر میں خوب صورت معیاری اور منفرد لفظوں کی مالا پر و کر صفحہ قرطاس بکھیرتے ہوئے خراج تحسین وصول کرنے والا اور ہوا سے ہوا میں ہوا لکھ کر ثابت کرنے والا ہی لکھاری کہلاتا ہے جو کہ بہت ہی جان جوکھوں کا کام ہے شاید، ہاں گمراہیوں کے دیے زخم ناسوروں میں بدلیں تو قلم بے دلی کرب کورے کا غذ یہ نکمیر نے لگا استاد محترم جناب ریاض حسین شاہد کی نیکراں کوششیں محنتیں اور پیر طریقت اور کامل مرشد دیوان دستگیر صاحب کی نظر کرم نے نظما کی لقب دے کر پندیرائی عطا کی ٹوٹے پھوٹے اور سادہ سے الفاظ فقرے اور تحریریں پر چون کی زینت بننے لگیں ایڈیٹر صاحبان نے مہربانی کی اور حلقہ احباب وسعت اختیار کرتا چلا گیا پھر خلوص محبت اور پیار کے روابط پروان چڑھتے چلے گئے، ہاں بات افقی گفتگو پہ ہو رہی تھی تو ریحانہ سعیدہ، ریاض بٹ، محمد اسلم جاوید، مسکان ظفر بھٹی، عبدالغفار عابد، محمد رفاقت ہمارے پرس صاحب ریاض حسین قمر عمر فاروق ارشد اپنی اپنی گفتگو میں اچھے اور عمدہ انداز سے مخاطب ہوئے، دستگیر شہزاد، عشنا کوثر سردار کے بارے میں عمدگی اور باریک بینی سے بتا رہے تھے بلاشبہ کوثر صاحبہ لکھاریوں کی صف میں بہت بڑا نام ہے ہیں خداوند کریم انہیں اور زور قلم عطا فرمائے عرفان رائے جی لکھاری ہی نہیں بہت بڑے ایڈیٹر بھی ہیں ان کے لفظوں فقروں میں بے پناہ نکھار ہوتا ہے جو قاری کے ذہن کو بھی نکھارتا چلا جاتا ہے۔ مہتاب خان کا جرم، ریاض کے قیدی، قرۃ العین سکندر کا اجزا عاشق صاف شفاف اور علم میں اضافے کا باعث پائے دستگیر شہزاد کے ہوتوں کا اثر جامن کے در تک پر بھی ظاہر ہوا چ تو یہ ہے کہ پراسرار تحریریں خاص نمبر میں ہونا چاہیے تھیں مگر خلیل جبار نے تلخ یادوں کو دہرا کر پھر سے ہمیں ماضی یاد کرادیا اور پھر آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ فن پارے کے سبھی لکھاری معیاری اور منفرد مواد لیے جان محفل قرار پائے ابن صفی کو شاید ہی کوئی شخص ہو جو نہ جانتا ہوں انہوں نے اردو ادب میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور ہر موضوع، ہر کردار اور ہر منظر کو خوب صورتی سے پیش کیا جو بلاشبہ نئے لکھنے والوں کے لیے بہت بڑی رہنمائی فراہم کرتے ہیں ان کی نجی زندگی اور اردو ادب پر خدمات کو سبھی احباب نے اچھے انداز سے اجاگر کیا۔ ذوق آگئی اور خوش بوئے سخن میرے من پسند اور دلچسپ سلسلے ہیں جو پڑھتے ہوئے من تر و تازہ اور شادمان سا لگتا

ہے، ساحر جمیل کی تیسری کڑی منفرد موز پر پائی جو بے حد پسند آئی، میری طرف سے اس قدر معیاری اور لا جواب مواد فراہم کرنے پر ایڈیٹر صاحب اور لکھاری ساتھیوں کا بے حد شکریہ اب اگلے ماہ تک اللہ حافظ۔

خواجہ حسین..... منجن آباد۔ السلام علیکم اقبال صاحب و ہر دل عزیز طاہر قریشی صاحب اسلامی سال شروع ہونے والا ہے اس کی پیشگی مبارک میں بارگاہ الہی میں دعا گو ہوں کہ آنے والا سال خوشیوں اور برکتوں والا آئین مالک دو جہاں ہر آفت و بلا سے محفوظ فرمائے آئین ثم آئین، طاہر صاحب میں امید کرتا ہوں اسلامی سال نو کی مبارک والا سرور ق ضرور ہوگا اگلے ماہ اگر دیکھا جائے تو ہم لوگوں کو اسلامی سال کے ساتھ چلنا چاہیے ورنہ کم از کم اسلامی سالوں یا دوروں کو کھانا ہی چاہیے ہمارے اندر کیتھولک رائج ہوتا جا رہا ہے یہ سب کچھ اک سازش کے تحت ہو رہا ہے اور ہم نے اس کا بایکٹ کرنا ہے بے شک جب تک اکتوبر کا پرچہ آپ کی دسترس میں ہوگا تب تک عید قرباں پرانی ہو چکی ہوگی اس لیے میری طرف سے ان احباب کو عید مبارک جن کے فریق میں اب تک گوشت موجود ہے حضرات گرامی میرے بچپن کا واقعہ ہے کہ لوگ قربانی کا جانور کھلے میدان میں ذبح کرتے تھے اب تو یہ حال ہے جی قربانی سے پہلے جن کے دروازے میں جانور کھڑا ہوتا ہے عید والے دن گوشت لینے جائیں کہتے ہیں بھائی، ہم نے تو قربانی ہی نہیں کی چودہ اگست پر ایمر جنسی میں بائیکر ہوتے ہیں اور قربانی پر وہ احباب ہوتے ہیں جنہوں نے زیادہ گوشت کھایا ہو آج کے اس ظالم دور میں ان لوگوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے جن کو صرف اور صرف عید پر ہی گوشت نصیب ہوتا تھا اور اب تو ان کو قربانی پر بھی نہیں ملتا بابائے صحافت مشتاق احمد قریشی صاحب فرماتے ہیں کوئی تو ہے بابا جی بھینس کو لاشی کا ڈر اور کچھ بھی نہیں یہ ملک کلمہ پر بنا تھا اور جب تک اہل کلمہ ہیں تب تک اس ملک کو کچھ بھی نہیں ہو سکتا بابا جی آپ کا کالم فلسفہ سے بھر پور ہوتا ہے جو بہت کچھ سوچنے کے علاوہ بہت کچھ کرنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے محفل سدا بہار میں بہن ریحانہ سعیدہ میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں کہ عدالت تو پانامہ پر سزا دینی چاہیے مگر آپ کا تبصرہ زبردست تھا بردارم ایم حسن نظامی صاحب جی آپ نے بجا فرمایا کہ مشتاق احمد صاحب کی دستک حکمرانوں اور عوام الناس کے لیے بھی درست عبرت ہے نظامی بھائی لا جواب تبصرہ بھائی بارش علی سیر میں امید کرتا ہوں آپ ہر ماہ حاضر ہوں گے آپ کا مختصر تبصرہ کافی بہتر تھا آپ کوشش کرتے رہو مجھے امید ہے آپ کے قلم میں جلد نکھار آئے گا پیارے دوست علی اصغر انصاری صاحب آپ کو اتنا مختصر تبصرہ زیب نہیں دیتا بہر حال اچھا تھا محترمہ مکان ظفر بھٹی صاحب آپ کا تبصرہ کیا کہوں جی میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ہیں آپ کے خط سے ملتا چلتا ہے کہ آپ کتنا مطالعہ کرتی ہیں اور آپ کی وسیع سوچ کی میں داد دیتا ہوں آپ ایک عظیم خاتون ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا تبصرہ کروں آپ کے خط پر آپ نے تو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے بس اتنا کہوں گا کہ مجھے امید ہے کہ جمید جانی نے آپ کے مشورے پر اب تک عمل کر لیا ہوگا جناب اسلم جاوید صاحب بہت اعلیٰ ہر دل عزیز محترم جناب بھائی عبدالغفار عابد صاحب آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح سحر انگیز تھا مجھے پرتو جادوی کر دیتا ہے آپ تو شکوہ بھی اتنے پیار سے کرتے ہیں کہ بندے کو برا ہی نہیں لگتا بھائی جان بہت اعلیٰ تبصرہ سیدہ محمود حسین صاحب آپ کہاں رہ گئے پرنس افضل شاہین ریاض حسین قمر، بھائی رفاقت، عمر فاروق ارشد اور جناب فرقان رومان صاحب محفل میں آپ کے خط رونق کو بڑھا رہے تھے ویلڈن بہن ربیعہ امجد کی کہانی بہت منفرد کہانی ہے پڑھ کر بہت اچھا لگا جب کچھ نیا پڑھنے کو ملتا ہے تو سوچ میں کافی وسعت پیدا

ہوتی ہے جناب بھائی عرفان راے صاحب آپ کی بازگشت لا جواب تحریر ہے ماریہ کا کردار ہمارے معاشرے کا عکاس ہے محترمہ بہن قراۃ العین سکندر صاحب آپ کی کہانی اجڑنا عشق ہمارے معاشرے کا دس پرسنٹ ہے سو میں سے آپ کو ایسے دس گھر ضرور ملیں گے عورت کی قربانی زیادہ رنگ لاتی ہے مرد کی نسبت استوری سپر ہٹ سلسلہ فن پارے جناب شہباز اکبر الفت صاحب کی تحریر رد عمل بہت اچھی تھی محترمہ شاملہ زاہد صاحب کی کہانی نمکین آلو منفرد تھی ذوق آٹھی ایس حبیب خان جناب رومی صاحب بہن گل مہر کا انتخاب لا جواب تھے اسی کے ساتھ ہی اگلی دفعہ تک کے لیے اجازت چاہوں گا اگر میرے الفاظ سے کسی کی دل آزاری ہوئی تو میں معافی کا طالب ہوں۔

عبدالجبار رومی انصاری..... قصور۔

چیزی میں شرم و حیا کی
دکھتی وہ حور لاگے

عید میں بچ سنور کے رومی
پیاری مستور لاگے

حضرت بابا بلھے شاہ کے شہر قصور میں مجھے رسالہ 30 تاریخ کو موصول ہوا اتالیٹ اور پھر مصروفیات میں بمشکل ہی پڑھ سکا تب تک گفتگو میں پہنچنے کی تاریخ بھی گزر گئی ویسے بھی دو ماہ سے مجھے نئے افق نہ مل سکا کیونکہ نئی جگہ تھی اور کسی بھی بک اسٹال پر مجھے نظر نہ آیا تو ستمبر کا شمارہ اسٹیشن منگوانا بڑا جوائنتالیٹ ملا خیر اپنے منفرد نمائش کے ساتھ میگزین خوب صورت لگا ادارے میں کوئی تو ہے کی دستک اچھی رہی لیکن کیا کہا جائے جب یہ سیاسی لوگ اقتدار میں ہوتے ہیں تو اس کے نشے میں سب بھول جاتے ہیں پھر جب اپنی ہی غلطیاں سامنے آتی ہیں تو سب کچھ ڈنڈاؤں و لہو چکا ہوتا ہے عوام بے چارے کیا کریں جس نے انہیں بول بول لیا اس کے پیچھے ہوئی اور سیاسی دڑیرے اسی کو اپنی جیت سمجھ لیتے جی بی او کا مزاج ٹھیک کیا ہے لیکن یہ گھوٹے سکے اسے نہیں سمجھ سکتے ورنہ آج کا پاکستان ترقی میں کہیں آگے ہوتا گفتگو کتنا پیارا لفظ ہے اگر یہ پیاری ہو تو سارا ادب و احترام اس میں سمٹ آتا ہے اگر یہ ناشائستہ ہو جائے تو کسی کو بھی اچھی نہیں لگی گی سننے اور پڑھنے والوں کی دل آزاری کا باعث بنے گی اس لیے لکھتے ہوئے اور بولتے ہوئے قلم اور زبان کو حرکت دینے سے قبل غور کرو اور سوچو کہ کہیں میں ایسا کچھ بول اور لکھ تو نہیں رہا جس سے کسی کی دل آزاری ہو، انسانی قدروں اور جذبات کی قدر کرو دنیا میں اچھے برے ہر طرح کے کردار ہوتے ہیں لیکن کسی ایک کردار کی وجہ سے پوری انسانیت کی تذلیل مت کرو الفاظ کے چناؤ کا صحیح استعمال کریں صرف اسی کردار کا نام لے کر وضاحت یا تبصرہ کریں جو مثبت یا منفی سرگرمی میں انوالو ہے نہ کہ ایسے الفاظ استعمال کریں جس سے پوری انسانیت زد میں آئے اور لوگوں کے جذبات مجروح ہوں ایک لکھاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوامی سطح پر لکھتے ہوئے ایسی تمام باتوں کو مد نظر رکھے اور غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرے مبادہ لکھتے ہوئے خود زیر عتاب آ جائیں ایسی لکھائی سے پرہیز بہتر ہے امید ہے دوست احباب و قارئین میری بات سے اتفاق کریں گے نہ بھی کریں تو کوئی بات نہیں آپ کی تنقید بھی سراغ لکھوں پر محترمہ ریحانہ سعیدہ کا اصلاحی خط عمدہ تمھارا یض بٹ بھی اپنی مثال آپ بہترین تبصرہ کے ساتھ موجود تھے صائمہ نور بھی اپنی بہترین آرا کے ساتھ عمدہ تبصرہ لیے تھیں رابطہ بحال کرتے ایم حسن نظامی بھی محبتیں بکھیرتے اچھے لگے نئے افق کے شیدائی

بارش علی سیر کی انٹری اچھی رہی علی اصغر انصاری کے ساتھ حسین خواجہ کی گفتگو بھی اچھی تھی دعائیں کرتے اور اپنے محاسبہ کی تلقین کرتے مجید احمد جانی کی تبصرہ نگاری بھی زبردست رہی مکان ظفر بھی اپنے معتبر خط کے ساتھ قابل ستائش اور داد و تحسین کی مستحق تھمیری زندگی کی وفا کے ساتھ محمد اسلم جاوید کو دیکھ کر خوش ہوئی عبدالغفار عابد نے بھی اچھا لکھا محمد رفاقت کے ساتھ پرنس افضل شاہین بھی دلنشین گفتگو سے عمدہ رہے ریاض حسین قمر کا مدلل خط بہت اچھا لگا اگر اگست کا شمارہ مجھے وقت پر مل جاتا تو ضرور بتاتا کہ نامراد گلہری دوشیزہ کے بالوں کو دیکھ کر کیوں جلیں ہو رہی ہے عمر فاروق ارشد کے ساتھ محمد فرقان رومان بھی اپنی آرا کے ساتھ بہتر رہے زرین قمر کی ایکس ون عمدہ رہی مارنے کے احکامات لے کر جانے والے کو بچانے کا آرڈر مل گیا جامن کے درخت میں شانزے نے پیر بابا کی اصلیت کھول دی اور اس طرح دادی کو بھی سمجھا دیا شرارتی شانزے نے تو کمال ہی کر دیا کہانی اچھی لگی نیلم کے صبر کا اسے بہت اچھا پھل ملا اجڑا عشق بہت عمدہ رہی نفس کے قیدیوں نے ایک شخص کی زندگی چھین لی تو دوسری طرف اپنی ہی بیٹی کو انتقام کی بھینٹ چڑھانا چاہا لیکن وہ بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نڈرے کی ہو کر پڑ گئی بس گیدڑ کی جان چلی گئی اس سارے قصبے میں عمر اور خالد کے لیے حاجرہ کا عکس ہے خوشنما بھی مجھے میں پڑ گئی ہے کہ ان کا کیا کرے دوسری طرف محبت سے گندھی عین بھی سفر میں تیور کو پکارتی چی رہی ہے مگر ٹرین ہے کہ پاکستان نہیں پہنچ رہی اب کسی ویرانے میں رکنے والی ٹرین پر جانے کیا آفت ٹوٹنے والی ہے خدا خیر کرے عشنا کوثر سردار کا ناول بہت عمدگی سے جاری ہے دنگیر شہزاد کی عشنا کوثر سردار پر لکھی تحریر بھی زبردست ہے مرشد کا کردار ایسے لگا جیسے شان کی کوئی فلم چل رہی ہو، ظالموں کے ظلم و ستم سہتی ہوئی حجاب بھی بھرپور ثابت قدمی کا مظاہرہ کر رہی ہے یہی ثابت قدمی اسے ظالموں کے چنگل سے بھی چھڑائے گی مرشدہ عمدہ تحریر جسے پڑھنے کو دل بار بار چاہے گوشہ ابن صفی پر سبھی پائے کے تبصرہ نگاروں نے اس پر خوب لکھا ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں تاپا ہیں ہم ابن صفی اور ان کے کردار ہمیشہ لوگوں میں پڑھے جائیں گے اور وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے، فن پارے میں پھولوں کے سفر پہ روانہ ہونے والی عائشہ کی زندگی خوش گوار ہوگی یوں نسیم سیکہ صدف کی خوش بوؤں کا سفر بہترین رہی، حوا کی بیٹیوں کے لیے ریحانہ سعیدہ کا سوال تو برسوں سے کیا جا رہا ہے مگر گاؤں گوشوں والے پنچائی اس کا انصاف نہیں کر سکتے وہ اس کمزور حوا کی بیٹی پر صرف ظلم و ستم ہی کر سکتے ہیں ایسے واقعات تو آئے دن نظروں میں گھومتے ہیں لیکن یہ کام تو ارباب اختیار کا ہے وہی اس کا سد باب کرے اور مظلوم حوا کی بیٹیوں کو بچائے ہم تو واقعات بتاتا کے ان کی آنکھیں کھولتے رہیں گے۔ خوشبوئے سخن سے افضل گوہر، صفری کوثر اور انابہ رحمان کا کلام اچھا رہا جبکہ ذوق آگہی سے ایس حبیب خان حسین جاوید اور آبروئے نبیلہ کا انتخاب بہت اچھا لگا، والسلام۔



اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

الجبار

(سب سے زبردست)

جبار: مبالغہ کا صیغہ ہے، اہل لغت کی تصریح کے مطابق ”جبر“ کے معنی دراصل زبردستی کسی شے کی اصلاح کرنے کے ہیں جبکہ جبر کا استعمال صرف اصلاح یا محض زبردستی کے لئے بھی ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے معنی سرکش، زور کرنے والا، زبردست دباؤ والا، معاملات کو درست کرنے والا، قوت و اقتدار کے ساتھ نقصان کو پورا کرنے والا، جس کے ارادے کے سامنے سب مجبور ہوں۔

صفات باری تعالیٰ میں صفت جبار کے معنی ہیں باری تعالیٰ کے فیضانِ نعمت سے سب لوگوں کی حالت درست کرنا اور ان کے نقصانات کو پورا کرنا ہے اس لئے اللہ کی یہ صفت جبار ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی قادرِ مطلق ہے اور وہی ذاتِ الہی اپنی مخلوقات کے تمام نقصانات پورا کرنے پر پوری طرح قادر ہے، وہی فقیر کو تو تکمیل کرنے والا ہے۔ امام ربیعؒ نے محمد بن کعبؒ سے روایت کی ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اس لئے جبار ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو اپنے ارادے سے مجبور کر دیتا ہے۔“

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی حکمتِ الہی سے بندوں کو بہت سی چیزوں پر مجبور کر رکھا ہے جن سے ان کی رہائی ممکن نہیں ہے جیسے بیماری، موت، حشر پر سب مجبور و بے بس ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کو ایک خاص فطرت اور خاص طریقے سے اخلاق و اعمال پر مشتمل کر رکھا ہے۔ وہ اسی کی انجام دہی میں مصروف اور اسی دھن میں گمن رہتا ہے وہ اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہتا اور اگر کوئی شخص اپنی روزی روٹی کے حصول کے لئے جو کام کر رہا ہوتا ہے اس سے بے زار ہونے کے باوجود اسے نہیں چھوڑتا ہے وہ سوچتا رہتا ہے اس کے معیار کا کوئی دوسرا کام اسے دکھائی ہی نہیں دیتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے ”ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان ان کی روزی کو تقسیم کیا اور بعض کو بعض پر فوقیت دی۔“

امام ابوسلمہؒ نے خطاب فرماتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جس نے اپنی مخلوق کو اپنے امر و نہی پر جس طرح چاہا مجبور کر دیا اور بعض کے نزدیک ”جبار“ وہ ذات ہے جس نے اپنی مخلوق کی ضرورتوں حاجتوں کو پورا کیا اور ان کے معاش اور روزی کے اسباب کا بند و بست کیا جبکہ کچھ دیگر علما کے خیال کے مطابق ”جبار“ کے معنی اس ذات کے ہیں جو مخلوق سے اوپر ہے۔ (لغات القرآن)

ترجمہ: یہ تھی قومِ جاہلیہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش نافرمان کے حکم کی تابعداری کی۔ (ہود: ۵۹)

ترجمہ: اور انہوں نے فیصلہ طلب کیا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور تمام سرکش ضدی لوگ نافرمان ہو گئے۔

جب اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مکمل جدائی ہو جاتی ہے تو پھر سرکشوں اور آمروں کی اس حقیر دنیاوی قوت کے مقابلے میں اللہ جبار و قہار اور مکمل گھیر لینے والے کی عظیم ترین قوت سامنے آتی ہے۔ آیات مبارکہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے احکام کو اپنے غرور و تکبر کے باعث رد کرتے ہیں اس سے انحراف و کفر کرتے ہیں اور اپنی سرکشی و بغاوت کا برملا اظہار کرتے ہیں اور وہ دنیا میں وی گئی رعایت و مہلت میں جتنا چاہے سرکشی و ضد کا رویہ اپنالیں لیکن ایک روز مرنا انہیں بھی ہوگا اور مر کر جب وہ اللہ جبار کے حضور حاضر ہوں گے تو وہاں انہیں جس عذاب کا سامنا کرنا ہوگا وہ بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔ اللہ جو تمام زبردستوں سے زبردست و قوی ہے۔ جب وہ کسی کو سزا دے گا تو کون ہوگا جو انہیں بچا سکے گا۔ ان ہی آیات میں وہ منظر بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ دنیا کے شکست خوردہ جبار و سرکشوں کے آخری انجام کی خوفناک تصویر کشی کر دی گئی ہے کہ انہیں جہنم رسید کرویا جائے گا۔ وہاں انہیں غلیظ بدبودار خون آلود پانی پینے کو ملے گا جو گرم کھولتا ہوا ہوگا وہ اگر نہ پینا چاہیں تو بھی انہیں وہی زخموں سے رستا ہوا مادہ پینا ہی پڑے گا۔ اللہ جبار و قہار کا دیا ہوا فیصلہ ہوگا جس کی وہ اپنی دنیا کی زندگی میں طلب کیا کرتے تھے جسے وہ منس کر اڑا دیا کرتے تھے۔ اپنے آپ کو ہی سب کچھ سمجھا کرتے تھے۔

ترجمہ:- (ان کا رویہ) اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک بہت سخت ناراضگی کی چیز ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مغرور اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ (المومن۔ ۳۵)

آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انحراف کرتے ہیں اور غرور و تکبر کا رویہ اختیار کرتے ہوئے احکام الہی سے کفر کرتے ہیں اور انہیں معروف، معروف اور منکر، منکر نظر نہیں آتا، تکبر سے مراد انسان کا جھوٹا پندار اور جھوٹی انا ہے جس کی بنا پر وہ حق کے آگے سر نہیں جھکا تا اور اس کو اپنی حیثیت سے کم تر سمجھتا ہے اور جباریت یا سرکشی سے مراد خلق الہی پر ظلم کرنا اور اللہ کا خوف دل سے نکل جانا ایسا انسان شریعت الہیہ کی پابندی قبول کرنے سے بھاگتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہاں وعید سنائی جا رہی ہے کہ ان کے دلوں پر لعنت کی مہر لگا دی جاتی ہے پھر ان کے دل میں ہدایت پانے کی کوئی جگہ ہی نہیں رہتی اور ان کا دماغ حقیقت کے ادراک سے محروم ہو جاتا ہے۔

ترجمہ:- سب پر غالب اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور تمام بڑائی والا پاک ہے اللہ ان چیزوں سے جنہیں یہ اُس کا شریک بناتے ہیں۔ (الحشر۔ ۲۳)

تفسیر:- اللہ تبارک و تعالیٰ کی یہ ایسی عظیم الشان صفات ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی گرفت، غلبے اور جبر کا اظہار ہوتا ہے جس سے ایسی برتری قوت علو کا اظہار ہوتا ہے جس کا اور کوئی شریک نہ ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام تر صفات میں اس کے اقتدار و حکمرانی میں یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات و صفات میں کوئی بھی کسی طرح شریک نہیں ہے صرف وہی عزیز ہے وہی جبار ہے اور وہی متکبر ہے۔ ان صفات الہی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے سوا کسی پر قطعی نہیں ہوتا وہ سب پر غالب ہے سب پر اپنا حکم نافذ کرنے والا ہے اور سب سے بڑا ہو کر رہتا ہی اس کی صفت اور شان ہے۔

فضائل: البجاء اس صفحہ باری تعالیٰ کا جو شخص روزانہ صبح و شام بعد نماز ۲۲۶ بار ورد کرے گا ان شاء اللہ تعالیٰ وہ ظالموں کے ظلم و قہر سے محفوظ رہے گا۔



ایکسپون

Pakistanipoint

زیریں قصہ
Wagur
آخری حصہ

کہانی خاصی دلچسپ ہے یہ ناول Mark Arundel نے لکھا ہے اور اس کا نام Codename Maneyman ہے اس میں ایک ریٹائرڈ فوجی کو ایک شخص کی جان بچانے کی ذمہ داری دی جاتی ہے جبکہ کئی دشمن اسے مارنے پر تلے ہوتے ہیں ہر ہر Chapter میں ایک نیا انکشاف ہوتا ہے دلچسپی اور سنسنی خیز واقعات سے پر ناول ہے۔





اور اس کی پچھلی سیٹ پر جافری ایک شخص کے ساتھ بیٹھا تھا اس نے پستول جافری کی کپٹی پر رکھا ہوا تھا۔ اب تک وہ صبح سلامت تھا لیکن اس کا امکان موجود تھا کہ اگلے دس منٹ میں اسے اغوا کرنے والے اس کی کھوپڑی میں گولی مار کر اس کی لاش کار سے کہیں پھینک دیں میں نے جافری کا بیک کا ندھے پر ڈالا جو ہول سے نکلنے وقت میں نے فرش سے اٹھایا تھا اور پکلی کار کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا تھا ساتھ ہی میں نے اپنے pay phone سے جیمر لوٹ کو بھی کال ملائی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ جیمر لوٹ نے پوچھا۔
 ”جافری اغوا ہو گیا ہے اسے دو افراد اٹھا کر ایک کار میں لے گئے ہیں بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔“ میں نے کہا اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنایا تھا اور اپنا رخ پھر ساحل کی طرف کر دیا تھا جہاں دور سے مجھے کورس کی لانچ Dancing Brave نظر آرہی تھی لیکن وہ خالی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی نہ ہو میرے خیال میں کورس نے سمندر میں سارا دن گزارنے کے لیے لانچ تیار کر لی تھی جیسا کہ اس نے مجھے بتایا تھا۔
 ”کیا تم نے کار کا رجسٹریشن نمبر نوٹ کیا؟“ جیمر لوٹ نے پوچھا۔

”ہاں میں نے کہا اور اسے یاد کر کے نمبر لکھوایا۔“ یہ ایک مقامی نمبر ہے اور کار کرائے پر لی گئی ہوگی اگر یہ کار واقعی کرائے پر لی گئی ہے تو لینے والوں نے شاید ہی اصل ایڈریس لکھوایا ہوگا۔“
 ”میں چیک کرتی ہوں تم بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟“ جیمر لوٹ نے پوچھا اس عرصے میں اپنی کار چیک کر رہا تھا جو میں نے ساحل پر چھوڑ دی تھی وہ اپنی پہلی حالت میں تھی کسی نے اسے نہیں چھیڑا تھا میں نے جافری کا بیک سیٹ پر رکھا اور کار کا اشارت کی۔

”ہاں میرے ذہن میں ایک پلان ہے ہم اس کو ڈھونڈنے کے لیے اس کا ہی فون استعمال کریں گے جو اس کی جیب میں ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ جیمر لوٹ نے پوچھا۔

”جب میں نے جافری کے فون سے تمہیں کال کی تو دشمنوں نے اسے ٹریس کیا اور پتہ لگالیا کہ جافری اور میں

میں جافری کے ساتھ ایک ہوٹل میں داخل ہوا اور سیدھا استقبال کی طرف بڑھ گیا۔ جافری نے اپنا بیک اب بھی اپنے سینے کے ساتھ مضبوطی سے لگایا ہوا تھا۔
 ”مجھے ایک کمرہ چاہیے۔“ میں نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔

”اس کے لیے آپ کو اپنا شناختی کارڈ.....“ اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اچانک ایک عورت تیزی سے ہماری طرف آئی تھی اسے دیکھتے ہی میرے ذہن نے وارننگ دی تھی میرے خیال میں اس عورت نے جافری پر حملہ کیا تھا میں نے تیزی سے جافری کو دھکا دیا تھا اور وہ اپنے بیک سمیت کھٹکتا ہوا دوسری سمت چلا گیا تھا۔ عورت اپنے نقوش سے انگریز لگ رہی تھی۔ ہوٹل میں موجود لوگ حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ عورت نے دوسری چھلانگ مجھ پر لگائی تھی۔ میں نے تیزی سے اس کے حملہ کو روکا تھا اور اسے زمین پر گرا کر اس کو قابو کر لیا تھا پھر میں نے اس کی تلاشی لی تھی کہ کہیں اس کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں میرے تلاشی لینے پر وہ چراغ با ہوئی تھی۔

”تم یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔
 ”میرے اوپر سے ہٹو۔“
 ”تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا مسئلہ ہے۔“ میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا۔

”تم..... تم نے قطار توڑی تھی لائن میں میرا نمبر تھا تم آگے بڑھ گئے۔“ اس نے کہا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں جلدی میں تھا اور میں نے نوٹ نہیں کیا کہ استقبالیہ پر لائن گئی تھی جس کا میں نے خیال نہیں کیا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے وہ مجھے برا بھلا کہتی وہاں سے چلی گئی تھی اور میں نے مڑ کر جافری کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔

”میرے ساتھ جوا دہی تھا کسی نے اسے دیکھا؟“ میں نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا۔

”وہ دو آدمیوں کے ساتھ باہر گیا ہے۔“ ایک لڑکی نے باہر کی سمت اشارہ کیا اور میں تیر کی تیزی سے ہوٹل سے باہر نکل گیا میری پسلیوں کے نیچے موجود ذم کے ٹانگوں میں تکلیف ہو رہی تھی باہر نکل کر میری نظر ایک نیلے رنگ کی کار پر پڑی جو تیزی سے میرے سامنے سے نکل گئی تھی

کہاں ہیں اب یہی طریقہ ہم بھی استعمال کریں گے۔“
 ”ٹھیک ہے میں اسے کال کر کے تمہیں اس کی پوزیشن بتا سکتی ہوں۔“ چیرلٹ نے کہا۔

”نہیں“ میں خود اپنے K106 سے جافری کو کال کروں گا اور اس تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا پھر میں نے اپنا ریو الور لوڈ کیا تھا اور کار کی رفتار بڑھا دی تھی میرا رخ اسی سمت تھا جس سمت میں جافری کو لے کر نیلی کار روانہ ہوئی تھی پھر میں نے جافری کو کال کی تھی جسے ریسو کیا گیا تھا مجھے اس کی لوکیشن پتہ چل گئی تھی۔ وہ مجھ سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔

”میں تمہیں پھر کال کرتا ہوں۔“ میں نے چیرلٹ سے کہا اور فون بند کر دیا جب میں لوکیشن پر پہنچا تو وہ ایک پرانی طرز کا بناؤ تھا جو ایک نیلے پر موجود تھا اس ولا کے چاروں طرف ایک اونچی دیوار بنی تھی لیکن وہاں کسی قسم کے سکیورٹی کیسرے موجود نہیں تھے میں نے ولا سے کچھ فاصلے پر کار روک دی تھی اور پیدل ہی ولا تک گیا تھا۔ پھر دیوار پھلانگ کر میں دوسری طرف اتر گیا تھا ہر طرف سناٹا تھا اور رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں دبے قدموں عمارت میں داخل ہو گیا تمام دروازے کھلے ہوئے تھے اچانک مجھے ایک کمرے سے کسی کے بولنے کی آواز آئی یہ آواز میرے لیے جانی پہچانی تھی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سنی ہے لیکن یہ کسی برطانوی کی آواز تھی میں کچھ اور آگے بڑھا اور ایک شخص کے دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا وہاں ایک شخص کھڑا تھا جس کی پشت میری طرف تھی دوسرا شخص دوسری جانب تھا لیکن ایک پلر کی آڑ میں تھا جس کی وجہ سے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا جس شخص کی میری طرف پشت تھی وہ اچانک بولا۔

”ہم یہاں تمہاری مدد کرنے آئے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ تم میرے سوالات کا جواب دو۔“ اس نے کہا اور مجھے اچانک یاد آ گیا کہ میں نے یہاں پہلے کہاں سنی تھی وہ شخص بات کرتے کرتے چند قدم آگے بڑھا اور پھر گھوم اب میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا وہ بریڈ شاہ تھا جس سے میری ملاقات وائٹ ہال کے روم نمبر سکس میں ہوئی تھی اس کے سامنے ایک کرسی پر جافری بیٹھا تھا وہ حج سلامت تھا لیکن چہرے سے پریشان لگ رہا تھا پھر تیسرا

”ہیلو مسٹر بریڈ شاہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جافری کیسا ہے؟“ میں نے کہا اور کمرے میں موجود چاروں افراد نے میری طرف دیکھا ان کے چہروں پر حیرت تھی۔
 ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ بریڈ شاہ نے میری بات دہرائی۔

”میں تو جافری کو ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں تمہیں پتہ ہے چیرلٹ نے مجھے ذمہ داری دی ہے کہ میں اس پر نظر رکھوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا میری بات کے دوران ٹریڈ ویل اور بنٹس اپنی جگہ سے نہیں ہلے تھے۔
 ”ارے کیا چیز پوٹ نے تمہیں نہیں بتایا ہے کہ اسائنمنٹ تبدیل ہو گیا ہے اور تمہیں یہاں سے واپس جانا ہو گا؟“ بریڈ شاہ نے کہا۔

”حیرت کی بات ہے ابھی میری اس سے بات ہوئی ہے اس نے تو مجھ سے ایسا کچھ نہیں کہا بلکہ اس نے کہا کہ میں جافری کا بہت خیال رکھوں اسے کوئی نقصان نہ پہنچنے دوں۔“

”ہو سکتا ہے لیکن میں نے ذاتی طور پر یہاں ٹریڈ ویل اور بنٹس کی مدد سے اس مسئلے کو حل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ بریڈ شاہ نے کہا۔ ”چنانچہ اب تمہارے یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ بریڈ شاہ کی بات مکمل ہونے پر میں نے جافری کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ مجھے تنبیہ کر رہا ہو کہ میں بریڈ شاہ کی بات پر یقین نہ کروں۔

”تم نے جافری کو ہوٹل سے اغوا کیوں کیا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”تم اس چائنیز عورت کے ساتھ فرش پر الجھے ہوئے تھے۔“ اچانک ٹریڈ ویل بولا لیکن بریڈشانے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں خود وہاں موجود نہیں تھا ٹریڈ ویل اور بتیس تھے اور تمہیں پتہ ہے انہیں تو عقل نہیں ہے۔“ بریڈشانے کہا میں اس وقت تک اپنے ذہن میں منصوبہ بنا چکا تھا کہ اب میرا اگلا قدم کیا ہو گا چنانچہ میں آہستہ آہستہ جافری کی طرف بڑھا۔
 ”کیا سب ٹھیک ٹھاک ہے؟“ میں نے جافری سے پوچھا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ جافری کے بجائے بریڈشا نے جواب دیا اور میں اس کی طرف مڑا۔
 ”اچھا“ اگر سب ٹھیک ٹھاک ہے تو میں سب تمہارے کنٹرول میں دیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور دوستانہ انداز میں مصافحہ کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا وہ میری چال کو نہ سمجھ سکا اس نے بھی مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میں نے ماہرانہ پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی کمر کے پیچھے موڑ دیا تھا اور اسے پکڑ کر اپنے سامنے یوں کر لیا تھا کہ ٹریڈ ویل اور بتیس مجھے نشانہ نہیں بنا سکتے تھے وہ میری ڈھال بن چکا تھا اور اسی اثنا میں میرا ریا اور بھی میری کمر سے نکل کر میرے ہاتھ میں آ چکا تھا ٹریڈ ویل اور بتیس جو میری طرف بڑھے تھے میرے ہاتھ میں ریا اور دیکھ کر جہاں تھے وہیں رک گئے تھے میرا ریا اور اب بریڈشاہ کی گردن پر تھا اور بریڈشاہ بے بس ہو چکا تھا۔

”سب کو پرسکون رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”اور میرا کسی کو مارنے کا ارادہ نہیں۔“
 ”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“ بریڈشانے میری توقع کے خلاف کہا۔

”جافری میرے ساتھ جا رہا ہے۔“ میں نے کہا اور جافری اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

”اگر تم اچھے انسان ہو تو تم مجھے جافری کو لے جانے سے نہیں روکو گے۔ میں بہر حال اسکی حفاظت کر رہا ہوں اور اگر تم برے آدمی ہو تو تم مجھے روکو گے اور میں تمہیں

مارنے میں بالکل نہیں ہچکچاؤں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“ بریڈشانے کہا۔ ”مکن ہٹا لو اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات نہیں سنی تھی اور اس کی گردن سے ریا اور لگائے لگائے باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”اگر تم دونوں نے کوئی حرکت کی تو میں اسے گولی مار دوں گا تم ہمارے پیچھے نہیں آؤ گے۔“ میں نے ٹریڈ ویل اور بتیس سے کہا چنانچہ وہ اندر ہی رہے تھے۔

”کیا باہر کے گیٹ میں لاک ہے؟“ میں نے بریڈشا سے پوچھا۔
 ”ہاں۔“
 ”چابی کہاں ہے؟“
 ”میرے پاس۔“

”لاؤ چابی دو۔“ میں نے کہا تو اس نے جیب سے چابی نکالی جو جافری نے آگے بڑھ کر لے لی۔

”اپنی کار کی چابی بھی دو۔“ میں نے بریڈشا سے کہا اور اس نے چابی جافری کی طرف بڑھادی جافری چابی لے کر آگے چلا گیا تھا پھر کچھ ہی لمحوں میں وہ میری کار وہاں لے آیا تھا اور میں نے بریڈشاہ کو چھوڑ دیا تھا لیکن میرے ریا اور کار خن اب بھی اس کی طرف تھا۔

”اگر میرا پیچھا کیا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ میں نے کہا اور جافری نے گاڑی آگے بڑھادی۔

”تم نے فون کا جواب کیسے دیا؟“ میں نے جافری سے پوچھا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تمہارے پاس مجھے ڈھونڈنے کا واحد ذریعہ فون ہی تھا چنانچہ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنا موبائل اپنے موزے میں چھپالیا تھا وہ واہر ریٹ پر تھا اور جب اس میں واہریشن ہوئی تو میں نے کھانے کے بھانے کال ریسیو کرنے کا بیڑی دیا تھا۔“ جافری نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھڑکی۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے جیسر لوٹ کو فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ جافری ٹھیک ہے اور میرے ساتھ ہے وہ خاصی مطمئن ہوئی تھی۔

”تمہیں پتہ ہے اسے اغوا کرنے والے کون تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”اسے بریڈ شاہ نے اغوا کر دیا تھا اور ٹریڈ ویل اور ہنس بھی اس کے ساتھ تھے۔“ میں نے کہا میرا خیال تھا کہ چیئر لوٹ اس خبر پر حیران ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

”اس پر مجھے حیرت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔
”چیئر لوٹ مجھے بتاؤ کہ سب کیا ہو رہا ہے تم جو کچھ بھی جانتی ہو وہ مجھے بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”جافری کو آزاد کرواتے وقت تم نے کسی کو قتل تو نہیں کیا؟“ میری بات کے جواب میں پوچھا۔

”نہیں“ کیا کوئی مسئلہ ہے تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جافری کی زندگی بچانے کے لیے اگر مجھے کسی کو مارنا بھی پڑے تو میں مار سکتا ہوں۔“

”ہاں“ میں نے کہا تھا تم جانتے ہو کہ جب ہم ملے تو میں نے بتایا تھا کہ میں sis کے لیے کام کر رہی ہوں۔“
”ہاں مجھے یاد ہے اور تمہارا باس میری ویدر؟“

”وہ بھی sis کے لیے ہی کام کرتا تھا لیکن اب وہ سینٹرل آرگنائزیشن میں خود مختار ہو گیا ہے اور وہ ایک ایسا آپریشن کر رہا ہے جو بہت حساس ہے اور وہ موقع کی مناسبت سے صورت حال تبدیل کرتا رہتا ہے۔“

”جیسے کہ یہ آپریشن؟“
”ہاں۔“

”لیکن میں کافی حد تک کنفیوز ہوں تم نے مجھے پہلے جافری کو قتل کرنے کے لیے کہا پھر حفاظت کرنے کے لیے؟“

”سنو، ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جافری کی زندگی خطرے میں ہے چنانچہ میں نے اور میری ویدر نے فیصلہ کیا کہ اسے بچا میں چنانچہ ہم نے ایک منصوبہ بنایا اور تمہاری خدمات حاصل کیں اور پھر ہم قاتل سے محافظ میں بدل گئے اور اب تک ہمارا منصوبہ کامیابی سے چل رہا ہے۔“

”پھر اب جافری والے معاملے میں معاہدے کی خلاف ورزی کیوں ہو رہی ہے؟“

”میرا خیال ہے درمیان میں کوئی ڈبل ایجنٹ ہے جو ہمارے راز افشا کر رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ روی اور چائیز بھی میدان میں اتر آئے ہیں اور جافری کو مارنا چاہتے ہیں۔“

”اور ہماری اٹیلی جنس اسے کیوں مارنا چاہتی ہے؟“

”اس کی بھی وہی ایک وجہ ہے وہ ایک معاشیاتی جینٹس ہے میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ تم اسے اپنی رہائش گاہ پر مت لے جانا نہیں اور غائب ہو جاؤ جہاں تمہیں کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔“

”ٹھیک ہے..... کیا میں بریڈ شاہ کو قتل کر سکتا ہوں؟“
میں نے پوچھا۔

”نہیں..... جب تک کہ ایسا کرنا ناگزیر نہ ہو یعنی وہ جافری کو قتل کرنے کی کوشش کرے تب ہی تم اسے مار سکتے ہو۔“ چیئر لوٹ نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

”وہ کیا کہہ رہی تھی؟“ جافری نے مجھ سے پوچھا۔
”اس کا کہنا ہے کہ تم ایک معاشیاتی جینٹس ہو۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے وہ تو معاشیات کی ایک تھیوری ہے جس پر میں کام کر رہا ہوں۔“ اس نے فس کر کہا۔
”تھیوری یا فارمولا..... ایسا فارمولا جس کی خاطر کسی کو قتل کر دیا جائے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“
”لیکن معاشیات تو محض طلب اور رسد کا مضمون ہے اس میں کسی کی جان لینا نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔

”دراصل میری تھیوری طلب اور رسد پر مبنی نہیں ہے بلکہ میری تھیوری ایسی ہے کہ اسے استعمال کرنے والا ملک اپنی تمام تجارتی ملکوں پر برتری حاصل کر لے گا اور سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گا۔“ جافری نے کہا اور جب میں نے اس کے لفاظی گہرائی کا اندازہ لگایا تو میری سمجھ میں آیا کہ تجارتی میدان میں برتری اور منافع حاصل کرنے کے لیے تو ہر ملک ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہیے گا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے روپہ پیسہ اور ایسی جنس کے اداروں کو بھی استعمال کیا جانا ناممکن نہیں ہے اس طرح ملکوں کے درمیان معاشی جنگ چھڑ سکتی ہے چاہے وہ سب سبقت لے جانے کے لیے ہو یا دوسروں کو سبقت حاصل کرنے سے روکنے کے لیے ہو اگر واقعی جافری کوئی ایسا فارمولا ایجاد کر چکا ہے یا اس پر کام کر رہا ہے تو اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے مجھے احساس ہوا کہ چیئر لوٹ نے اس کی حفاظت کے لیے میری خدمات حاصل کر کے غلطی نہیں کی۔

”یہ فارمولہ کام کیسے کرے گا؟“ میں نے جعفری سے پوچھا۔

”یہ ایچ بی سی ریٹ میکسزم کے ذریعے کام کرے گا اور اسے انٹرنیشنل مارکیٹ میں بولیاں لگانے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔“ جعفری نے کہا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس فارمولے کو UK کی حکومت استعمال کرنا چاہتی تھی اس نے جعفری کی خدمات حاصل کی تھیں اور اب جیٹروٹ کے ذریعے اس کی جان کی حفاظت کی جا رہی تھی۔

”کیا تم برطانوی انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہے ہو؟“ جعفری نے مجھ سے سوال کیا۔

”تم نے ایسا کیوں سوچا۔“

”تم جیٹروٹ اور میری ویدر کے لیے کام کر رہے ہو اس لیے۔“

”ہاں تم ٹھیک سمجھ ہو۔“ میں نے جواب دیا پھر میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ میری کس طرح جیٹروٹ سے ملاقات ہوئی اور میں پہلے آرمی میں انٹیل پرائیج میں تھا میری بات مکمل ہونے پر کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔

”اب یہ سب کچھ اپنے انجام تک کیسے پہنچے گا؟“ کچھ دیر بعد جعفری نے خاموشی توڑا۔

”تم فکر مت کرو ہم اس مشکل سے نکل جائیں گے میں نے تمہارے ساتھ اڑتالیس گھنٹے گزارے ہیں اور میں ابھی تک تمہیں بچانے میں کامیاب رہا ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا۔“ میں نے کہا وہ رات ہم نے کار بی می گزری تھی شروع کی آدمی رات جعفری نے جاگ کر ڈیوٹی دی تھی اور باقی رات میری باری تھی ہم ساحل کے قریب مرینہ کے علاقے میں تھے اور مارکیٹ چند قدم کے فاصلے پر ہی تھی یہاں دو پولیس افسر ہمیں چیک کر چکے تھے وہ جانتا چاہتے تھے کہ ہم اتنی رات گئے وہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں میں نے انہیں راستہ بھٹکنے کا بہانہ بنا دیا تھا وہ چلے گئے تھے لیکن پھر وہاں رکنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا پھر اس سے پہلے کہ میں کارا گے بڑھاؤں دو مزید پولیس اہلکار وہاں پہنچ گئے تھے کار میں سے ایک پولیس افسر ہمارے قریب آیا تھا اور اس نے بھی پہلے پولیس افسر

کی طرح ہم سے سوالات کیے تھے میں نے اس کے سوالوں کے بھی جوابات دیئے تھے وہ مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا میں کار سے باہر آ گیا تھا اور اس سے مصافحہ کر کے واپس کار میں بیٹھنے لگا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑے دوسرے پولیس افسر نے اچانک ہی ریو اور نکال کر جعفری پر فائر کیا تھا جو کار میں بیٹھا تھا حسن اتفاق اسے گولی نہیں لگی تھی کیونکہ میں نے فائر ہونے سے ایک سیکنڈ پہلے ہی پولیس افسر کے ریو اور پر ہاتھ مارا تھا جس سے اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور اس پولیس افسر نے جھلا کر مجھ پر جھلانگ لگادی تھی لیکن میں اس حملے کے لیے پہلے ہی تیار تھا میں نے اس کا وار خالی دیتے ہوئے اس پر جوابی حملہ کیا تھا اور اس کو نیچے گر ادیا تھا میں نے اس کے بازو تختی سے پکڑے ہوئے تھے تب مجھے احساس ہوا کہ پولیس آفیسر کی وردی میں ایک عورت تھی لیکن اس کا جسم سخت اور مضبوط تھا اس کے ہاتھ سے گرے ریو اور کو میں نے دور اچھال دیا تھا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا مضبوطی سے پکڑ لیا تھا لیکن اس نے تیزی سے فلابازی کھائی تھی اور ایک زوردار لگ میرے پیٹ میں ماری تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری پیچھے سے نکلتی میں نے بھی ایک زوردار مکارا اس کے جڑے پر مارا تھا مجھے حیرت تھی وہ نہایت بہادری اور مردانہ انداز میں میرا مقابلہ کر رہی تھی میں نے ابھی تک اس کی کلائی پکڑی ہوئی تھی اس کے باوجود اس نے دونوں پیروں پر اچھلتے ہوئے فضا میں جھلانگ لگائی تھی اور دونوں پاؤں میرے پیٹ پر مارے تھے اس کے جوتوں کی نوکدار ایڑیاں میرے پیٹ میں جھبی تھیں اور مجھے شدید درد کا احساس ہوا تھا لڑائی کے دوران اس کے سر سے ہیٹ اتر گیا تھا اور اس کے سیاہ لمبے بال بکھر گئے تھے جن سے مجھے مہر کنڈیغفر کی خوشبو آ رہی تھی میں اب تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ رات اندھیری تھی اور خاصے فاصلے پر لگے بجلی کے پول کی روشنی وہاں تک پوری نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے اسے گرا کر اس کے دونوں بازو اس کی پشت پر پکڑ لیے تھے میں نے اپنا گھٹنا اس کی پشت پر گر کر چایا ہوا تھا اور میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ ایک اشارے سے اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ سکتا تھا وہ شاید میرے ارادے بھانپ گئی تھی اچانک اس نے نرم مگر غیر جذباتی انداز میں

مخاطب کیا۔

چیز لوٹ نے پوچھا۔

”ہاں وہ ٹھیک ہے میرا خیال ہے میں اس چائیز قاتلہ سے ملا ہوں جس کا نام ایکس رنگ ہے۔“

”وہ بہت سے نام استعمال کرتی ہے اس کا حلیہ کیسا تھا؟“ چیز لوٹ نے پوچھا۔

”بہت خوبصورت، پھولیں دل بھانے والی کالے گھنے لمبے بال اور جیتے جیسی پھر تیلی وہ جوڈو کراٹے کی ماہر ہے اور کسی گرگٹ کی طرح چھلانگیں لگاتی ہے۔“

”ہوں..... یہ وہی لگتی ہے جسے جافری کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے کیا تم نے اسے یاد دیا۔“

”نہیں..... وہ بھول چکی ہے۔“

”تو وہ دوبارہ حملہ کرے گی؟“

”میں جانتا ہوں اور تمہیں بتانا چلوں کہ یہاں کی پولیس بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں معاملے کی حقیقت کا اندازہ نہیں لیکن ایکس رنگ کسی نہ کسی طرح ان سے مدد لے رہی ہے اور شاید ان کے ذریعے ہی وہ ہمیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی ہے اور پولیس اپنے احکامات اپنے کسی سینئر سے لیتی ہے کسی ایسے افسر سے جو سمانتا کروڑ میں موجود ہے اور جس کا رابطہ برطانوی سفارت خانے سے ہے اگر تم یہ معلوم کر سکو کہ وہ شخص کون ہے تو وہ لندن میں موجود تمہارے خدا رب تک تمہاری رہنمائی کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں تمہیں پھر کال کروں گی۔“ چیز لوٹ نے کہا اور فون بند کر دیا ایکس رنگ کی سفید وین ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب سامنے سے مجھے ایک اور پولیس کار آتی نظر آ رہی تھی پھر وہ ہمارے برابر سے گزر گئی تھی اس کی چھت پر لگی وارننگ لائٹس آن تھیں انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا کار کے اندر دو پولیس افسر موجود تھے کار پھر پلٹ کر آئی تھی مجھے ہر حال میں جافری کی حفاظت کرنا تھی میرے پاس دو ہی راستے تھے ان کے پاس لڑوں یا فرار ہو جاؤں میں جانتا تھا کہ ان کے پاس گیس ہیں اور میں دو مقامی پولیس والوں کو مارنا نہیں چاہتا تھا اس سے میری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا میں نے ایک فیصلہ کیا اور کار کی رفتار بڑھا دی اب میں تیزی سے کار مختلف سڑکوں پر دوڑا رہا تھا اور پولیس کار کو دھوکا دینے کی

”کیا تم فوجی ہو؟ میرا نام ایکس رنگ ہے میں جانتی ہوں تم اس کی حفاظت کر رہے ہو اگر تم مجھے چھوڑ دو گے تو میں تمہاری مدد کروں گی..... میرے پاس اہم انفارمیشن ہے.....“ اس نے کہا لیکن میں نے اس کی بات سن کر اس پر اپنی گرفت دھیلی نہیں کی تھی اچانک میری نظر سامنے کی طرف پڑی جہاں ایکس رنگ کا ساتھی پولیس افسر جافری کو پکڑے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں بھی ریپوالتھا۔

”اسے چھوڑ دو.....“ اس نے ایکس رنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میرے لیے کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ جافری اس کے قابو میں تھا میں نے ایکس رنگ کو اس طرح چھوڑا کہ اسے چھوڑتے چھوڑتے ایک چھلانگ لگائی اور ایکس رنگ کا ریپوالتور جو کچھ فاصلے پر پڑا تھا وہ اٹھا کر پولیس افسر کا نشانہ لیا لیکن ایکس رنگ نے زیادہ پھرتی دکھائی تھی اس سے پہلے کہ میں فائر کروں وہ دوڑ کر سامنے کھڑی اپنی سفید رنگ کی وین میں بیٹھی تھی اور وین دوڑا دی تھی۔

”اپنی کن پھینک دو ورنہ میں فائر کروں گا۔“ میں نے پولیس افسر کو دھمکی دی اور اس نے کن پھینک دی۔

”کار میں بیٹھو۔“ میں نے جافری سے کہا اور وہ کار کی طرف دوڑا اس وقت میری نظر بجلی کے پول میں لگے سی ٹی وی کیمرے پر پڑی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں نے پہلے اس کی موجودگی وہاں محسوس نہیں کی تھی میں بھی تیزی سے جافری کے ساتھ کار میں بیٹھا اور جافری نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی ہم ایک سرخ رنگ کی وین کا پچھا کر رہے تھے۔

”یہ سب کیا ہے؟“ اچانک جیسے جافری کو ہوش آ گیا۔

”ایکس رنگ تمہیں ہیلو کہتا تھا؟“ میں نے کہا۔

”کون ایکس رنگ؟“ اس نے پوچھا لیکن میں نے اس کا جواب دینے کے بجائے چیز لوٹ کو کال ملائی۔

”ہیلو تم نے کیوں فون کیا ہے؟“ دوسری طرف سے چیز لوٹ کی آواز سنائی دی۔

”ضروری بات تھی۔“

”کیا جافری خیریت سے ہے..... وہ زندہ ہے؟“

کوشش کر رہا تھا، آخر ایک موقع پر ہم نے کار چھوڑ دی اور اپنے اپنے بیک لے کر کار سے چھلانگ لگادی۔ اب ہم لمبی ویران سڑک پر دوڑ رہے تھے، ہمیں دو ایک دیواری بنی نظر آ رہی تھی۔

”جافری دوڑتے رہو ہمیں اس دیوار تک پہنچنا ہے۔“ میں نے جافری سے کہا اور پھر جب ہم اس دیوار تک پہنچے تھے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ ایک پولیس افسر بھی ہماری طرح دوڑتے ہوئے ہمارا تعاقب کر رہا تھا اور ان کی کار بھی کچھ فاصلے پر تھی میں نے دیوار کے پیچھے جافری کو بیگوں سمیت چھپنے کے لیے کہا اور خود ان پولیس افسران کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر میں نے اسے مہلت نہیں دی تھی اور اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اس پر چھلانگ لگادی تھی اور ایک رولنگ بیرل کی طرح اس کو اپنے ساتھ لیتا دوڑتک لڑھکتا چلا گیا تھا پھر جیسے ہی وہ زمین پر گر گیا تھا میں اس کے اوپر تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر مارا تھا اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا تھا میں نے اس کی کن اپنے قبضے میں لی اور جافری کی طرف اچھال دی جسے اس نے اپنے بیک میں رکھ لیا اب مجھے دوسرے پولیس افسر کا انتظار تھا جو کچھ فاصلے پر کار میں ہمارا انتظار کر رہا تھا اور اس واقعے سے بے خبر تھا۔

میں نے جافری کو وہیں چھپنے کا اشارہ کیا اور دیوار کے دوسری طرف بڑھا مجھے دیوار کے پیچھے سے کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دے رہی تھی جب میں نے چھلانگ کر دیکھا تو دوسرا پولیس آفیسر کار میں بیٹھا تھا دوسری طرف سڑک سنسان تھی اور کچھ فاصلے پر چار کاریں کھڑی تھیں سڑک پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کی روشنی پر مدھم مدھم لیکن دیکھنے کے لیے کافی تھی پولیس کار کچھ ہی فاصلے پر موجود تھی اس کا رخ ساحل سمندر کی طرف تھا کار کا دروازہ کھلا تھا میں نے ہاتھ میں پہلے سے پکڑے ہوئے دو پتھروں میں سے ایک سمندر کی طرف اچھال دیا پتھر کے نیچے گرتے ہی چھپا کا ہوا اور پولیس افسر کار سے باہر آ گیا وہ آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا پھر میں نے دوسرا پتھر بھی اچھال دیا تھا اور پولیس افسر اس کی آواز کی سمت بڑھا تھا میں اندھیرے میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور

پیچھے سے اس پر چھلانگ لگا کر اسے اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی آواز نکالے میں نے اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور کے بٹ سے اس کی کینٹی پر دھنڑی لگائی تھیں اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے جافری کے پاس جانے کے لیے پلٹا تھا اور اس وقت میری نظر اس سفید وین پر پڑی تھی جس میں ایکس رنگ فرار ہوئی تھی میری ریڈنگ کی ہڈی میں سردی کی سرد لہر محسوس ہوئی اور مجھے خطرے کا احساس ہوا، میں نے فوراً اپنے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اسی لمحے مجھے اندھیری سڑک پر ایک سیاہ ہولنا نظر آواہ ایکس رنگ ہی تھی اس نے میری طرف رانقل تانی ہوئی تھی میں نے پھرتی سے اس پر فائر کیا اور دوسرے ہی لمحے ایکس رنگ کے ہاتھ سے رانقل چھوٹ کر دور جاگری اس کے ساتھ ہی ایکس رنگ پیچھے کی طرف گری تھی اور اس سے پہلے کہ میں دوسرا فائر کروں وہ اٹھ کر تیزی سے اندھیرے میں غائب ہو گئی تھی۔ میں نے چند لمحے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا مجھے اس کے قدموں کی آواز تک سنائی نہیں دی تھی شاید یہ بھی اس کی کنگ فوٹریٹنگ کا حصہ تھا میں نے اس کی رانقل اٹھائی اور پھر اس کی سفید وین کی تلاشی لی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا میں پھر جافری کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟ میں نے فار کی آواز سنی تھی کیا تم نے پولیس میں برگولی چلائی تھی؟“

”نہیں چلو یہاں سے چلو جلدی۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں یہ رانقل کہاں سے ملی؟“ اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی رانقل کے بارے میں پوچھا۔

”میں پھر بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور پولیس کار کی طرف بڑھا۔

”ہم پولیس کار میں جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میرے ساتھ دوڑ کر اس کار میں سوار ہو جاؤ بہت پھرتی سے۔“ میں نے جافری سے کہا اور پھر اس نے ایسا ہی کیا تھا میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی اور جافری میرے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ ہم نے پہلے اپنے بیک اور رانقل پیچھے ڈالے تھے تب ہمیں پتہ چلا کہ کار کی پچھلی سیٹ پر ایکس رنگ بے ہوش پڑی تھی اس نے سیاہ لباس

تھی اور ایکس رنگ کے جسم سے گولی نکلوا رہی تھی میں اس کا بے حد ممنون تھا پھر میں نے جیٹر لوٹ کوفون کر کے بتایا تھا کہ ایکس رنگ لندن میں کس رابطے سے بات کر رہی ہے اور اس کا فون نمبر کیا ہے جیٹر لوٹ بہت حیران ہوئی تھی وہ جانا چاہتی تھی کہ مجھے ایکس رنگ کا فون کہاں سے ملا لیکن یہ بات میں نے اسے نہیں بتائی تھی۔

ایکس رنگ میری شکر گزار تھی کہ میں نے اس کی زندگی بچائی تھی لیکن اسے بہت کمزوری تھی اور وہ آرام کر رہی تھی لیڈی ڈاکٹر جیفر اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے لاچ رہی پر رک گئی تھی وہ کورٹش کی اچھی دوست تھی میں نے ایک پورا دن سب کے ساتھ لاچ پر گزارا۔ ایکس رنگ کے ہاتھوں میں میں نے جھٹھڑیاں ڈالی ہوئی تھیں جن کے بارے میں ڈاکٹر جیفر اور کورٹش کو بتا دیا تھا جافری ساری صورت حال میں پر اعتماد رہا تھا میں موقع کے انتظار میں تھا کہ ایکس رنگ سے بات کر سکوں۔ آخر یہ موقع مجھے مل ہی گیا۔

”میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ایکس رنگ کے بیک سے اس کا فون نکالتے ہوئے کہا۔

”ہاں، کیسا سودا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اب لندن میں موجود شخص جب تمہیں کال کرے تو اسے بتانا کہ تم نے مجھے اور جافری کو مل کر دیا ہے۔“

”کیوں؟“
 ”غلط اطلاع دینا بھی سچائی پتہ کرنے کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔“

”بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”تم واپس اپنے گھر جاسکتی ہو۔“
 ”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اس نے کہا وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”تمہارے والد برطانوی تھے جس کی رو سے تم برطانوی شہری ہو میری مدد کرو جب یہ معاملہ منٹ جائے گا تو میں انہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیسے میری مدد کی تم برطانیہ میں نیا گھر بنا سکو اور فی زندگی شروع کر سکو۔“
 ”اور اگر میں مدد کرنے سے انکار کر دوں؟“

”تو تمہیں زندہ کھانا میرے لیے خطرناک ہوگا۔“ میں نے کہا اس کی نظریں میرے چہرے سے نہیں ہٹتی تھیں۔

پہننا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اس کا کالے رنگ کا بیک اس کے قریب پڑا تھا میں نے وہ اٹھا کر جافری کی طرف بڑھا دیا۔

”چیک کرو اس میں کیا ہے؟“ میں نے کہا اور وہ بیک چیک کرتے لگا میں نے دیکھا کہ ایکس رنگ کے پہلو میں گولی لگی تھی اور زخم سے خون بہہ رہا تھا۔

”اس کے بیک میں تین پاسپورٹ ہیں ایک اپنی ہے ایک برٹش ہے اور ایک ہانگ کانگ کا ہے اور اس کے علاوہ بہت زیادہ رقم بھی ہے۔“ جافری نے مجھے بتایا اس نے ہاتھ میں جو نوٹ اٹھائے ہوئے تھے وہ مختلف ملکوں کی کرنسی میں تھے۔

”اس کے پاس ایک فون بھی ہے جس میں ٹریک کرنے والا ریسیور لگا ہے اس کے فون کی کال بیٹری بڑی دلچسپ ہے۔“ جافری مستقل بول رہا تھا۔ ”اس نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں پانچ کالیں ریسیوو کی ہیں اور وہ سب ایک ہی نمبر سے کی گئی ہیں اور یہ سینٹرل لندن کا نمبر ہے۔“

”کیا؟“
 ”ہاں دیکھو۔“ جافری نے فون میری طرف بڑھایا اور میں نے ہسٹری چیک کی وہ درست کہہ رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ سینٹرل لندن سے کوئی اسے کالیں کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ ہمارے عدار کو اطلاعات دے رہی تھی یہ بات ہمارے لیے فائدہ مند ہو سکتی تھی اور ہم اس کے ذریعے عدار تک پہنچ سکتے تھے اس خیال کے آتے ہی میں نے ایکس رنگ کو مارنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اب میں اس کو بچانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی میرا ارادہ کورٹش کی لاچ پر جانے کا تھا اس نے پہلے بھی میری مدد کی تھی اور وہ یقیناً اب بھی میری مدد کر سکتی تھی جافری حیران تھا کہ ایکس رنگ کے بارے میں میرا رویہ بدل گیا تھا۔

جب میں کورٹش کی لاچ پر پہنچا تو وہاں وہ موجود تھی اور کھلے سمندر میں جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ میں نے اسے ایکس رنگ کے بارے میں بتایا تھا اور اپنی اور جافری کی پوزیشن بھی واضح کی تھی اور بتایا تھا کہ میں جافری کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا ہوں چنانچہ اس نے میری مدد کرنے کی ہامی بھری تھی اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو لاچ پر لائی

”مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا؟“

”میں تمہیں بھلا نہیں سکوں گا۔“ میں نے کہا اور وہ دھیرے سے مسکادی۔

”میں تمہاری مدد کروں گی۔“ اس نے کہا اور اسی وقت مجھے کسی دوسری لالچ کے انجن کی آواز سنائی دی میں نے سمندر میں نظریں دوڑائیں کچھ ہی دور ایک پولیس کی لالچ تیزی سے ہماری لالچ کی طرف آرہی تھی۔

”یہ میرے والد ہیں وہ پولیس کے چیف ہیں۔“ کورٹش نے کہا جو میرے قریب ہی کھڑی تھی میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے والد نے مجھے کئی بار کال کی وہ جانتے تھے تم میری لالچ میں ہوؤ وہ چاہتے تھے کہ میں تمہیں واپس لے جاؤں۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں بتانے والی تھی میرا خیال نہیں تھا کہ وہ یہاں تک آئیں گے۔“

”لیکن وہ آگئے ہیں۔“ کورٹش نے کہا اور ایکس رنگ کی طرف دیکھا جو ہماری باتیں سن رہی تھی۔

”میرے ہاتھ کھول دو اور مجھے گن دے دو میں تمہیں بچاؤں گی۔“ ایکس رنگ نے کہا لیکن میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

”تم سیکورٹی فرم سے کیسے ملیں؟“ میں نے ایکس رنگ سے پوچھا۔

”یہ بات مجھے لندن سے آنے والی کال میں کہی گئی تھی کہ میں ان سے رابطہ کروں انہیں انعام کر دیا گیا ہے۔“

”لندن سے تم سے کون بات کرتا تھا؟“

”وہ ایک مشینی آواز ہے جو صرف پیغام مجھ تک پہنچاتی ہے میں کسی شخص سے واقف نہیں۔“

”میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر تم یہاں سے کیسے بچ کر نکلو گے؟“ ایکس رنگ نے پوچھا اور میں نے جافری کی طرف دیکھا وہ موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا اور اس نے اپنا بیک اپنے کانڈھوں پر ڈال لیا تھا گویا سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے بالکل تیار تھا پھر جیسے ہی وہ بوٹ قریب آئی تھی اس میں سے تین پولیس آفیسرز ہماری لالچ پر آئے تھے جن میں ایک کورٹش

کا والد تھا میں نے سب سے پہلے اسے زمین پر ڈھیر کیا تھا اور پھر دوسرے پولیس آفیسر کو زخمی کرنے کے بعد تیسرے کی طرف پلٹا تھا اور اسے سمندر میں گرادیا تھا پھر جافری کے ساتھ میں نے پولیس لالچ پر چھلانگ لگا دی تھی اور لالچ چلاتا ہوا کورٹش کی لالچ سے دور نکل گیا تھا اس کے بعد میں نے اپنا K106 نکالا تھا اور سمندر میں قریب ترین جزیرے کاٹل وقوع معلوم کیا تھا وہ ہم سے دس میل کے فاصلے پر تھا میں نے لالچ کا رخ اس سمت موڑ دیا تھا اس کے بعد میں نے جیٹروٹ سے رابطہ کیا تھا اور اسے نئی صورت حال سے آگاہ کیا تھا اس نے مجھ سے نئی رہائش کا انتظام کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس میں وقت لگ سکتا تھا جبکہ فی الوقت مجھے ہی کچھ کرنا تھا میں نے اپنے ذہن میں نیا منصوبہ بنانا شروع کر دیا پھر K106 کے ذریعے میں نے اپنی لالچ کو ایک پرسکون ساحل پر روکا تھا جزیرے پر عمارتیں اور چھوٹا سا بازار نظر آ رہا تھا چھٹیوں پر آئے ہوئے کچھ لوگ سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جنہوں نے ہمیں کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ پھر میں نے ساحل پر بنے ایک کیفے میں چائے پینے کا پروگرام بنایا تھا میری خواہش پر جافری نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا لیکن وہ بولا کچھ نہیں تھا مجھے امید تھی کہ کورٹش کے والد ہمارے تعاقب میں پولیس کے ساتھ وہاں پہنچ سکتے تھے اور اب مجھے وہاں سے فرار کے لیے ایک کار کی ضرورت تھی کیفے میں بیٹھنے کے لیے میں نے جس میز کا انتخاب کیا تھا وہاں سے مجھے باہر کھڑی کاریں صاف نظر آرہی تھیں جن میں سے ایک کا مجھے انتخاب کرنا تھا اور یہ کام میں چائے پینے کے دوران کر سکتا تھا پھر ہوا بھی نیکی تھا میری نظر ایک کار پر پڑی تھی جو ابھی وہاں پہنچی تھی اور اس میں سے دو لڑکیاں تیراکی کے لباس میں باہر آئی تھیں ان کے ہاتھوں میں ان کے بیک تھے اور کچھ سامان بھی تھا انہوں نے کچھ فاصلے پر وہ چیزیں رکھی تھیں اور نہانے کے لیے پانی میں اتر گئی تھیں میرے لیے یہ موقع غنیمت تھا میں نے جافری کو اشارہ کیا وہ میرا مطلب سمجھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور میں آہستہ آہستہ لڑکیوں کے سامان کی طرف بڑھا وہ سمندر میں نہا رہی تھیں ان کا دھیان سامان کی طرف نہیں تھا میں نے ایک بیک کھولا اور اتفاق سے

بلکہ روسی ایجنٹ بھی شاید ہمارے K106 کے سکنز کے ذریعے ہم تک پہنچ گئے تھے اور اب چیئر لوٹ بھی ہمارے لیے مشکوک ہوگئی تھی میں تیزی سے کار میں بیٹھا اور بغیر سوچے سمجھے کار آگے بڑھادی کار پر روسی ایجنٹوں نے فائرنگ کی تھی لیکن میں نے ان کا جواب دینے کے بجائے وہاں سے فرار ہونے کو ترجیح دی تھی پھر میں مختلف سڑکوں اور گلیوں کے درمیان سے گزرتا اور اپنا تعاقب کرنے والوں کو دھوکا دیتا آگے بڑھتا چلا گیا تھا ہمارا تعاقب بریڈ شاہ نے نہیں کیا تھا بلکہ روسی کر رہے تھے لیکن کچھ دیر بعد ان کی کار بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی اب میرے ذہن میں نیا منصوبہ تھا مجھے رات گزارنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کا بندوبست کرنا تھا میں نے یہ یقین کرنے کے بعد کہ اب ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ایک اسٹیٹ ایجنسی کے سامنے کار روک دی لیکن کار اس طرح کھڑی کی کہ اسے باہر کی طرف سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا اور میں جافری کے ساتھ ایجنسی میں داخل ہو گیا جہاں ایک خوبصورت درمیانہ قد اور خوش اخلاق لڑکی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی کار سے اترتے وقت اس کی چابیاں میں ساتھ ہی لے آیا تھا کہ شاید مجھے پھر اس کی ضرورت پڑے۔

”ہیلو کیا تم انگلش بول سکتی ہو؟“ میں نے اپنی زبان میں اس سے پوچھا جس پر اس نے مسکرا کر اثبات میں سر دیا۔

”میرا نام ماریا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”میں چھٹیاں گزارنے نئی رفا آئے ہوں ہیں اور یہاں سے کچھ فاصلے پر رہائش پذیر ہیں مجھے یہ جگہ پسند آگئی ہے اور میں کچھ وقت یہاں گزارنا چاہتا ہوں کیا ہمیں رہائش کے لیے کوئی جگہ مل جائے گی۔“

”ہاں ضرور..... کیا آپ کو کوئی دوسرا نام ہے یا فلیٹ؟“

”میرا خیال ہے ایک دوسرا نام نہیں ہے گا۔“ میں نے جواب دیا جس پر اس نے ہمیں نئی دلاز کی تصویریں دکھائیں اور ان میں سے میں نے ایک پسند کر لیا۔ میں اسٹیٹ ایجنسی میں زیادہ دیر ٹھہرا نہیں چاہتا تھا کیونکہ روسی ایجنٹ کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتے تھے۔ دوسرا پسند کرنے کے بعد میں نے ماریا سے اس دلا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور

ابھی میں چابی مل گئی“ میں نے چابی اپنی پتلون کی جیب میں ڈالی اور کار کی طرف بڑھ گیا جافری میرے ساتھ تھا ہم نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا پھر میں اس چابی سے کار کو دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے عقب سے چابی پھانسی آواز سنائی دی۔

”مجھے امید تھی تم مجھے یہاں مل جاؤ گے۔“ میں نے لڑکھارے بیٹا شیرے سامنے کھڑا تھا اس کی کار اس کے فاصلے پر ہی تھی اور کار کے قریب اس کے ساتھی لڑکے اور تینس کھڑے تھے لیکن وہ تینوں ہی نہتے تھے لڑکے نے دوستانہ انداز میں میری طرف ہاتھ پھیلائے تھے میرا ہاتھ بھی گن تک پہنچنے پہنچنے رک گیا۔

”تم نے ہمیں کیسے ڈھونڈا؟“ میں نے پوچھا ساتھ ہی میں اطراف میں بنی بلند دیوار عمارتوں کو بھی بخور دیکھ رہا تھا جہاں کسی ایجنٹ نے باڑی موجود کی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا چنانچہ میں نے لڑنے میں پہل نہ کرنے کا فیصلہ لے لیا تھا۔

”ہم نے تمہیں تمہارے K106 کے سکنز سے ٹریک کیا ہے کیا تمہیں چیئر لوٹ نے بتایا تھا کہ اب K106 کو استعمال کرنا محفوظ ہے؟“ بریڈ شاہ نے کہا اور مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی کیونکہ واقعی چیئر لوٹ نے مجھ سے ایسا کہا تھا پھر یہ بات بریڈ شاہ کو کیسے معلوم ہوئی؟ میں نے اس بات کا بریڈ شاہ کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”تم سے پچھلی ملاقات کے بعد میں بہت مصروف رہا ہمارے درمیان جوئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے میں نے اس پر بہت سوچا کیوں کہ تم میرے ساتھ آؤ ہم تمہارے دلائل میں گم اور وہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔“ بریڈ شاہ نے کہا میں نے پھر اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کار میں بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا جافری بھی کار میں بیٹھ گیا تھا۔

”میری ایک بات سنو چیئر لوٹ پر بھروسہ مت کرنا۔“

”بریڈ شاہ نے پھر کہا۔“ وہ خود کو جو ظاہر کرتی ہے ویسی نہیں ہے۔“ اس نے کہا میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے لیکن اسی وقت ایک تیز رفتار کار مٹی والی ہمارے درمیان سے گزری اور میں نے دیکھا اس میں روسی ایجنٹ والا میر بیٹھا ہوا تھا میرے لیے خاصی ہوشیاری بڑھ گئی تھی تاہم صرف بریڈ شاہ نے ہمیں ڈھونڈ لیا تھا

روہ ہمیں ولا دکھانے کے لیے تیار ہوگئی پھر وہ اپنی ہی کار میں ہمیں ولاتک لے گئی تھی راستے میں چیز لوٹ کافون آیا تھا جسے میں نے مختصر بات کر کے کاٹ دیا تھا، کچھ ہی دیر میں ہم ولا تک پہنچ گئے تھے جو بہت خوبصورت بنا ہوا تھا اور اس کے آس پاس کوئی دوسری رہائش بھی نہیں تھی ولا مجھے بہت پسند آیا تھا۔

”کیا تمہیں ولا پسند آیا؟“ ولا دکھانے کے بعد ماریا نے مجھ سے پوچھا۔
 ”ہاں مجھے پسند ہے۔“ میں نے جواب دیا جس پر ماریا نے اپنا بزنس کارڈ مجھے تمھارے پاس دیا۔
 ”کیا واپسی سے پہلے میں ٹوائلٹ استعمال کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں بالکل۔“ ماریا نے کہا اور میں علی منزل پر

نئے ٹائلٹ کی طرف بڑھ گیا پھر میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی چند منٹوں میں ہی میں واپس آ گیا تھا لیکن ٹوائلٹ کی ایک کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی اسے ان لاک کر دیا تھا کیونکہ میرا ارادہ اس میں خفیہ طور پر واپس آنے کا تھا، واپس بر میں نے ماریا سے کہہ دیا تھا کہ ہم وہیں آس باس انجوائے کرنا چاہتے ہیں اور کچھ دیر بعد واپس جائیں گے چنانچہ وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی اس کی کار کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی میں جافری کے ساتھ ولا کی پشت پر گیا تھا اطراف کا جائزہ لیا تھا اور درونک کوئی نہیں تھا میں نے اندازے سے ٹوائلٹ کی کھڑکی ڈھونڈ کر کھولی تھی یہ وہی کھڑکی تھی جسے میں اندر سے کھول کر آیا تھا، اس کھڑکی کے راستے میں اور جافری پھر ولا میں داخل ہو گئے تھے اور وہاں سکون سے رات گزار سکتے تھے ہم اور پر منزل میں آ گئے تھے پھر میں نے کچن میں جا کر چائے بنائی تھی اپنے بیک سے بسکٹ کے کچھ پیکٹ نکالے تھے اور چائے پی تھی جس کے بعد میں سو گیا تھا جافری کی باری جاگنے کی تھی میرے بعد اسے سونا تھا۔

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

”تم اسے روکو گے، یہی ایک راستہ ہے۔“
 ”کیا یہ بات جافری کو زندہ رکھنے سے بھی زیادہ ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہے جافری کو بھی زندہ رکھنا ہے اور غدار کو بھی پکڑنا ہے..... بولو کیا تم یہ کر سکو گے؟“ چیز لوٹ نے پوچھا میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جافری فکر مند ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم نے یہ کر لیا تو یاد رکھو تمہیں ایک نئی ملازمت ملے گی جو تمہارے لیے بہت فائدہ مند ہوگی۔ یہ میرا وعدہ

ہے اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے تو میں میری ویدر سے تمہاری بات کروا سکتی ہوں۔“

”میں جافری کی حفاظت کرتا رہوں گا اگر اسے مارنے کوئی آیا تو اس شخص کو اس وقت تک مارنے سے گریز کروں گا جب تک کہ گنا گزیر نہ دہ۔“

”ہاں ٹھیک ہے تم مجھ پر بھروسہ ہے۔“ جیفر لوٹ نے کہا۔ ”کیا تم پلان کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“

”ہاں بتاؤ کیا پلان ہے؟“

”کیا تم جانے ہو کہ اس وقت کتنے لوگ تمہارے

تقاب میں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”برڈیشا، ٹریڈ ویل، بیس اور تین روسی اس کے علاوہ مقامی پولیس اور چائینز ایکس رنگ جس کا تعلق ہانگ کانگ سے ہے۔“

”کیا وہ اب بھی تمہارے تعاقب میں ہیں؟“

”ہاں..... کیوں؟“

”ہمارے پلان کا حصہ ہے کہ میں تمہاری لوکیشن کو ظاہر کروں گی اور پھر جو غدار ہے وہ کسی قاتل کو اس کے بارے میں بتائے گا وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے، ہانگ کانگ کی ایکس رنگ یا روسی ایجنٹ کوئی بھی۔“

”کیا.....؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ یہ پلان نہیں ہے

خود کشی ہے تم ہمیں چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہو مجھے جافری کی حفاظت کی ذمہ داری دے کر لوگوں کو خود

ہمارے پیچھے لگانا چاہتی ہو اور یہ بھی چاہتی ہو کہ میں قاتل کو ماروں نہیں۔ بلکہ زندہ پکڑوں۔“ میں نے کہا اور اسی

وقت مجھے اور جافری کو شور سنائی دیا جیسے کوئی لفٹ کے ذریعے اوپر آ رہا ہو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”مجھے جانا ہے۔“ میں نے تیزی سے جیفر لوٹ سے کہا اور فون بند کر دیا۔

”بیک اٹھاؤ۔“ میں نے جافری سے کہا۔ ”ہم ابھی

یہاں سے جا رہے ہیں۔“ جافری میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا میں نے فون جیب میں رکھا اور آگے بڑھا۔

”کس راستے سے جانا ہے؟“ جافری نے پوچھا۔

”سیڑھیوں سے۔“ میں نے کہا اسی وقت ایک روسی

فرنٹ سیڑھیوں پر نمودار ہوا اور میں نے تیزی سے اس کی

کچلی برکھنرہ مارا جس کے لیے وہ تیار نہیں تھا وہ لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا تھا اور پھر اٹھ نہیں تھا اسی وقت مجھے والڈامیر اس

طرف آتا دکھائی دیا اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی۔ ہم دونوں تیزی سے سیڑھیوں سے واپس اوپر جانے لگے اور

ہمارے پیچھے والڈامیر نے نفی فائر کر دیئے اوپر جانے کے بعد میں نے جافری کو کمرے کے کونے میں کھڑا کیا جہاں

سے وہ والڈامیر کو نظر نہیں آ سکتا تھا اور اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر میں والڈامیر کے اوپر آنے کا انتظار کرنے

لگا تھا پھر میں نے جافری کی طرف دیکھا۔

”تم خاموش رہو اور یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔“

میں نے سر گھٹی میں کہا۔

”مجھے اکیلا مت چھوڑو۔“ اس نے خوفزدہ آواز میں

کہا۔

”اچھا ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے

واپس جائیں گے۔“ میں نے جافری سے کہا اور آہستہ

آہستہ پھر چلی منزل میں موجود ٹائلٹ کی طرف بڑھنے لگا

دوسرے روسی کے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی تھی شاید

وہ اپنے تیسرے ساتھی کو صورت حال بتانے کے لیے گیا تھا

میں نے موقع غیبت جانا اور جافری کے ساتھ ٹائلٹ کی

کھڑکی کے راستے باہر آ گیا۔ روسی ابھی تک اندر ہی تھے۔

”اب کیا کریں؟“ جافری نے فکر مندی سے کہا۔

”ہم گیراج کی طرف جا کر صورت حال کا جائزہ لیں

گے۔“ میں نے کہا اور گیراج کی طرف بڑھا میرے ہاتھ

میں ریپو اور بھی جافری مجھ سے چند قدم پیچھے تھا اور اس نے

بیک اٹھائے ہوئے تھے۔

گیراج کا دروازہ کھلا تھا میں جیکے سے اندر داخل

ہوا وہاں ایک کار کھڑی تھی لیکن خاموشی میں آگے بڑھا

میرا ارادہ کار پر قبضہ کرنے کا تھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ

گیا کہ کار کے اسٹیرنگ ویل سے ماریا کے ہاتھ بندھے

ہوئے تھے اور منہ پر پٹی بندھی تھی وہ مجھے دیکھ کر طرح طرح

کی آوازیں نکالنے لگی لیکن منہ پر بندھی پٹی کی وجہ سے کچھ

بولنے سے قاصر تھی۔

”تم محفوظ ہو..... میں برطانوی گورنمنٹ کے لیے کام

کرتا ہوں میں تمہاری مدد کروں گا۔“ میں نے اس سے کہا

اور اس کے منہ پر بندھی پٹی کھول دی۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر قہر کیا مگر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگری اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اتنی دیر میں والد امیر اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا اور اپنا رپوٹور اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے اتنا موقع نہیں دیا تھا اور اپنے رپوٹور کا بٹ اس کی پٹنی پر تیزی سے مارا تھا اور وہ لڑکھا کر گر گیا تھا یہ میرا پسندیدہ وار تھا اس طرح میں اپنے حریف کو بے ہوش کر دیتا تھا میں نے والد امیر کا رپوٹور اور مشین گن پر قبضہ کر لیا تھا اور انہیں میز پر رکھ کر مڑائی تھا کہ پشت سے روی لیڈر نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ٹرینڈ فاسٹر تھا اور شاید روی فوج سے ریٹائرڈ تھا۔ کیونکہ اس کی مہارت اس کی بہترین فائٹنگ کی چٹائی تھی مجھے اس کو زیر کرنے میں کئی منٹ لگے تھے آخر کار میں اسے بھی بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کی جیب سے مجھے ماریہ کی کار کی چابی مل گئی تھی میں چاہتا تو ان تینوں کے سروں میں گولیاں اتار سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تھا میں نے انہیں ولای میں چھوڑا تھا اور چاہتا تھا کہ پولیس ان کو گرفتار کرے میں نے وہیں سے کوئٹہ کو فون کیا تھا اور ان کے بارے میں بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ اپنے والد سے کہو کہ ان تینوں کو گرفتار کر لیں پھر میں کار لے کر ساحل کی طرف روانہ ہو گیا تھا جہاں ماریہ اور جافری میرے منتظر تھے پھر جب وہ کار میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھے تو جافری کے چہرے پر مجھے خوف کے سائے نظر آئے وہ میرے پیچھے دیکھ رہا تھا میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر پیچھے دیکھا بریڈ شا میرے پیچھے موجود تھا اور اس کے پیچھے ٹریڈ ویل اور ٹینس کھڑے تھے۔

بریڈ شا پر سکون نظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی خوش تھے انہوں نے میری شرٹ کو خون آلود دکھ لیا تھا کیونکہ فائٹنگ کی وجہ سے میرے زخم کے ٹائٹل کھل گئے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا بریڈ شا مجھ رہا تھا کہ اس نے مجھے نچا دکھا دیا ہے مجھے بھی اسے دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی تھی اس کی یہاں موجودگی نے ایک بات واضح کر دی تھی کہ اگر انہیں جافری کو مارنے کے آرڈر ملے بھی تھے تو وہ ختم ہو چکے تھے کیونکہ انہوں نے اب کوئی ایسی کوشش نہیں کی تھی وہ یقیناً روی ایکٹوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم تک پہنچے

”انہوں نے کہا تھا کہ وہ تمہارے دوست ہیں پھر انہوں نے گن دکھا کر مجھے اغوا کر لیا اور مجھ سے تمہارا پیہ پوچھ کر یہاں آ گئے۔“ ماریہ نے سرگوشی میں بتایا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... پرسکون رہو..... یہ بتاؤ کار کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”لیڈر کے پاس۔“

”لیڈر کون ہے؟“

”جس کے ہاتھ میں مشین گن ہے۔“ اس نے کہا اور میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔

”تم دونوں ایسا کرو کہ یہاں سے نکل جاؤ تم سریندی کی طرف مت جانا بلکہ ساحل کی طرف جانا اور چھوٹی پہاڑی کے پیچھے چھپ جانا میں وہیں آؤں گا میں کار کی چابیاں لے کر کار لاؤں گا اور پھر ہم وہاں سے نکل جائیں گے۔“ میں نے کہا میری تجویز جافری کو پسند نہیں آئی تھی وہ ایک لمحے کو بھی مجھ سے جدا نہیں ہونا نہیں چاہتا تھا۔

”اگر تیس منٹ تک میں نہ آؤں تو تم پولیس کے پاس چلے جانا اور انہیں سب کچھ بتا دینا۔“ میں نے کہا تو ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا اور میں جافری کی طرف مڑا۔

”اگر میں تیس منٹ تک نہ آؤں تو تم جیٹر لوٹ کو کال کر کے سب بتا دینا تم ماریہ کے ساتھ پولیس کے پاس مت جانا تم جیٹر لوٹ کی اگلی ہدایات کا انتظار کرنا۔“

”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“ جافری نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

”نہیں، تمہیں روسیوں سے دور رہنا ہے ان کے پاس مشین گن ہے ابھی تم ماریہ کے ساتھ جاؤ میں جلد تم تک پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

ماریہ اور جافری کے وہاں سے جانے کے بعد میری ساری توجہ تینوں روسی انجینئرس کی طرف ہو گئی اور میں آہستہ سے بیڑیوں کی طرف بڑھا۔ فرنیس اب بھی وہاں بے ہوش پڑا تھا لیکن اسے نظر انداز کرتا ہوا میں بیڑیوں کی طرف بڑھا اور پہنچا تھا کوئی آہٹ یا آواز سنائی نہیں دے رہی تھی میں بچوں کی طرف بڑھتا ہوا مجھے ان روسیوں کے ہاتھ کرنے کی آواز آئی۔ والد امیر کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنے زخم پر پٹی باندھنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ اس کے پاس جو روی نظر تھا اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی اور وہی لیڈر تھا

مصنفین سے گزارش

- ☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
- ☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرہ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
- ☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
- ☆ خوشبوخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
- ☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
- ☆ فونو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فونو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
- ☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
- ☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
- ☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ اک کے ذریعے ارسال کیجیے۔
- ☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔
- ☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔
- 7 فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

تھے انہوں نے یقیناً ماریہ اور جافری کو دلا سے نکلے دیکھا ہوگا اور ان کے تعاقب میں یہاں تک آئے ہوں گے اس عرصے میں اگر وہ جافری کو مارنا چاہتے تو بہت آسانی سے مار سکتے تھے۔

”روسیوں کے مقابلے میں میری مدد کرنے کا شکریہ۔“ میں نے بڑے شاپرطن کیا۔

”میں جانتا تھا تم انہیں قابو کر لو گے۔“ اس نے میری خون آلود شرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم تو زنجی ہو۔“

”یہ بہتر وقت ہے کہ ہم بات کر کے معاملہ حل کر لیں۔“ بڑے شانے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں آؤ..... کار میں بیٹھ جاؤ تم ماریہ کی کار میں بیٹھ کر مجھ سے بات کر سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کار میں بیٹھے میں نے ماریہ اور جافری کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا سب کے بیٹھے ہی میں نے کار آگے بڑھادی تھی بڑے شانے کے دونوں ساتھی وہیں اپنی کار کے ساتھ کھڑے رہ گئے تھے۔ بڑے شانے میرے ساتھ اگلی سیٹ پر تھا اور جافری اور ماریہ پیچھے بیٹھے تھے۔

”اگر تم اس سارے معاملے سے بخیریت نکلنا چاہتے ہو تو تمہارے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ مجھ پر بھروسہ کرو۔“ بڑے شانے کہا۔

”بھلا میں ایسا کیوں کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کام ہم نے چیئر لوٹ کے ساتھ مل کر شروع کیا تھا وہ اب اپنے پاس کو بروٹیکٹ کر رہی ہے ہم دونوں مل کر معاملے کو درست کر سکتے ہیں۔“

”اس بات کی وضاحت کر دو تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”چیئر لوٹ بھی میری ویدر کے ساتھ ٹینٹل انٹیلی جنس میں کام کرتی تھی پھر اس کے ادارہ چھوڑنے کے بعد اس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔“

”میں تم لوگوں کی ذاتی لڑائی کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اور چیئر لوٹ نے مل کر مجھے اس معاملے میں ڈالا تھا جو روی ہم سے مگر اے وہ بھی ایک حقیقت ہیں اور اگر چاہنا ہے کسی قاتلہ کو بھیجا اور مقامی پولیس بھی مداخلت

کر رہی ہے تو میں اور جعفری بہت خوش قسمت ہیں کہ زندہ ہیں جبکہ تم اور چیز لوٹ سبھی فیصلہ نہیں کر پا رہے ہو کہ اس ٹھیل کا ہیرو کون ہے میں اپنی زندگیوں کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کون غدار کو بے نقاب کرتا ہے میں بس اس معاملے کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ یہاں سے ہم واپس جا سکیں۔“ اپنی گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ بریڈ شا کے تاثرات تبدیل ہوئے ہیں اور وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے کوئی ایسی بات جو پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنا رویہ اور نکالا اور میری طرف اٹھایا میں نے تیزی سے ایک ہاتھ اس کے رویہ اور پر مارا تھا اور دوسرا اس کی گردن پر میرا وار اتنا طاقت ور تھا کہ وہ اپنی سیٹ پر تڑپنے لگا اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔

”تمہارا زرخیز دو تین دن تک سمجھا رہے گا۔“ میں نے کہا بریڈ شا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم نے گمن کیوں نکالی تھی بتاؤ معاملہ کیا ہے؟“ میں نے پھر پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اس وقت کاری رفتار تیز نہیں تھی بریڈ شا نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر کود گیا پھر وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف بھاگتا چلا گیا تھا میں نے اس کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اطمینان سے کارڈ ریور کرتا رہا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے جعفری سے پوچھا۔ جو میری اور بریڈ شا کی گفتگو سن رہا تھا۔

”یوں لگا جیسے وہ خوفزدہ ہو تمہارا کیا خیال ہے؟“ کہیں یہ غدار کو جانتا تو نہیں؟ میرا خیال ہے وہ ہمارے اندازے سے زیادہ جانتا ہے۔“ جعفری نے کہا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ میرے اور جعفری کے لیے اس معاملے سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے اور وہ یقیناً چیز لوٹ کا راستہ نہیں ہے میں نے عقبی آئینے میں دیکھا ماریہ کاب رہی تھی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

”جعفری اسے سہارا دو شاید یہ ذہنی صدمے کا شکار ہے۔“ میں نے جعفری سے کہا اور اس نے ماریہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا ماریہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور میں نے کار کار ڈاکٹر جعفری کی رہائش کی طرف موڑ دیا تھا جس

کا پتہ میں نے اس سے کورٹش کی لالچ پر پوچھ لیا تھا۔

”اب اگلا منصوبہ کیا ہے؟“ جعفری نے پوچھا۔

”اس وقت ہمیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے جعفری کی رہائش پر جارہا ہوں۔“ میں نے کہا میری بات پر جعفری نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر جعفری کے اپارٹمنٹ کے باہر مجھے ایک پولیس آفیسر نظر آیا تھا لیکن اپارٹمنٹ کے اندر کوئی پولیس آفیسر نہیں تھا میں جعفری اور ماریہ کے ساتھ اس کے فلیٹ تک پہنچا تھا اور ریل بجائی تھی۔

”اوہ تم.....؟“ میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید تم سے اب ملاقات نہ ہو۔“ ڈاکٹر جعفری نے مجھے دیکھ کر حیرت سے کہا اور دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گئی۔

”کیا تمہارے فلیٹ پر کوئی پولیس گارڈ نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں انہوں نے مجھے کسی پولیس گارڈ کی آفر نہیں کی..... تم یہاں محفوظ ہو۔“ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا پھر اس کی نظریں میری خون آلود مٹ پر پڑی تھیں۔

”اوہ تمہارے ٹانگے شاید کھل گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں، لیکن تم پہلے اسے دیکھو یہ صدمے میں ہے۔“ میں نے ماریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو جعفری اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تمیں روسیوں نے اسے گن پوائنٹ پر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی ہم نے اسے بچایا ہے۔“ جعفری نے کہا اور میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جعفری پھر ماریہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور تب ہی میرے کانوں سے ایک جانی پہچانی نسوانی آواز نکلتی تھی۔

”ہیلو دوبارہ مل کر خوش ہوئی۔“ میں نے چونک کر سراٹھایا تو چائیز قاتلہ ایکس رنگ میرے سامنے کھڑی تھی میں جعفری کے فلیٹ پر اس کے ملنے کی توقع نہیں کر سکتا تھا میرا ہاتھ بے اختیار میرے رویہ اور پر جا کر رک گیا تھا لیکن میں نے اسے نکالا نہیں وہ میرے سامنے ہتی کھڑی تھی۔

”یہ زخمی تھی اور میں اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی چنانچہ اسے لالچ سے واپسی پر اپنے ساتھ لے آئی تھی۔“ جعفری

نے جعفری سے کہا اور اس نے ماریہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا ماریہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور میں نے کار کار ڈاکٹر جعفری کی رہائش کی طرف موڑ دیا تھا جس

کا پتہ میں نے اس سے کورٹش کی لالچ پر پوچھ لیا تھا۔

”اب اگلا منصوبہ کیا ہے؟“ جعفری نے پوچھا۔

”اس وقت ہمیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے جعفری کی رہائش پر جارہا ہوں۔“ میں نے کہا میری بات پر جعفری نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر جعفری کے اپارٹمنٹ کے باہر مجھے ایک پولیس آفیسر نظر آیا تھا لیکن اپارٹمنٹ کے اندر کوئی پولیس آفیسر نہیں تھا میں جعفری اور ماریہ کے ساتھ اس کے فلیٹ تک پہنچا تھا اور ریل بجائی تھی۔

”اوہ تم.....؟“ میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید تم سے اب ملاقات نہ ہو۔“ ڈاکٹر جعفری نے مجھے دیکھ کر حیرت سے کہا اور دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گئی۔

”کیا تمہارے فلیٹ پر کوئی پولیس گارڈ نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں انہوں نے مجھے کسی پولیس گارڈ کی آفر نہیں کی..... تم یہاں محفوظ ہو۔“ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا پھر اس کی نظریں میری خون آلود مٹ پر پڑی تھیں۔

”اوہ تمہارے ٹانگے شاید کھل گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں، لیکن تم پہلے اسے دیکھو یہ صدمے میں ہے۔“ میں نے ماریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو جعفری اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تمیں روسیوں نے اسے گن پوائنٹ پر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی ہم نے اسے بچایا ہے۔“ جعفری نے کہا اور میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جعفری پھر ماریہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور تب ہی میرے کانوں سے ایک جانی پہچانی نسوانی آواز نکلتی تھی۔

”ہیلو دوبارہ مل کر خوش ہوئی۔“ میں نے چونک کر سراٹھایا تو چائیز قاتلہ ایکس رنگ میرے سامنے کھڑی تھی میں جعفری کے فلیٹ پر اس کے ملنے کی توقع نہیں کر سکتا تھا میرا ہاتھ بے اختیار میرے رویہ اور پر جا کر رک گیا تھا لیکن میں نے اسے نکالا نہیں وہ میرے سامنے ہتی کھڑی تھی۔

”یہ زخمی تھی اور میں اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی چنانچہ اسے لالچ سے واپسی پر اپنے ساتھ لے آئی تھی۔“ جعفری

نے کہا۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی تم سے دوبارہ ملاقات ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”تم لڑتے رہے ہو.....“ اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے میری خون آلود شرٹ چھوتے ہوئے کہا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ میں نے اسے تنبیہ کی تو اس نے فوراً اپنے ہاتھ اپنے سر کے اوپر اٹھا لیے تھے۔

”اگر تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو تم مجھے کوئی مار سکتے ہو۔“ ایکس رنگ نے کہا۔

”جافری اس کو نشانے پر رکھو اگر کوئی حرکت کرے تو کوئی مار دینا۔“ میں نے اپنا پولو اور جافری کو تھما دے ہوئے

کہا اور خود ایکس رنگ کی تلاش کی لیکن اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا پھر میں نے اسے جافری کی مدد سے ہاندھ

دیا اس مقصد کے لیے میں نے جیفر سے رسی لی تھی اس نے اعتراض بھی کیا لیکن میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے

واپس جانے کے بعد اسے کھول سکتی ہے پھر جیفر نے میرے ناکوں کی صفائی کی تھی ایکس رنگ کی نظریں مستقل

مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔

”کوئی نئی خبر؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”لندن سے اب تک میرا کوئی رابطہ نہیں ہوا ہے نہ ہی میں انہیں دوبارہ رپورٹ کر سکی ہوں جب تک مجھے اگلے

احکامات نہیں ملتے میرے لیے صورت حال پریشان کن رہے گی۔“

”میری پیشکش ابھی تک برقرار ہے میری مدد کرو۔“ میں نے کہا۔

”اگر تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہو تو میں تمہاری مدد کیسے کر سکتی ہوں؟“ ایکس رنگ نے کہا میں نے اس کی

بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا ڈاکٹر جیفر نے ماریہ کو ایک کمرے میں آرام کرنے کے لیے لٹا دیا تھا اور میں جافری کے ساتھ فلیٹ سے واپس نکل گیا تھا ایکس رنگ کی نظریں

اب بھی میرے چہرے پر تھیں۔

”میرے پیچھے مت آنا اپنے گھر واپس جاؤ۔“ میں نے ایکس رنگ سے کہا۔

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ میں نے ایکس رنگ کو کہتے

سنا پھر ڈاکٹر جیفر نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

”کیا تمہیں پتہ تھا کہ ایکس رنگ ہمیں یہاں مل جائے گی؟“ میرے کار میں بیٹھے ہی جافری نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں، بھلا میں یہ سوچ بھی کیسے سکتا تھا..... دیکھو جافری میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ ہم دونوں کو

ہر حال میں ایک ساتھ رہنا ہے تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہوگا میری ذمہ داری ہی تمہاری حفاظت کرنا ہے۔“ میں نے

اسے سمجھایا۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“ جافری نے کہا۔ ”میں ایکس رنگ کو دوبارہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔“

”میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔“

”اب چیز لوٹ کیا چاہتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ چاہتی ہے کہ ہم اس کے پلان پر عمل کریں۔“

”اور اس کا پلان کیا ہے؟“

”تمہیں اس کا پلان سمجھ نہیں آئے گا لیکن وہ ہمیں چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ ہماری لوکیشن کے بارے میں خیر عام کر دے گی اور غدار جو لندن میں ہے تمہیں مارنے کے لیے نیا قاتل بھیجے گا اور ہمیں اس قاتل کو زندہ گرفتار کرنا ہوگا۔“

”کیوں؟“

”جیفر لوٹ اس سے غدار کے بارے میں معلومات لے گی اور سیاسی طور پر غدار کو بے نقاب کرے گی اور پھر ہم

آزادی سے اپنے وطن واپس جا سکیں گے۔“

”اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے؟“

”اس کے علاوہ ایک راستہ ہے ہم اپنا پلان خود بنائیں۔“ میں نے کہا۔ میں کار کو مختلف سڑکوں پر گھومتا

پھر رہا تھا اور کسی ایسی پرسکون جگہ کی تلاش میں تھا جہاں کسی کی نظروں میں آئے بغیر میں چیز لوٹ کو کال کر سکوں

اور جافری سے بھی موجودہ صورت حال پر بات کر سکوں

سورج آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا۔ میں نے ایک ہوٹل کے

اجاطے میں دوسری گاڑیوں کے درمیان کار کھڑی کر دی اور

رائجن بند کر دیا پھر میں چیز لوٹ کو فون کرنے کے لیے نمبر

ملا ہی رہا تھا کہ اچانک فون کی کھنٹی بجی دوسری طرف سے

کورٹش کال کر رہی تھی میں نے کال ریسیو کی لیکن دوسری

طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔
”میں ریوس کورٹس بول رہا ہوں چیف آف پولیس۔“

”تم کو وہ تین تحفے مل گئے جو میں دلا میں تمہارے لیے چھوڑ آیا تھا۔“ میں نے اس سے کہا وہ کورٹس کا باپ بول رہا تھا اور میرا اشارہ ان تین روسیوں کی طرف تھا جن کی گرفتاری کے لیے میں نے کورٹس کو فون کیا تھا۔
”ہاں..... وہ تینوں ہمیں مل گئے ہیں مجھے یہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟“

”کیوں تم کیوں جانا چاہتے ہو؟“
”میں ان تینوں کے سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کون ہیں؟“
”پہلے تم مجھے بتاؤ کہ وہ کیسے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”وہ اسپتال میں ہیں میرے آدمی ان کی نگرانی کر رہے ہیں دو شدید زخمی ہیں اور ایک کی حالت بہتر ہے اب تم بتاؤ کہ وہ کون ہیں؟“
”وہ روسی ہیں اور انہیں یہاں جافری بن کو مارنے کے لیے بھیجا گیا ہے یہ وہی آدمی ہے جو میرے ساتھ ہے میں یہاں اس کی حفاظت کر رہا ہوں اور اسے زندہ رکھنا میرا مشن ہے۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی میرا کام ہو گیا تھا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تینوں روسی پولیس کی نگرانی میں ہیں اور مجھے مزید تنگ نہیں کریں گے۔ میں نے یہ خوش خبری جافری کو سنائی تو وہ بھی مسکرا دیا۔

”کیا وہ روسی بلٹ پروف جیکٹس پہنے ہوئے تھے؟“
اس نے پوچھا۔
”ہاں“ میں نے دو کی جیکٹس اتار کر اپنے بیگ میں رکھ لی تھیں۔ میں نے کہا اس کے بعد میں نے چیئر لوٹ کو کال کی تھی اس نے پہلی ہی رنگ پر کال ریسیو کی تھی۔
”کیا تم دونوں ٹھیک ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں“ میں جانا چاہتا ہوں تمہارا پلان کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”وہی جو میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا میں تمہاری لوکیشن کے بارے میں خبر عام کروں گی قاتل جافری کو مارنے آئے گا تم اسے روکو گے اور اسے زندہ میرے پاس لاؤ گے۔“

”یہ میں جانتا ہوں میں اس کی تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔“
”میں نے ایک جگہ تمہارے لیے پسند کی ہے یہ جزیرے کے شمال میں واقع ہے کیا تمہارے پاس کار ہے؟“
”ہاں۔“

”ٹھیک ہے میں تمہیں کچھ دیر میں ایڈریس دیتی ہوں اس کے مطابق تم کام کرنا دلا بالکل خالی ہے اور پہاڑی کے اوپر واقع ہے اس کے چاروں طرف گھنے درخت ہیں اس تک صرف ایک تنگ سارا سہ جاتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے سوائے اس کے تم بہت اچھے کوہ پیما ہو اور پہاڑ پر مہارت سے چڑھ سکتے ہو یہ وہ منزلہ ہے اور خاصا بڑا ہے اس کے باہر دو دور تک سیکورٹی سینٹر لائٹس لگی ہوئی ہیں یہ ایک جہز کی ملکیت ہے اس کا نام ٹر ہے اور میں نے یہ تمہارے لیے ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لیا ہے بالکل ایسے جیسے تم چھٹیاں گزارنے وہاں گئے ہو تم وہاں اس سے ملو گے تم اسے روم دو گے اور وہ تمہیں چاہیاں دے گا اسے رقم کیش میں دینا اسے 1650 ایروز دینا ہوں گے کیا تمہارے پاس کافی رقم ہے؟“

”ہاں..... لیکن؟“
”میں نے تمہارے نام اسمتھ اور جانسن بتائے ہیں۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔
”ولا میں دوورین بھی ہے جو تم استعمال کر سکتے ہو تم بہت دور سے بھی کسی کو ادھر آتے ہوئے دیکھ سکتے ہو یہ جگہ تمہارے لیے آئیڈیل ہے۔“

”ٹھیک ہے مجھے یہ بتاؤ کہ جس شخص کو اب بھیجا جائے گا تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“
”میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے سوائے اس کے کہ وہ اب تک آکس لینڈ پہنچ چکا ہوگا۔“
”اوکے۔“

”میں تمہارے دلا پہنچنے کے بعد ہی تمہاری لوکیشن عام کروں گی اور اس کے بعد کسی بھی وقت قاتل تم تک پہنچ جائے گا۔“
”میں سمجھ گیا“ اب مجھے بریڈشا کے بارے میں بتاؤ

”ٹھیک ہے میں تمہیں پھر کال کروں گی۔“ جیڑ لوث نے کہا اور کال کاٹ دی۔

ہمارے سفر کا آغاز فوراً ہی ہو گیا تھا میں نے دلا کے راستے پر سفر کرتے ہوئے جافری کو ساری تفصیل سمجھا دی تھی ہم مطمئن تھے کہ معاملات ہمارے پلان اور مرضی کے مطابق آگے بڑھ رہے تھے اور مجھے امید تھی کہ ہم کامیابی سے ہسکتا رہوں گے کچھ دیر سفر کرنے کے بعد بے ترتیب بنی عمارتیں نظر آنے لگی تھیں جو ڈھلوان پہاڑی پر بنی ہوئی تھیں اسی راستے میں آگے چل کر دو پیٹرول پمپ آئے جن میں سے ایک سے میں نے گاڑی میں فیول ڈالا اور ہم پھر آگے بڑھ گئے راستے میں ڈرائیونگ کے دوران میں اور جافری چاکلیٹ اور چمیں کھاتے رہے جو ہم نے پیٹرول پمپ پر واقع شاپ سے خریدے تھے جافری چاکلیٹ کھانے کے ساتھ ساتھ اپنے بیگ سے کاغذات نکال کر اس پر کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ جس فارمولے پر کام کر رہا ہے وہ ابھی ادھورا ہے اور وہ جلد از جلد اسے مکمل کرنا چاہتا ہے اور پھر جب واپس اپنے وطن پہنچے گا تو ایسے دوسرے فارمولوں پر بھی کام کرے گا۔

ہم جس سڑک پر سفر کر رہے تھے وہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جا رہی تھی اچانک پھر میرے فون کی بیل بجی دوسری طرف پھر جیڑ لوث تھی۔

”بزمِ تم سے ملنے کے لیے دلا پر موجود ہے۔“ جیڑ لوث نے بتایا وہ تمہارا منتظر ہے اس کا نام نور برلر ہے میری ویدر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”ہیلو..... گڈ..... تم وہاں موجود ہو..... جیڑ لوث نے مجھے بتایا کہ پلان مکمل ہو گیا ہے اور تمہیں بھی پسند آیا ہے اب جلد ہی ہم تم سے لندن میں ملیں گے تم میرے کلب آنا ہم ساتھ ڈرنک کریں گے میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا جیڑ لوث بھی تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔“ میری ویدر نے ہمیشہ کی طرح مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا تھا وہ ہمیشہ بغیر وقفے کے بولتا تھا اور فون جیڑ لوث کو دے دیتا تھا۔

”جب تم دلا پہنچ کر ملے مل لو تو پھر مجھے کال ضرور کرنا ہم مل کر ملے کریں گے کہ تمہاری لوکیشن کب ایک کی جائے۔“ جیڑ لوث نے کہا۔

میں سچائی جانتا چاہتا ہوں۔“

”اوکے سچ یہ ہے کہ بریڈ شاٹلی جنس کے لیے کام کرتا ہے اور وہ دیئے گئے مختلف مشن کی نگرانی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے اپنے ساتھ ملایا میں اس کی باس ہوں اور میری ویدر کے ساتھ مشاوری سے کام کرتی ہوں وہ ہماری ٹیم میں سب سے سنیئر ہے بریڈ شاٹلیہ کام اپنے کسی آدمی سے کروانا چاہتا تھا لیکن ہم نے تمہارا انتخاب کیا اور جب اسے پتہ چلا کہ دراصل تم جافری کے محافظ ہو تو اسے یہ بات پسند نہیں آئی پھر اسے پتہ چلا کہ دوسری شاٹلی جنس انجینئر بھی اس کام میں دلچسپی لے رہی ہیں تو اسے تشویش ہوئی ہم نے ابھی تک جافری کی اصلیت اسے نہیں بتائی تھی چنانچہ وہ ابھی صرف انتظار کا ٹھیکل ٹھیکل رہا ہے۔“

”تو تم بریڈ شاٹلی کو اس بارے میں کیا بتاؤ گی؟“

”ابھی ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

”دیکھو اس سے پہلے کہ وہ کوئی امتحانہ حرکت کرے اسے کال کر کے حقیقت بتا دو۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ جیڑ لوث نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔

”تم نے یہاں سے ہمارے باہر نکلنے کے لیے ٹرانسپورٹ کا کیا انتظام کیا ہے؟“

”آکس لینڈ میں شمال کی طرف یہاں کے دارالحکومت سیفا کروڈ میں ایک چھوٹا انرپورٹ ہے جہاں میں نے تمہاری پرواز کے لیے ایک چھوٹا جیٹ ہائر کیا ہے اگر سب کچھ پلان کے مطابق ہوا تو تم تین افراد جافری نیا قاتل اور تم تینوں اس میں واپس آؤ گے میں خود بھی جیٹ میں سفر کروں گی چنانچہ میں تم سے انرپورٹ پر ملوں گی اور تمہاری کیئر لیں کرواؤں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن میرا خیال ہے یہاں کی پولیس ہم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتی ہے اس کے بغیر وہ ہمیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ان کی فکر مت کرو یہ معاملہ ہم خود دیکھ لیں گے۔“

”اوکے گرےٹ۔“ میں نے کہا۔ ”اب مجھے اس نئے دلا کا ایڈریس دو۔“ میرے کہنے پر اس نے میرے موبائل پر ایڈریس بھیج دیا تھا اور مجھے لوکیشن بھی سمجھا دی تھی۔

”ٹھیک ہے ہم فوراً ہی روانہ ہو رہے ہیں راستے میں ایک جگہ فیول لینے کے لیے ریسٹ گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

”چیز لوٹ کیا کہہ رہی تھی؟“ جافری نے پوچھا تو میں نے صرف اتنا بتایا کہ اب ہم جرمن ملر سے ملنے والے ہیں۔“

کچھ دیر بعد پھر میرے فون کی کھنٹی بجی تھی اس بار کورٹش کی کال تھی میں نے فون ریسو کیا تو وہ تشویش آمیز لہجے میں بولی۔

”میرے والد چاہتے ہیں کہ تم خود کو پولیس کے حوالے کرو کیونکہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”جو روی اسپتال میں تھے ان میں سے ایک فرار ہو گیا ہے جو زیادہ زخمی نہیں تھا میرے والد کا خیال ہے کہ وہ تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا وہ چاہتے ہیں کہ تمہاری مدد کریں۔“

”تمہارے اطلاع دینے کا شکریہ لیکن اپنے والد سے کہو کہ میں اس موقع پر ان کی مدد نہیں لے سکتا۔“ میں نے کہا اور اسی وقت فون پر مجھے کورٹش کے والد کی آواز سنائی دی۔

”بے وقوفی مت کرو تم اور تمہارا دوست خطرے میں ہیں تم آئس لینڈ سے نہیں نکل سکتے میں نے تمہارا نام پاسپورٹ کنٹرول کو دے دیا ہے تمہیں خود کو پولیس کے حوالے کرنا ہوگا ہم تمہاری مدد کریں گے۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا میری طرف سے اپنی بیٹی کا شکریہ ادا کر دینا کہ اس نے میری بہت مدد کی ہے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مقامی پولیس روسی ایجنٹوں کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی ہے جو روسی اسپتال سے غائب ہوا تھا وہ یقیناً ہمارے تعاقب میں آئے گا وہ اپنے گھر جا کر اپنے زخموں کو نہیں جانے گا اگر اس کی جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کرتا پہلے اپنے زخموں سے انتقام لیتا میں نے سڑک پر نظر کی تو مجھے سمندر نظر آنے لگا اب ہم ساحل کے قریب ہی سفر کر رہے تھے اور کار میں لگا آہ تیار تھا کہ ہم بڑے روڈ سے زیادہ دور نہیں ہیں جافری ابھی تک لکھنے میں مصروف تھا میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا میری

نظر بس کبھی کبھی ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی گاڑیوں پر تھیں لیکن میں نے اب تک کوئی پولیس کی گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ جافری لکھنے میں اتنا مہمک تھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ اس کی انگلیوں کے درمیان پکھل کر بہہ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ تمام ایسے ذہین لوگ جب کام کرتے ہوں گے تو ان کی حالت ایسی ہونی ہوگی؟

کار میں لگتا لے کی ڈیجیٹل آواز نے مجھے ہدایت کی کہ میں مین روڈ کو چھوڑ دوں اور سائڈ میں بنی چھوٹی سڑک پر آگے بڑھوں یہ سڑک آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جا رہی تھی راستے میں کچھ مکان اور دکانیں آئی تھیں اور ہم ان سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتے گئے تھے کچھ آگے جا کر ہمیں آئس لینڈ کا واحد آتش فشاں ”ایل ٹیڈ“ نظر آنے لگا تھا جافری نے بھی ایک لمحے کو سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

”یوں لگتا ہے کہ جگہ غیر مہذب دور سے تعلق رکھتی ہے۔“ جافری نے کہا۔

”ہاں اب ہم اپنی منزل سے بس ایک میل کے فاصلے پر ہیں۔“ میں نے ڈیجیٹل نقشہ دیکھ کر بتایا ہم جتنی بلندی پر آگئے تھے کہ وہاں تک کوئی کوہ پیما یا چڑھ سکتا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اگر رات کے اندھیرے میں ہم پر حملہ کر دیا گیا تو میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا کیونکہ میرے پاس اتنی بلندی پر خود کو چھپانے کے لیے محفوظ مقام بھی موجود تھا اور وہ ماحول بھی کہ میں دور سے اوپر چڑھ کر آنے والے کو دیکھ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہم مطلوبہ ولا تک پہنچ گئے تھے۔ ملر ہمارا منتظر ہی تھا اس نے ضروری سوالات کے بعد مطمئن ہو کر ولا کی چابیاں میرے حوالے کر دی تھیں اس کے علاوہ میرے پوچھنے پر ایک بہترین قسم کی دوربین بھی مجھے دی تھی جس سے میں اطراف کا جائزہ لے سکتا تھا پھر اس نے اپنا بزنس کارڈ بھی دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو میں اسے فون کر سکتا ہوں۔

ملر کے جانے کے بعد ہم نے جوس پیارا اور کچھ بسکٹ کھائے پھر آرام کرنے لگے جافری خاصا فکر مند نظر آ رہا تھا کسی عام آدمی کے لیے یہ آسان بھی نہیں تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں بیٹھ کر اپنے قاتل کا انتظار کرے میں جانتا تھا کہ وہ اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔

AANCHALPK.COM

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں



ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

چاہت و محبت کے موضوع پر لکھی ایسی دلکش تقریر جو آپ کی دل کی دلیا میں بل فصل کر دے

معاصرے کے تخلیق حلق کی عکاسی کرتا فاخرہ گل کا ناول جو آپ کو بہت سی حقیقتیں آشکار کر دے گا

خاندانی اختلافات و محکموں کے پس منظر میں لکھا اقرارِ ضمیر کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک عیاں عطا کر دے

AANCHALNOVEL.COM

پہچنے والے کی صورت میں رجسٹریشن (021-35620771/2)

”تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری جان بچانے کے لیے اتنی جدوجہد کی۔“ جافری نے مجھ سے کہا۔
”یہ میری ذیولنی ہے جو میں نباہ رہا ہوں۔“
”لیکن میں اب تک تمہاری وجہ سے ہی زندہ ہوں۔“
جافری نے مزید کہا۔

”چلو یونہی سمجھ لو۔“ میں نے اپنے بیک سے دو لائف جیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ”لو یہ تم پہن لو۔“ میں نے ایک لائف جیکٹ جافری کی طرف بڑھائی۔

”یہ کہاں سے آئی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
”یہ میں نے ان روسیوں کی اتاری تھیں جنہیں پچھلے ولا میں زخمی کیا تھا۔“ میں نے کہا۔
”تمہارا بھی جواب نہیں ہے..... تمہارا دماغ خوب چلتا ہے۔“ جافری نے تعریف کی۔

”یہ ہماری ٹریننگ کا حصہ ہوتا ہے کہ جیسے بھی حالات ہوں ان سے فائدہ اٹھائیں اور انہیں اپنے حق میں موڑ لیں۔“ میں نے جواب دیا۔ جافری نے خاموشی سے جیکٹ پہن لی تھی جس میں میں نے اس کی مدد کی تھی پھر میں نے بھی جیکٹ پہن لی تھی اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا اور میں نے جان بوجھ کر لائٹس آن نہیں کی تھیں بادلوں سے چھن چھن کر کچھ روشنی آرہی تھی جس سے جھپٹے جیسا سماں تھا اسی وقت جافری کے فون کی بیل سنا دی اور میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف سے چیز لوٹ بول رہی تھی۔

”تم نے اپنا فون کیوں بند کیا ہوا ہے؟“ اس نے

پوچھا۔
”میں نہیں چاہتا تھا کہ جب تم کال کرو تو کوئی اسے ٹریس کر سکے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا ولا پر سب خیریت ہے؟“ جیمز رلوٹ نے پوچھا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا باہر لگے گاڑن کے ایک کونے میں جو تالاب کے قریب تھا روشنی کا تیز جھماکا ہوا جیسے کوئی چیز ہینسر لائٹوں سے ٹکرائی ہو۔

”میں تمہیں بعد میں فون کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا پتہ لگ گیا ہے ہمیں ٹریس کر لیا گیا ہے۔

میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا اور میں جافری

کو تیزی سے فرش پر گرادیا اس کے منہ سے ایک کراہ کی آواز نکلی وہ زور سے فرش سے ٹکرایا تھا۔

”تم کیا کر رہے ہو؟.....“ اس نے زور سے کہا۔
”گارڈن کی طرف سے روشنی نظر آئی ہے کوئی موٹن سینسر ٹھیکرایا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہوسکتا ہے کوئی کتا لمبی یا موٹری ہو۔“ جافری نے اوپر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تاکہ وہ گارڈن میں دیکھ سکے لیکن میں نے ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اسے لیٹے رہنے پر مجبور کیا۔

”خاموش لیٹے رہو سینسر کسی جھوٹے جانور سے نہیں چلتا یقیناً یہ کوئی انسان ہی ہے۔“ میں نے تنبیہ کی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارے دشمن نے ہمیں ٹریس کر لیا تھا لیکن وہ کون تھا یہ میں نہیں جانتا تھا اور اس نے یقیناً قاتل کو یہاں بھیج دیا تھا۔

”تم سامنے دیوار میں بنی الماری میں چھپ جاؤ اور اب تک چھپے رہنا جب تک کہ میں تمہیں باہر آنے کے لیے نہ کہوں۔“ میں نے جافری سے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ رہتا چاہتا ہوں۔“ جافری نے کہا۔

”نہیں تم الماری میں چھپ جاؤ۔“ میں نے کہا اور اپنا ریوالتور اس کی طرف بڑھا دی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم قاتل کو نظر آ جاؤ چھپ جاؤ اور جھٹکتے ہوئے جانا تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔“ میں نے کہا جافری نے میرے ہاتھ سے ریوالتور لے لیا اور جھٹکتے جھٹکتے الماری تک گیا پھر وہ الماری میں چھپ گیا تھا میں ریختے ہوئے اس کرسی تک گیا جس پر میرا بیگ ٹنکا ہوا تھا اس میں سے میں نے دوسرا ریوالتور نکال لیا تھا اور اسے اپنی جیلٹ میں لگا یا پھر میں ریختا ہوا بالکونی کے دروازے کی طرف بڑھا تھا اور آہستہ سے اسے کھول کر باہر بالکونی میں چلا گیا تھا رات کی سرد ہوا جسم میں سردی کی لہر دوڑا رہی تھی باہر خاموشی اور تاریکی کا راج تھا صرف دور بھاڑیوں کی ترانی میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی میں نے بالکونی سے احتیاط سے چھلانگ لگائی میں نے کوشش کی تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو جس میں میں کامیاب رہا تھا پھر مین گارڈن کی گھاس میں اوندھا لیٹ گیا تھا اور کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا کچھ ہی دیر

میں مجھے اپنے مغربی جانب درختوں میں ایک انسان کا ہیولانظر آیا تھا جو ولا کی جانب آ رہا تھا پھر میری دنی شیشے کے دروازے کے پاس آ کر وہ رک گیا تھا اس کے ہاتھ میں موجود ریوالتور کی ٹال کی لمبائی سے میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے ریوالتور میں سائیکلنسر لگا ہوا تھا اور وہ خاموشی قتل کرنے آیا تھا۔ اس کی جسامت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پولیس کی حراست سے فرار ہونے والا روی ہو سکتا ہے اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہونے لگا ابھر اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتا میں نے اس پر چھلانگ لگا دی وہ زمین پر گر گیا اور میں اس کے اوپر چڑھ گیا اب وہ خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا میری پوری کوشش تھی کہ اس کا ہتھیار چھین سکوں تاکہ وہ مجھے نشانہ نہ بناسکے ہم دونوں ایک ہی طرح کی جدوجہد کر رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ہم دونوں کو کسی ایک ہی انسٹرکشن نے تربیت دی ہے ہم دونوں پوری طاقت اور تیزی سے مقابلہ کر رہے تھے اس کے چہرے پر بالی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں بالکل دیے ہی جیسے فوج میں ٹریننگ کے دوران ہم اپنے چہرے پر بتاتے تھے میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے پر گرفت مضبوط کر لی اور اپنی ٹانگوں سے اسے سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا پھر اپنی انگلیوں سے اس کے گلے پر دباؤ ڈالنے لگا وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کی حرکت کمزور پڑتی جا رہی تھی اور پھر اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے کہ میں نے اسے مارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

”تمہاری ماں تمہارے لیے ایک خط چھوڑ گئی ہے۔“ اس نے کہا اور میرے ہاتھوں کی گرفت اس کے گلے پر ڈھیلی ہو گئی۔ میں آسانی سے زیر ہونے والا نہیں تھا لیکن اس شخص کے الفاظ نے مجھے مجبور کر دیا مجھے یوں لگا جیسی کسی نے ہزار وراثت کا کرٹ میرے جسم میں دوڑا دیا ہو۔ میری گرفت ڈھیلی ہوتے ہی اس کے زرخرے پر میری گرفت کا دباؤ کم ہوا اور اس نے گہری سانس لی۔

چند ہی لمحوں میں میں پہچان گیا تھا کہ وہ اسٹیفورڈ ہے یہ وہی آفیسر تھا جسے میں نے بہت عرصہ پہلے فوجی ملازمت کے دوران مارنے کی کوشش کی تھی اور ملازمت سے نکالا گیا تھا وہ جانتا تھا کہ میری ماں اسپتال میں موت اور

لوگ بھی ہوں جنہیں تمہارے جیسے احکامات دے کر یہاں بھیجا گیا ہو اور وہ ابھی راستے میں ہوں ہم تینوں..... تم..... میں اور جافری یہاں سے فرار ہو کر ایئر پورٹ جا میں گے جہاں ایک پرائیویٹ جیٹ ہمارا منتظر ہوگا جو ہمیں لندن لے جائے گا۔“

”تم جو بھی کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے لیکن میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ مجھے ہر حال میں جافری کو مل کرنا ہے۔“ اسٹیفورڈ نے کہا۔

”کیا تم بریڈشا کو جانتے ہو؟“ میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔ ”وہ ملٹری انٹیلی جنس میں کام کرتا ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

”اور کیا تم جیٹروٹ مل کو جانتے ہو؟“

”نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔“

”وہ بھی انٹیلی جنس میں ہے وہ بریڈشا کی باس ہے۔“

”نہیں میں اسے نہیں جانتا۔“

”وہ بریڈشا کے آپریٹرز پر کام کر داتی ہے میں اسے فون کرتا ہوں وہ بریڈشا سے بات کرے گی اور بریڈشا کو مجبور کرے گی کہ وہ تم سے بات کرے..... ٹھیک ہے؟“ میں نے کہا جس پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”بولو..... ٹھیک ہے؟“ میں نے پھر ریوڈور کی نال اس کی گردن میں چبھائی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں بریڈشا کا حکم مانوں گا۔“

”فون اندر ہے۔“ میں نے کہا پھر ہم دونوں دلا میں چلے گئے تھے اور میں اسے اسی کمرے میں لے گیا تھا۔ جہاں جافری چھپا ہوا تھا اور میرا ایک بھی وہیں تھا میں نے اسٹیفورڈ کو دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا۔

”اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھ لو۔“ میں نے غرا کر کہا اس نے تائید کی تھی اور میں نے جیٹروٹ کو نوٹ کرنے کے لیے جافری کا فون اٹھایا پھر جب میں نمبر ملا ہی رہا تھا کوئی سیاہ لباس میں ملبوس مجھ پر حملہ آور ہوا تھا مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا وہ ایکس رنگ تھی وہ بہت تیزی سے اندر آئی تھی اس نے کالا ماسک چہرے پر لگایا ہوا تھا اس کے ہاتھوں میں

زندگی کی کشمکش میں ہے لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا تھا اور میں اپنی ماں سے نہیں مل سکا تھا میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ خط کے بارے میں سچ بول رہا ہے وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے بھی ایسا جھوٹ بول سکتا تھا۔

”بتاؤ..... مجھے بتاؤ وہ خط کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ محفوظ ہے..... اگر تم مجھے باحفاظت لندن پہنچے دو گے تب میں تمہیں وہ خط دوں گا۔“ اس نے کہا۔

”کہاں ہے؟“ میں نے پھر کڑک کر پوچھا۔

”میں لندن جا کر ہی خط دوں گا وہ محفوظ ہے۔“ اس نے پھر وہی جواب دیا۔

”کیا تم اکیلے ہو؟“

”ہاں۔“

”تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

”میں نہیں جانتا وہ دہشت گرد ہاں کی مشہور شخصیت ہے جو بیٹی بچانے کے لیے مشہور ہے۔“

”اسے میری لوکیشن کا کیسے پتہ چلا؟“

”مجھے نہیں معلوم مجھے تمہاری لوکیشن K106 پر ملی تھی۔“

”تمہارے پاس K106 ہے؟“

”ہاں تمہارے سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں۔“

”تمہیں کیا احکامات دیئے گئے ہیں؟“ میں نے اپنے ریوڈور کی نال اس کے گلے میں چبھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایک شخص جافری بن کو مارتا ہے اور تمہیں بھی اگر تم مداخلت کرو۔“

”اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟“ اسٹیفورڈ نے مجھ سے پوچھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خط حاصل کرنے کے لیے اسے زندہ رکھنا ہوگا اس کے علاوہ جیٹروٹ بھی اسے زندہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

”مجھے بتاؤ جافری کہاں ہے میں اسے ماروں گا اور میرا کام ختم ہو جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر ہم لندن جائیں گے اور میں تمہیں خط دے دوں گا..... ڈیل؟“

”نہیں..... جافری زندہ رہے گا..... وہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے ضروری ہے..... ہمیں اس کے منصوبے پر عمل کرنا ہوگا ممکن ہے تمہاری طرح اور

میری طرف دیکھا تھا ہم اس وقت دلا کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”میں تمہیں اتر پورٹ تک لفٹ دوں گا تمہارا پاسپورٹ پولیس کے پاس ہے اتر پورٹ پر نہیں دوسرا پاسپورٹ مل جائے گا جس کا انتظام چیئر لوٹ نے کیا ہے۔“ بریڈ شائے کہا۔ ”یہاں بینس اور ٹریڈ ویل دلا میں صفائی کا کام کروائیں گے ہم کوئی نشان چھوڑنا نہیں چاہتے۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن تم نے کار میں مجھ پر ریوالور کیوں نکالا تھا.....“ میں نے پوچھا۔

”میں اب تک نہیں سمجھ پایا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے جب تم نے ”غدار“ کا لفظ استعمال کیا تو میں نے سوچا کہ معاملات بگڑ گئے ہیں جنہیں درست کرنا ہوگا لیکن میرا خیال غلط تھا۔“

ٹریڈ ویل نے ہمارے بیگوں سے تمام گنیں اور ریوالور لے لیے جو ہم نے لوگوں سے چھپنے تھے اور وہ چیزیں ان لوگوں کے حوالے کر دیں جو سفارتخانے سے آئے تھے ان میں دو مرد اور ایک عورت شامل تھے انہوں نے مجھے نیا پاسپورٹ بھی دیا بریڈ ویل نے جافری کا بیگ بھی لے لیا تھا جس میں اس کے سارے کاغذات تھے وہ اس نے ایک اور بڑے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

”اب جافری تو ہمارے ساتھ نہیں لیکن اس کے کاغذات ہیں جو خاصے اہم ہیں۔“ بریڈ شائے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا میرا جی چاہا کہ میں اس کے منہ پر گھونٹہ ماروں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

ہم سب اسٹیفورڈ اور جافری کی لاشوں کے ساتھ ایک ہی دین میں ایئر پورٹ پہنچے تھے اور وہاں سے ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے میں اپنا بیگ لے کر ان سے جدا ہو گیا تھا اور میں نے انہیں الوداع بھی نہیں کہا تھا مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ میں نے موقع ملنے کے باوجود ایک رنگ کوٹل نہیں کیا تھا میں کار میں اسے مار سکتا تھا جب وہ بے ہوش تھی یا کورٹش کی لالچ میں بھی میں اسے انجام تک پہنچا سکتا تھا لیکن میں اس کے ذریعے اس غدار تک پہنچنا چاہتا تھا جس کا ذکر چیئر لوٹ نے کیا تھا۔

گن تھی اور اس نے میرا نشانہ لیا ہوا تھا اس نے فائر کیا تھا اور میں پیچھے کی طرف گر گیا تھا میرا سر زور سے فرش سے ٹکرایا تھا میں بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ میں اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے دوسرے فائر کی آواز سنی تھی لیکن وہ مجھ پر نہیں کیا گیا تھا اور میں نے اسٹیفورڈ کے جسم کے فرش پر گرنے کی آواز سنی تھی میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن گولی میرے دل کے قریب لگی تھی میں اٹھنے سے قاصر تھا مجھے منظر دھندلا نظر آ رہا تھا لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ ایکس رنگ میرے پاس کھڑی تھی اس کے چہرے پر اطمینان تھا لیکن مجھے زندہ دیکھ کر حیران بھی تھی اس نے کچھ کہا تھا جسے میں سمجھ نہیں سکا۔

پھر دوسرے ہی لمحے کمرے میں ایکس رنگ کے پیچھے ایک سایہ نمودار ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا وہ جافری تھا وہ گن فائر کی آواز سن کر الماری سے نکل آیا تھا اور اب ایکس رنگ کو نشانہ بنائے ہوئے تھا میں نے چننا چاہا کہ وہ فائر کر دے لیکن میری آواز نہیں نکلی میں نے اٹھ کر اپنے ریوالور سے فائر کرنا چاہتا تھا لیکن میں یہ سب نہیں کر سکا ایکس رنگ نے پھر ایک بار بھرتی کا مظاہرہ کیا تھا میں نہیں جانتا کہ اس نے جافری کی آہٹ سنی تھی یا اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا لیکن وہ تیزی سے چلتی تھی جافری اس پر فائر کر سکتا تھا لیکن ایکسی رنگ نے پہلے فائر کر دیا تھا گولی اس کے سر میں لگی تھی اور وہ گر گیا تھا کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی اس وقت دروازہ زور سے کھٹنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بریڈ شائے کی آواز بھی آئی تھی ایکس رنگ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

براٹیویٹ جیٹ میں ہم سے ملنے چیئر لوٹ نہیں آئی تھی مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی ہم تین افراد تھے جن میں سے دو سے ملنے کے لیے وہ بے چین تھی بریڈ شائے ٹریڈ ویل اور بینس صرف میں ہی تھا شاید جس سے ملنے کی اسے اب خواہش نہیں تھی۔

گولی میرے دل کو چھوتی گزر گئی تھی ایکس رنگ غائب ہو چکی تھی اس کا کسی کو پتہ نہیں تھا بریڈ شائے فون پر کافی دیر تک چیئر لوٹ سے بات کرتا رہا تھا اس نے کئی بار

لندن پہنچ کر مجھے ایک خوشگوار حیرانی ہوئی تھی ایئر پورٹ پر چیز لوٹ مجھے ریسو کرنے کے لیے موجود تھی اور وہ اپنے ساتھ ہی مجھے اپنے فلیٹ پر لے گئی تھی جہاں اس نے میرے لیے نئے لباس کا انتظام کر رکھا تھا میں نے فریش ہو کر لباس تبدیل کیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ میری ویدر اپنے کلب میں ہمارا منتظر ہے اور مجھ سے ملنے کا انتظار کر رہا ہے۔

میری ویدر بہت اچھے موڈ میں مجھ سے ملا تھا اور اس نے مشن کی نئی صورت حال پر بات کی تھی، پھر اس نے اپنی آرگنائزیشن میں مجھے مستقل ملازمت کی پیش کش کی تھی اور اصل مقصد کی طرف آیا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ ہمیں اندرونی طور پر ایک عدار کا سامنا ہے جو ہماری خبریں لیک کرتا ہے اور ہمارے خلاف کام کرتا ہے جافری کی موت بھی اس کا ثبوت ہے۔ باقی چیز لوٹ تمہیں آگے سمجھا دے گی۔“ میری ویدر نے کہا۔ ”تم اس شخص کو جانتے ہو تم اس وقت ہی اس شخص سے ملے تھے جب تم مجھ سے پہلی بار ملے تھے۔“ چیز لوٹ نے کہا لیکن اس نے اس شخص کا نام نہیں لیا تھا۔

”اس دن وہ کمرے سے جانے والا پہلا شخص تھا۔“ چیز لوٹ نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ وہ وہ مجسٹر تھا جس کا تعلق سفارت خانے سے تھا اور اسٹیفورڈ نے اسے سیٹی بیجانے والا کہہ کر مشن کیا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کی سیٹی بیجانے کی عادت ہے اس نے میرے سامنے بھی سیٹی بجائی تھی پھر چیز لوٹ نے مجھے ایک منصوبہ سمجھایا تھا جس پر میں نے اسی رات عمل کیا تھا اس کے لیے مجھے ایک کلب میں واقع سوئمنگ پول کا سامان پہنچانا تھا اور میں نے ڈیوری بوائے کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

میں پچھلے دروازے سے کلب میں داخل ہوا تھا گاڑی نے میرا پولیٹارم اور میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈبے دیکھے تھے اور مجھے اندر جانے دیا تھا مجھے عمارت کے اندر کی معلومات چیز لوٹ نے فراہم کر دی تھیں جو اس نے چھ مہینے پہلے ہی جمع کی تھیں میں آسانی سے سوئمنگ پول تک پہنچ گیا تھا کلب میں خاموشی تھی اس وقت سوئمنگ پول میں صرف دو افراد تھے میں اپنے ڈبے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر

چھپا دیے میں نے اپنی بیس بال کی کیپ اپنے سر پر ایسے پہنی ہوئی تھی جس سے میرا چہرہ چھپ گیا تھا پھر میں کپڑے بدلنے کے کمرے میں جا کر انتظار کرنے لگا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ کمرے میں آیا تھا اس نے چہرے پر تولیہ ڈالا ہوا تھا اس کے جسم سے پانی بہہ رہا تھا اور فرش پر اس کے پیروں سے نشان پڑتے جا رہے تھے اس نے میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا وہ پتھر کی بیٹنج پر بیٹھ گیا تھا اور تولیہ سے اپنے ہاتھ اور پاؤں خشک کرنا شروع کر دیے میں نے اپنی جیب سے تیار شدہ سرخ نکالی اور اسے اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے اس کی طرف بڑھا اس نے اب بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا اس نے اپنا ایک پاؤں سکھانے کے لیے اوپر اٹھایا اور میں نے اس کا اندھا پکڑ کر اسے پیچھے کی طرف کھینچا پھر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ میں نے اس کا پاؤں پکڑ کر اس کی ایڑی میں انجکشن لگا دیا ہر اس کے جسم میں داخل ہو گیا میں نے اسے فرش پر لٹا دیا اور اس کا پاؤں چھوڑ دیا وہ کراہ رہا تھا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

”تم.....“ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ ”تم نے یہ کیا کیا؟“ مجھے اسپتال لے چلو..... جلدی کرو..... ورنہ میں مری جاؤں گا۔“ اس نے کہا آہستہ آہستہ اس کی آواز اور حرکت کمزور ہوتی جا رہی تھی اس کا بلڈ پریشر بھی یقیناً کم ہو رہا تھا اور اس کا دل جلد بند ہونے والا تھا میں کچھ دیر دیکھتا رہا کچھ ہی دیر میں وہ بے حس ہو گیا تھا۔

اس کی موت کا یقین کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا دوسرا شخص ابھی تک سوئمنگ پول میں نہا رہا تھا اس نے کچھ نہیں سنا تھا اس کے کان اور چہرہ پانی میں تھے میں کلب کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا جہاں میری نئی ملازمت میرا انتظار کر رہی تھی۔

ختم شد



ہیروکون

امین صدر الدین بھایانی

دنیا کے ہنگاموں میں ہیر و اور بریکنگ نیوز کا حصہ بننے کے
شوقین نوجوان کا قضیہ۔

امین صدر الدین بھایانی کے قلم سے ایک دلچسپ شاہ کار کہانی

جسے پڑھ کر آپ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں گے

دروازے کے باہر دو تین بار موٹر سائیکل کا ہارن بجایا۔
اُسے سنتے ہی کھلی چھت والے چھوٹے سے صحن میں بچھے
تخت پر بیٹھ کر ناشتہ کرتے، بہزاد نے جلدی جلدی چائے کے
مکھنٹ بھرنے شروع کر دیئے۔ چنگیر میں سے پراٹھے کا
آخری ٹکڑا اٹھا کر پلیٹ میں پڑے رات کے سالن کو اچھی
طرح سے صاف کر کے منہ میں ٹھونسا اور پیالی میں پچی کچھی
چائے منہ میں انڈیل کر تیز تیز چاہتے ہوئے تیزی سے
دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔
پھر کچھ خیال آنے پر دوبارہ پلٹا اور تخت پر ہی بیٹھی اماں
کو خدا حافظ کہا۔ اُن کے ساتھ ہی کھڑی اپنی بیوی کی طرف
مسکرا کر دیکھا ہی تھا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ ایک
بار پھر باہر گلی میں سے ہارن کی آواز سنائی دی اور وہ سڑک کے باہر
کی طرف دوڑ پڑا۔
گھر کے دروازے پر ہی سرفراز اپنی نئی نویلی سرخ مٹھوم
مٹھوم آوازیں نکالتی ہنڈا اے پر سوار دروازے ہی کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ بہزاد فوراً ہی موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا اور اُس
کے ساتھ ہی سرفراز نے گلچ کوڈا کر کے گھر لگا دیا۔
”سرفراز بھائی، معافی چاہتا ہوں، آج پھر ذرا سی دیر
ہو گئی۔ وہ بس میں ناشتہ کر رہا تھا۔“ بہزاد شرمندہ ہوتا ہوا
بولتا۔

ہو۔

”ارے نہیں بھئی، ویسے بھی ہم ہمیشہ کی طرح وقت
ریڈیو پاکستان کی عمارت سے آگے ٹائر مارکیٹ والی گلی



میں تو بہنراڈ موٹر سائیکل سے اتر بھی چکا تھا اور وہ تیزی سے
جھوم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لمبے بھر کو وہ مڑا اور اُس نے
چلاتے ہوئے کہا۔ ”سرفراز بھائی، آپ کو دیر ہو جائے گی،
آپ چلے جائیں۔ میں خود ہی دفتر پہنچ جاؤں گا“ اتنا کہہ کر
وہ تیزی سے دوڑ کر بھیڑ کو چیرتا ہوا جھوم میں غائب ہو گیا۔

کچھ دیر وہ وہاں اسی طرح سے گونگوں کی کیفیت میں
کھڑا رہا۔ پھر موٹر سائیکل کو کک لگا کر اسٹارٹ کیا اور جھوم کی
جانب دیکھتے ہوئے افسوس کے ساتھ اپنا سر ہلایا اور آگے
بڑھ گیا۔ اُس کا دفتر آئی آئی چند ریگر روڈ پر کاشن آکھیچ
بلڈنگ میں تھا۔ وہ روزانہ بہنراڈ کو اُس کے دفتر جو چند قدم
کے فاصلے ہی پر محمدی ہاؤس میں تھا، تک لفٹ دیا کرتا۔

سے ہوتی ہوئی موٹر سائیکل اُردو بازار سے نکل کر رابنس روڈ
اور پھر کورٹ روڈ پر داخل ہوئی۔ اچانک ایک کونے پر لگے
جھوم کو دیکھ کر بہنراڈ چونک اٹھا۔ کسی اندرونی خیال کے تحت
اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے
سرفراز کو کندھوں کے ہلاتے ہوئے پاؤں بلند کیا۔

”رُک جائیں، سرفراز بھائی، رُکیں، رُکیں.....!!!“
اس اچانک افتاد پر سرفراز بوکھلا گیا اور موٹر سائیکل لہر اسی
گئی۔ تیزی کے ساتھ قابو کیا اور فٹ پاتھ کے ساتھ روک
دی۔

”اوہ بھائی..... کیا ہوا..... سب ٹھیک تو ہے نا؟“
سرفراز نے سر سمٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھا لیکن اتنی دیر

دفتر پہنچ کر وہ اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ شام پانچ بجے دفتر کی عمارت سے باہر آیا تو لوگوں اور ٹریفک کا ایک اڑوہام سڑک پر موجود تھا۔ لوگ باگ دفاتروں سے نکل نکل کر پیدل، سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، اسکوٹروں، کاروں، بسوں اور ویکلوں میں سوار ہو کر اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ لیکن اُس وقت گھر سرفراز کی منزل نہ تھا۔ آئی آئی چند دیگر روڈ سے سرفراز نے اپنی موٹر سائیکل کا رخ جوڑیا بازار کی طرف موڑ دیا۔ نیو چالی سے ہوتا ہوا سٹی کورٹ کی عمارت کے فوراً بعد دائیں والی گلی میں مڑا اور پھر دو ایک گلیوں کے موڑ مڑ کر ایک بڑی سی گواہم نہادکان پتا کرکڑ کا جس کی پیشانی پر لگے بڑے سے بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

محمد صدیق اینڈ سنز (آڑھتیان)

گندم، چاول، مکئی، والیس اور دیگر متفرق اجناس

رام بھارتی اسٹریٹ، جوڑیا بازار

کراچی۔ ۴۰۰۰۰

دروازے کے عین سامنے اُس نے اپنی موٹر سائیکل کو لاک کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ سرفراز یہاں عرصہ پانچ سال سے جڑوقی اکاونٹنٹ کے طور پر روزانہ شام چھ سے رات نو بجے تک کام کرتا تھا۔ رات نو بجے جب وہ وہاں سے نکلتا تو اُس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ سر بھی کانی بھاری ہو رہا تھا۔ حالانکہ دفتر میں اس نے پچھلے تین گھنٹوں میں دو بار چائے بھی پی تھی لیکن شاید یہ دن بھر کی ذہنی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا۔ گھر کے سارے راستے اُس کے ذہن میں بس بیوی کے ہاتھوں کا بنالذیہ کھانا ہی گھوم رہا تھا۔ سارے دن کی جان تو زحمت کے بعد جب وہ رات تقریباً دس بجے گھر پہنچتا تو اُس کے تینوں بچے تو علی الصبح اسکول جانے کے لئے کافی دیر پہلے ہی سو چکے ہوتے۔ اُس کی بیوی ثمنہ گرما گرم کھانا

تیار کر کے اُس کا انتظار کیا کرتی۔ حالانکہ گھر میں ڈھینگ ٹیبل بھی تھی لیکن اُس کی عادت اور پسند کے عین مطابق زمین پر دسترخوان بچھا ہوا ہوتا جس پر لٹی پالٹی مار کردنوں میاں بیوی کھانا کھانے کے ساتھ خوب مزے لے لے کر دن بھر کی باتیں کرتے۔ فارغ ہو کر یا تو ٹی وی کے سامنے جا بیٹھتا، پھر کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو جاتا۔ اس دوران ثمنہ اپنے اور اُس کے لئے بھاپ اڑاتی چائے گک میں لے آتی۔ اگر وہ کتاب پڑھ رہا ہوتا تو وہ بھی کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی وگرنہ دونوں ٹی وی دیکھنے لگتے۔

گھر پہنچ کر اُس نے گھڑی دیکھی تو کوئی پونے دس بج رہے تھے۔ موٹر سائیکل کو گھر کے آگے نصب آہنی دروازے کے پاس کھڑا کیا اور انکیشن میں لگے چابیوں کے چمچے کو نکال کر اُس میں سے ایک چابی منتخب کی اور آہنی گیٹ سے متصل ایک دوسرے چھوٹے آہنی دروازے پر لگے دونوں اطرف سے کھلنے والے تالے میں ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ موٹر سائیکل اسٹینڈ سے اتار کر ہاتھوں سے اُس کے پینڈل کو تھام کر آہستگی سے اندر داخل کر کے صحن کے کنارے لگی بیلوں کے ساتھ دوبارہ اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا۔ گھر کے مرکزی دروازے کو کھلا پا کر وہ کچھ حیرت میں پڑ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ دلہیز پار کرتے ہی دائیں جانب ہی سادگی سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا جس پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھک گیا۔ سامنے صوفے پر بہزادی اماں اور بیوی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کے چہروں سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ سامنے والے چھوٹے صوفے پر اُس کی بیوی بھی بیٹھی نظر آئی۔ ”السلام علیکم“ سرفراز نے انہیں سلام کرتے ہوئے اپنی جانب متوجہ کیا۔ بہزادی اماں اور بیوی نے چونک کر سر گھمایا اور جیسے ہی اُن کی نظریں سرفراز پر پڑیں وہ دونوں میکاکی انداز میں صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اُس کی طرف ہکیں۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرہ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشانی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فونو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فونو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ اک کے ذریعے ارسال کیجیے۔
☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔
☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7 فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

”ہائے بیٹا سرفراز.....! اب تو تم ہی بہنرا کو بچا سکتے ہو“ بہنرا کی اماں نے سرفراز کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

سرفراز حیران تھا کسا خرما جرا کیا ہے۔ وہ کبھی بہنرا کی اماں کو دیکھتا تو کبھی اپنی بیوی کے چہرے کو دیکھتا لیکن جب کوئی وضاحت نہ ملی تو حیرت زدہ سی آواز میں بولا۔

”آ خر کوئی مجھے کچھ بتائے بھی تو ہوا کیا ہے؟“ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہنا چکا ایک اندیشہ ساس کے ذہن میں لہرایا۔ ”اماں.....! خدا خواستہ کہیں بہنرا کسی حادثے کا تو شکار نہیں ہو گیا؟“

”نہیں سرفراز بیٹا.....! اُسے تو پولیس نے پکڑ رکھا ہے.....!“ بہنرا کی اماں روہا سی ہو کر پولیس۔

”کیا؟.....!، بہنرا کو پولیس پکڑ کے لے گئی ہے؟.....! لیکن یہ کیسے ہو گیا، آ خرباٹ کیا ہوئی جو اُسے پولیس پکڑ کر لے گئی؟.....!“ سرفراز کو جیسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ”مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ بس شام سات بجے اُس کا فون آیا تھا کہ اُسے تھانے میں پولیس نے پکڑ کر بیٹھا رکھا ہے اور وہ کہہ رہا تھا کہ کسی طرح سے بھی سرفراز بھائی کو وہاں بھیج دیں“ بہنرا کی اماں کی آواز میں پریشانی اور دکھ کی آمیزش تھی۔

”تو آپ نے میرے موبائل پر اُسی وقت فون کیوں نہیں کر دیا۔ میں فوراً تھانے چلا جاتا۔“ سرفراز نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم اُس وقت اپنے پارٹ ٹائم والے دفتر میں ہوتے ہو۔ لہذا میری ہمت نہ ہوئی کہ میں وہاں تمہیں فون کر کے پریشان کرتی۔ نو بجے سے یہیں آ کر بیٹھ گئی تھی کہ تم جب آؤ گے تو تم نے خود درخواست کروں گی کہ تم بہنرا کو تھانے سے چھڑاؤ۔“

شدت غم سے اماں کی آواز پھنی جاری تھی۔

”ارے نہیں اماں.....!، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ بہزاد میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں ابھی جا کر اُسے تھانے سے چھڑا کر لے آتا ہوں۔ کونسا تھانہ بتایا تھا آپ نے؟“

سرفراز نے اپنی بیوی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور سرگوشی میں کچھ کہا۔ وہ فوراً اندر گئی اور جلد ہی واپس آ گئی۔ اُس نے ایک لفافہ ساسر فراز کو پکڑا یا جو اُس نے جلدی سے اپنے کرتے کی بغلی جب میں رکھ لیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنی موٹر سائیکل پر سوار تھانے کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ جس برق رفتاری سے اُس کی موٹر سائیکل اڑی جا رہی تھی اُسی رفتار سے سوچیں اُس کے ذہنی انتشار میں اضافہ کرتی چلی جا رہی تھیں۔ بہزاد کو وہ بچپن سے جانتا تھا اور اُسی کے سامنے ہی تو پہل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصہ قبل تو اُس کی شادی ہوئی تھی۔ محلے کے شریف لڑکوں میں اُس کا شمار ہوتا تھا۔ کبھی کسی ایسے معاملے میں ملوث نہ ہوا تھا کہ جسے قابلِ دست اندازی پولیس قرار دیا جاسکتا۔ تو پھر ایسی کیا بات ہو گئی کہ اُسے پولیس نے پکڑ رکھا ہے؟ پھر اُسے سرفراز کی وہ بات یاد آئی جو اسے سخت ناپسند تھی۔

بہزاد کو ہیر و بجنے کو بہت شوق تھا.....!!!۔

فلمی ہیر و نہیں.....!، اصلی تے وڈا ہیر و.....!!!۔

بہزاد ہمیشہ ہی اس کوشش میں رہتا کہ کوئی ایسا کام کر گزرے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں ہیر و بن جائے۔ ملک بھر کے اخبارات، نیوز چینلوں میں اُس کے کارنامے کی دھوم مچ جائے۔ اُسے ٹی وی کے مارننگ اور ٹاک شو میں مدعو کیا جائے اور وہ ملک بھر میں ایک عوامی اور مسلمبرائی شخصیت بن کر ابھرے۔ اُس پر انعام و اکرام کی برسات ہونے لگے اور کوئی بڑا عہدہ مل جائے تو بس پھر اُس کے بعد تو اُس کی پانچوں انگلیاں کھچی اور سر کڑا ہی میں ہو۔ اُس کے جنون کو ہمیز کرنے میں نیوز چینلوں کے رپورٹروں اور کمرہ نیووں

نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب وہ دیکھتا کہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں یہ رپورٹر اور کمرہ نیوئیں بجلی کی رفتار سے جائے وقوع پر آن موجود ہوتی ہیں۔ پھر اُس واقعے میں شامل افراد چند ہی لمحوں میں عوام الناس کے جانے پہچانے چہرے ٹھہرتے ہیں۔ اگر واقعے میں شامل کوئی شخص ذرا سی بھی غیر معمولی ہمت و جرات کا مظاہرہ کر جائے تو بس پھر تو ان نیوز چینل والوں کی جیسے بن آتی ہے۔ وہ بریکنگ نیوز میں سب سے پہلے مذکورہ خبر کو اپنے ناظرین تک پہنچانے کا واڈا بلا چا کر اُس کا سہرا اپنے سر باندھ کر اتنا اچھلاتے ہیں کہ بس اللہ کی پناہ۔ پھر سارے ملک کے مارننگ اور ٹاک شو کے اینکرز اُسے اپنے پروگرام میں بلا کر سب سے پہلے انٹرویو نشر کرنے کا تمغہ اپنے سینے پر سجانے کے لئے بے تاب و بے چین نظر آتے ہیں۔

ابھی چند ہفتوں قبل ہی تو بہزاد گھر سے دفتر جاتے ہوئے اُسے بتا رہا تھا کہ گذشتہ روز اُس کے دفتر کی عمارت میں جب ایک نامعلوم فون پر یہ اطلاع دی گئی تھی کہ عمارت میں ایک بہت بڑی طاقت کا بم نصب ہے جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے تو بس جیسے ملی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ہو۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ عمارت میں نصب اس ٹھہرے بم کو تلاش کر لے تو بیٹھے بٹھائے ہی ہیر و بن جائے گا۔ ملک بھر کے اخبارات، نیوز چینلوں، مارننگ و ٹاک شو پر اُسے مدعو کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اتنے بڑے کارنامے کو سرانجام دینے کے اعتراف میں اُسے حکومت کی جانب سے تمغہ جرات سے بھی نوازا دیا جائے۔ اُس خیال کے ماتھے پر ہی اس نے چشمِ تصور میں یہ دیکھنا بھی شروع کر دیا کہ وہ ایوانِ صدر اسلام آباد کی ایک بڑی ہی عالی شان اور پُر وقار تقریب میں مدعو ہے۔ اُس کا نام پکارا جا رہا ہے اور وہ اپنی نشست سے اٹھ کر سینہ تانے، بڑے ہی وقار، اعتماد اور رعب و دبدبے کے ساتھ چلتا ہوا صدر پاکستان کے پاس جاتا ہے اور اپنے سینے

پچھلے

ماہنامہ

کچی

ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول
ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ
گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے
جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور
صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

ماہنامہ پچھلے

جاہت و محبت کے موضوع پر لکھی ایسی دلکش تحریر
جو آپ کی دل کی دنیا میں جلیں قل کر دے

ماہنامہ پچھلے

معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا ناغہ گل کا ناول
جو آپ پر بہت سی حقیقتیں آشکار کر دے گا

ماہنامہ پچھلے

خاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا اقر اصغر کا
بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک خارج عطا کر دے

AANCHALNOVEL.COM

پچھلے ملنے کی صورت میں رجسٹرڈ آفیس (021-35620771/2)

پر تمغہ لگوار ہا ہے۔ وہ تو اُس نامراد ہم ڈسپوزل اسکوڈ کے
پکتان کا خانہ خراب ہو، جس نے اُسے عمارت کی دوسری
منزل پر ادھر ادھر تاکتے جھانکتے دیکھ لیا اور اپنے پاس بلا کر
بڑی ہی کڑک آواز میں دریافت کیا۔ ”اے کا کا..... توں
کونزوں ایں، اتھنے کیس کروا پیاں ایں، تینوں ملوم صیں ایں
عمارت دے دوج وڈا تے خطرناک بمب لگا ہویا ایں“
”جی جی.....!، اسی لیے تو جناب.....! میں
یہاں ٹھہر گیا ہوں کہ بم کی تلاش میں آپ کی مدد کر
سکوں.....!!!“

”اے..... توں نے بھلا کیا ہماری مدد کرنی ہے
..... توں کوئی سپر مین ہے۔ اے کا کا..... توں نے کیا
شہری دفاع کا کورس شورش کر رکھا ہے؟“ اور جیسے ہی اُس
نے یہ کہا کہ اس نے تو کبھی محکمہ شہری دفاع کی شکل تک نہیں
دیکھی۔ پکتان صاحب نے اُسے ایک پولیس کے سنتری
کے حوالے کرتے ہوئے یہ تاکید کی کہ اسے عمارت سے
باہر لے جا کر لگائی گئی خطرے کی نشان دہی کرتی پٹیوں سے لگا
باہر نکل دیا جائے۔ بہزاد کوئی چار گھنٹے تک اُن پٹیوں سے لگا
اخباری نمائندوں اور ٹی وی چینلوں کے جانے پہچانے
رپورٹروں اور کیرامینوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا
رہا جو خطرے والی پٹیوں کی دوسری طرف پکتان صاحب
اور ہم ڈسپوزل اسکوڈ کے ہر چھوٹے بڑے اہلکار کے ساتھ
ساتھ وہاں موجود معمولی سے معمولی پولیس سپاہی کا دھڑا دھڑ
انٹرو لیکے چلے جا رہے تھے۔ یقیناً وہ انٹرویوز متعلقہ نیوز
چینلوں پر لائیو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کیے جا رہے
ہوں گے۔ کوئی چار گھنٹوں کے لگ بھگ یہ ڈرامہ جاری رہا
اور آخر کار پکتان صاحب نے با آواز بلند یہ اعلان کر دیا کہ
”بمب“ کی اطلاع جھوٹی ثابت ہوئی ہے اور انہوں نے
بڑی شان بے نیازی کے ساتھ عمارت کو عوام الناس کے
لئے خطرے سے پاک قرار دے دیا۔ بقول بہزاد اُسے جتنی

بھی بدعائیں اور گالیاں یاد تھیں، وہ اُس نے کپتان صاحب کو بھی بھر بھر کر دے ڈالیں۔ ارے بھلا کوئی اُس سے پوچھے کہ ہم تو انہیں کوئی ملا نہیں۔ اگر وہ اُس سے تھوڑا سا تعاون ہی کر لیتا اور عمارت سے باہر نہ نکالتا تو اگلے روز کے سارے قومی اخبارات اور نیوز چینلوں پر اُسے ایک باہمت و بہادر نوجوان کے طور پر پیش کیا جا رہا ہوتا جو کہ اُس قدر خوفناک بم کی دھمکی کو بھی خاطر میں نہ لایا اور اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے عمارت میں بم تلاش کرتا رہا۔

”تو کیا بہزاد پھر ویسی ہی کوئی حرکت کر بیٹھا جواب کی بار اُسے پولیس والے دھر کے تھانے ہی لے گئے؟“ سرفراز نے مسلسل آتی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے خود سے ہی سوال کیا۔ لیکن اُس کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا اور وہ اپنے اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے جلد از جلد تھانے پہنچ جانا چاہتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اُس کی موٹر سائیکل نخوست پھیلاتے ہوئے زرد بلبوں کی روشنی میں نہائی تھانے کی پیلے رنگ والی عمارت کے بڑے سے نیلے آہنی دروازے کے سامنے آ رہی۔ دروازہ بند ہونے کے سبب اُس نے اپنی موٹر سائیکل کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور آہنی دروازے کے چھوٹے سے پھانک پر کھڑے سپاہی کو بتایا کہ اُس کے محلے کا ایک لڑکا تھانے میں بند ہے۔ سپاہی نے کپڑے جانے والے کا حدود وار بعد دریافت کیا۔ سرفراز کے بتائے گئے محلے پر اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اُس نے اُسے تھانہ محرر کے کمرے تک جانے کا راستہ بتا دیا۔ سرفراز جیسے ہی محرر کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے سامنے ہی ایک لمبی سی بیچ پر بہزاد بیٹھا نظر آیا۔ اُس کے چہرے کی رنگت اڑٹی ہوئی، بال بُدی طرح سے بکھرے ہوئے، کپڑے بے ترتیب اور جوتے دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ سرفراز کو دیکھ کر اُس کی مایوس آنکھوں میں امید

کی چمک لہرائی۔ سرفراز سیدھا محرر کی میز پر پہنچا جہاں ایک دبلا پتلا لمبا شخص سر جھکائے دو سفید کاغذوں کے بیچ نیلے رنگ کا کاربن پیپر اڑے، بال پن کو خوب خوب دبا دیا کر اُردو میں کچھ لکھ رہا تھا۔ سرفراز کو اب اتنا کہاں ہوش تھا کہ وہ غور کرتا کہ محرر اُس کاغذ پر کیا رام لکھا کھ رہا ہے۔ اُس نے کنکھار کر تو جا اپنی جانب مبذول کرائی۔ محرر نے جیسے ہی سر اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا تو وہ فوراً ہی بول پڑا کہ جیسے اُس کی واحد وجہ پیدائش محرر سے بھٹکا م ہونا ہی تو ہو۔

”جی میں بہزاد احمد خان کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں“ سرفراز نے سامنے بیچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی.....، تو تم ہو اس اندیو نقص امن اور کارسکار میں مداخلت کرنے والے کے حمایتی.....!“ محرر کی آواز میں ایک شرارتی سا طنز تھا۔

”آخر بہزاد نے ایسا کیا جرم کر دیا ہے جو آپ نے اسے تھانے میں بٹھا رکھا ہے؟“

سرفراز محرر کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”ابو صاحب..... سرکاری کام میں مداخلت کرنا اور اندیو نقص امن کوئی معمولی جرم نہیں ہوتا۔ میاں صاحبزادے کو جیل بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہمارے ایس ایچ او صاحب کی رحم دلی ہے کہ یہ جیل کی ہوا کھانے سے بچ گیا اور انہوں نے اس پر ترس کھا کر مجھے کہا کہ اس کے گھر والوں کو فون کر کے بلوا کر اس معاملے کو دفع کر دو“ محرر نے اپنی بانیں آکھ کو بڑی فنکاری کے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

سرفراز اپنی کرسی سے زرا سا اٹھا اور اپنا منہ محرر کے کان تک لے گیا۔ اُس کے کان میں کچھ کہا۔ بہزاد اُس تنو نہ سکا البتہ اتنا ضرور دیکھا محرر کے چہرے پر ایک بڑی ہی معنی خیز سی مسکراہٹ چمک اٹھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے

اچھل کی چاب سلیکھا اچھل

ماہنامہ حجاب کرچی

شائع ہو گیا

ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول، ٹاؤٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ”حجاب“ آج ہی ہا کر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aaanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی
صورت میں

021-35620771/2

0300-8264242

سرفراز کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ فوراً ہی سرفراز نے وہی لفاظ جو اس کی بیوی نے اسے دیا تھا، گرتے کی بغلی جیب سے نکالا اور بڑی تیزی و رازداری کے ساتھ محرر کی طرف بڑھا دیا۔ محرر برق رفتاری کے ساتھ لفاظ سرفراز کے ہاتھ سے اچک کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ والے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹوں کے وقفے کے بعد اُس کی واپسی ہوئی تو اُس کے چہرے پر بشارت سی تھی۔ آتے ہی وہ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور سرفراز سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو بابو صاحب..... تمہارے اس میاں صاحبزادے کا جرم تو کافی سنگین ہے لیکن میں نے ابھی جا کر ایس ایچ او صاحب کو اُس کی بے گناہی سے متعلق تمہارے فرائم کردہ شواہد پیش کیے۔ حالانکہ وہ شواہد نا کافی تھے لیکن انہیں اس کی جوانی پر رحم آ گیا اور انہوں نے اسے اس بار محض سبھیہ کر کے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ویسے بھی آپ کو پتہ ہی ہوگا کہ پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی“ اتنا کہہ کر محرر کھلی کھلی کرتا ہوا ہنس پڑا۔

سرفراز یہ سنتے ہی تیزی سے اٹھا۔ بہن زاد کو فوراً اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح سے تھانے کی عمارت سے باہر آ گئے۔ سرفراز نے اپنی موٹر سائیکل کو کک لگائی۔ جیسے ہی بہن زاد پیچھے سوار ہوا اُس نے موٹر سائیکل پوری رفتار پر چھوڑ دی اور سیدھا گھر جا پہنچا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے وہ بہن زاد سے بولا۔ ”میرے ساتھ اندر چلو، میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں“

گھر کے اندر داخل ہوئے تو ڈرائنگ روم میں ثمنینہ صوفے پر تنہا لیٹے بیٹھی نظر آئی۔ اُن دونوں کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک رونق سی نمودار ہوئی۔ فوراً ہی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

”اللہ کا شکر ہے کہ آپ دونوں آ گئے۔ میں نے بہن زاد کی

ہی پولیس والے حرکت میں آئے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر زبردستی پولیس کی گشتی وین میں ٹھونسا اور خود بڑھ چڑھ کر امدادی کارروائیوں میں حصہ لینے لگے۔ نیوز چینلوں کے رپورٹروں اور کیرہر ٹیویوں نے آگے بڑھ بڑھ اُن کی رپورٹیں فلمبند کرنا شروع کر دیں۔ اتنا کہہ کر بہنرادیوں اپنے یوں ہاتھ ملنے لگا جیسے کوئی خزانہ اُس کے ہاتھ لگتے لگتے رہ گیا ہو۔

سرفراز اُس کی بات سن کر کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر کی مہیب خاموشی کے بعد اُس کی ایک گہری سانس نے خاموشی کے آسب کو کچھ کم کیا۔ ”بہنرادیوں میں تم کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں“ سرفراز کی آنکھوں میں ایک پراسرار سی گہرائی تھی۔

”راز..... کیسا راز.....؟“ بہنرادی بے تاب سی سے سرفراز کے کچھ اور قریب ہو کر بولا۔

”تم ذرا صبر کرو.....! کوئی ایک راز.....! آج میں تم پر کئی ایک راز افشا کروں گا.....!“ سرفراز کے چہرے پر ایک بڑی ہی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

”تم کو ہیرو بننے کا بہت شوق ہے نا اور تم چاہتے ہو کہ تم بریکنگ نیوز میں آؤ؟.....! یہ ہی چاہتے ہو نہ تم؟.....! لیکن کیا تم یہ جانتے ہو کہ خود ہمارے اس محلے میں کتنے ہیرو رہتے ہیں؟.....!“ سرفراز کی آواز کی پراسراریت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ”ہمارے محلے میں بھی بہت بڑے اور عظیم ہیرو رہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ انہیں تمہاری طرح بریکنگ نیوز پر آنے کا کوئی شوق نہیں۔ تمہاری نظر میں ہیرو صرف وہ ہوتا ہے جو بہادری کے کارنامے سرانجام دے کر بریکنگ نیوز پر آئے۔ لیکن بہنرادی یہ سچ نہیں ہے۔ اچھا بتاؤ کیا شاہب الدین، قمر نظامی، خالد قریشی، ممتاز علوی، سکندر لودھی اور ارشد نظامی یہ سب تمہاری نظر میں ہیرو نہیں ہیں.....؟“

اماں اور اُس کی بیوی کو سمجھا کر گھر روانہ کر دیا تھا کہ جیسے ہی سرفراز آتے ہیں میں آپ کو خبر کرتی ہوں۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا، اب ایسا کرو کہ جب تک میں اور بہنرادی ہاتھ منہ دھو لیتے ہیں تم پہیلے فون کر کے بہنرادی کے گھر اُس کی خبریت کی اطلاع دے دو۔ پھر میرے اور بہنرادی کے لیے کھانا گرم کر دو۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے اور بہنرادی نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ ویسے کھانا تو تم نے بھی نہ کھایا ہو گا؟“ جب سرفراز اور بہنرادی دسترخوان پر بیٹھے تو گرما گرم بھاپ اڑاتا ہوا کھانا چٹا ہوا تھا۔ تینوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے اختتام پر سرفراز نے شہینہ کو چائے بنانے کا اشارہ کیا۔

”اچھا، بہنرادی بتاؤ ہوا کیا تھا؟“ سرفراز نے بہنرادی طرف بنور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سرفراز بھائی.....! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا.....!“

”چھوڑو بہنرادی اس بے کار کے تذکرے کو۔ مجھے تم یہ بتاؤ کہ آخر ہوا کیا تھا؟“

”بس کیا بتاؤں، سرفراز بھائی، اپنی تو قسمت ہی خراب ہے“ وہ منہ بنور سے ہونے لگوا ہوا۔ ”اُس روز ہم ڈسپوزل اسکواڈ کے کپتان نے آج ان کم بختوں نے مجھے بریکنگ نیوز بننے سے روک دیا۔ آپ کو یاد تو ہو گا کہ آج صبح رابنسن روڈ اور کورٹ روڈ کے سنگم پر ایک ہجوم کو دیکھ کر میں نے آپ کو روک لیا تھا۔ جب میں ہجوم میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں دور کشتے آپس میں ٹکرا کر الٹے پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے مسافر اور ڈرائیور لٹے ہوئے رکشوں کے نیچے دبے جچے دیکر کر رہے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے موبائل فون پر مختلف زاویوں سے اُن کی ویڈیو بنا رہے تھے۔ چند پولیس والے بھی ڈور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں اُن دبے ہوئے لوگوں کی مدد کو آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک چند نیوز چینلوں کے نمائندے اور کیرہر ٹیویں وہاں آن پہنچیں۔ اُن کو دیکھتے

”ہیرو.....؟“، بھلا یہ سب کیسے ہیرو ہو سکتے ہیں.....؟
 انہیں جانتا ہی کون ہے۔ یہ سب تو ہمارے محلے کے چند
 لہامت ہی عام سے لوگ ہیں، بھلا یہ کب اور کیسے ہیرو بن
 گئے.....؟“، ہنزاد کے لہجے میں زمانے بھر کا تسخیر عیاں تھا۔
 ”اگر یہ ہیرو نہیں ہیں تو پھر دنیا کا کوئی بھی بہادر آدمی
 میری نظر میں ہیرو نہیں ہے۔ ہنزاد.....! یہ وہ لوگ ہیں جو
 اپنے اپنے گھروں اور گھر والوں کے سر کی ٹھنڈی چھاؤں
 ہیں۔ میرے بھائی.....! تم پر سب سے پہلا حق تمہارے
 اپنے گھر والوں اور پھر تمہارے محلے والوں کا ہے۔ اگر تم
 کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو سب سے پہلے اپنے گھر والوں اور
 محلے والوں کے لئے کچھ کرو۔ تم اپنی بیوہ ماں کا واحد سہارا
 ہو، اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ تمہارا پہلا فرض اپنی ماں،
 بہن اور بیوی کے سر کی چھاؤں بن کر رہنا ہے۔ میں نے
 ابھی ابھی جو نام تم کو گونائے ہیں، یہ سب اس نفسا نفسی کے
 دور میں اپنے گھر اور گھر والوں کے سر پر ایک ایسی چھت بن
 کرتے ہوئے ہیں، ایک ایسا سایہ دار درخت بن کر لہرا
 رہے ہیں جو ان پر کبھی دھوپ کی تیش اور بارش کی نمی نہیں
 آنے دیتا۔ تمہارے سامنے میری بھی مثال موجود ہے۔
 میں روزانہ دو نوکریاں کر کے اپنے گھر اور بال بچوں کی ہر
 ممکن نگہداشت میں مصروف رہتا ہوں“
 اتنا کہہ کر سرفراز سانس لینے کو روکا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔
 ”تم خالہ زینب کو کو تو جانتے ہی ہوتا.....؟ خالہ زینب کو ستر
 سال کی عمر میں جو ان بیٹے محض اس لیے اکیلا چھوڑ کر چلے
 گئے ہیں کہ اس نے اپنے مرحوم خاوند کی وصیت کے عین
 مطابق اس کی زندگی بھر کی محنت اور جمع پونجی سے بنایا ہوا گھر
 اپنے بیٹوں کے نام کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ناخلف خالہ
 زینب کو اس ظالم دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اپنی اپنی دنیاؤں میں
 جا بے۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ اس اکیلی مظلوس بیوہ کی
 زندگی کیسے گزر رہی ہے.....؟ اس کے گھر چوہا کیسے جلتا



ناکام پلان

خلیل جبار

آج کا دور شارٹ کٹ کا دور بن کر رہ گیا ہے جسے دیکھو وہ کامیابی کے لیے شارٹ کٹ استعمال کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔

ایک حسینہ کی روداد، اس نے اچھی زندگی کے لیے اپنے حسن و جوانی کو شارٹ کٹ کی نذر کر دیا تھا۔

کورٹ رپورٹر خلیل جبار کی ڈائری کا ایک ورق

فرہاد سے جب میں نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی وہ فوراً سے تیار ہو گیا اور اپنے پیڑ کے دن آنے کا اعلان کر دیا۔ فرہاد حیدر آباد سے دو گھنٹے کی مسافت پر واقع نیو سعید آباد میں رہتا تھا۔ میری اس سے فیس بک پر دوستی ہوئی دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا میں نے اس دوران فرہاد کے بارے میں بات چیت سے پوری تفصیل معلوم کر لی تھی۔ فرہاد کے والد دینی میں کام کرتے تھے۔ دینی سے انہیں جو رقم آتی تھی اس رقم میں سے ٹھیک ٹھاک رقم خرچ کرنے کے بعد بھی بچ جاتی تھی۔ دینی سے جو چیک آتا تھا وہ چیک بھی فرہاد علی کے نام آتا تھا جو وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر دیتا تھا۔ فرہاد علی کی دو بڑی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں گوکہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا مگر وہ والد ادا سامی تھا اور مجھے اس کی عمر سے کیا رقم سے غرض تھی۔ بقول اس کے بینک میں اس کے پاس ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہو چکی تھی۔ چند سال اور دینی میں رہ کر اس کے والد ابصار علی مزید کچھ رقم اور جمع کر کے پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ بچیوں کی شادی کے فرض سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ کاروبار کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے فرہاد علی کا والد پاکستان آ جائے مجھے اسے شخصے میں اتارنا تھا۔ میں نے جب اس سے ملاقات کی خواہش کی وہ ایسے تیار ہوا کہ جیسے وہ پہلے ہی ملاقات کرنے کا پروگرام ترتیب

دے چکا ہو۔ میں سوچ رہی تھی کہ فرہاد علی آنے سے پہلے مجھے اطلاع کر دے گا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور شہر پہنچ کر مجھے کال کر دی۔ ”کہاں ہو بھی میں تمہارے شہر پہنچ گیا ہوں۔“ فرہاد علی نے کہا۔ ”میرے شہر پہنچ گئے ہو اور اب مجھے اطلاع کر رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا اس لیے ایسا کیا ہے۔“ ”اچھا یہ بتاؤ اس وقت کہاں ہوتا کہ میں تمہیں لینے آ جاؤں۔“ ”میں ہوٹل فاران میں ہوں جو کہ صدر کے علاقے میں واقع ہے۔“ فرہاد علی نے بتایا۔ ”فرہاد یہ کیا بے مروتی ہے میرے شہر میں پہلی بار آئے ہو اور وہ بھی ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ اتنے مہنگے ہوٹل میں قیام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تم نے میرے ساتھ زیادتی کر دی۔ مانا میرا گھر وی آئی ٹی ہوٹل جیسا نہیں ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ میرا مہمان رک نہ سکے۔“ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔ ”تم ناراض مت ہو میں تمہارے گھر ضرور آؤں گا



دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میرے لیے وہ بہت قیمتی تھے
تحائف لے کر آیا تھا۔ اتنے قیمتی تحائف دیکھ کر میں حیران
رہ گئی تھی۔

”فرہاد میں نے تم سے ملنے کی خواہش کی تھی اتنے قیمتی
تھے تحائف لانے کو نہیں کہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ تھے کچھ بھی نہیں جو میں تمہیں دینا چاہتا ہوں بس
جلدی میں لے آیا ہوں“ آئندہ جب آؤں گا پھر دیکھنا کیسے
قیمتی تھے لاتا ہوں۔“ فرہاد بلی نے کہا۔

”فرہاد میں چاہتی ہوں ہم ملنے رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ
یہ تھے تحائف ہماری راہ میں رکاوٹ بن جائیں۔“ میں
نے خدشے کا اظہار کیا۔

”یہ تم نے کیسی بات کر دی ہے ہم کوئی غیر نہیں ہیں
دوست ہیں دوستی میں یہ سب چلتا ہے۔“
”فرہاد میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔“ میں نے کہا۔

لیکن تمہارے گھرانے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ پہلے ہم
دونوں ایک دوسرے سے ملاقات کر لیں پھر میں تمہارے
گھرانے جاؤں گا۔“ فرہاد بلی نے کہا۔

میں سمجھ گئی کہ اس نے یہ بہانہ کھڑا ہے دراصل وہ ہوٹل
میں قیام کر کے مجھ پر عرصہ ڈالنا چاہتا ہے کہ وہ معمولی
نوجوان نہیں ہے۔ اس کے پاس خوب دولت ہے۔ وہ
جب چاہے کسی بھی شہر کے اچھے ہوٹل میں قیام کر سکتا ہے۔
ایسے نوجوان زیادہ تر بے وقوف ہی ہوتے ہیں اور انہیں
بے وقوف بنا کر خوب مال بنایا جاسکتا ہے۔

فرہاد بلی شہر کے جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا وہ کوئی معمولی
ہوٹل نہیں تھا۔ بہت مہنگا ہوٹل تھا۔ میرے نزدیک اس نے
وہاں ٹھہر کر بے وقوفی کی گئی مجھ سے کسی بھی عام ریسٹورنٹ
میں ملاقات کر کے اپنے گھر چلا جاتا۔ دو گھنٹے کی مسافت پر
اس کا گھر تھا، میں جب ہوٹل میں اس کے پاس گئی وہ مجھے

”میں بھی تمہیں کھوتا نہیں چاہتا، تمہاری تصاویر دیکھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں۔“ فرہاد علی نے کہا۔ ”اب تمہیں سامنے دیکھ کر میں دیوانگی کی حد سے گزر جانا چاہتا ہوں۔“

”گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس میں گھرنا جانے والی کون سی بات ہے۔“ فرہاد چونکا۔

”گھر وہ واپس جاتے ہیں جو ذہنی طور پر فٹ ہوتے ہیں، جو دیوانگی کی حد سے گزر جائے وہ پھر گھر کیسے جائے گا۔“ میں نے قہقہہ لگایا۔

”میرا مذاق اڑا رہی ہو۔“ فرہاد علی نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

”نہیں سمجھا رہی ہوں کہ دیوانے مت ہونا باقی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

ہماری پہلی ملاقات اچھی رہی، ہم دونوں کے درمیان شرافت کی حد برقرار رہی۔ فرہاد علی سے فیس یک پر باتیں ہوتی رہتی تھیں مگر روبرو پہلی بار بات ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت نوجوان تھا، اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ اس میں ابھی بالیدگی نہیں آئی ہے۔ خیالی پلاؤ پکانے کا بہت شوق ہے۔ اس کے خیال میں اس کے والد البصار علی کو جو محنت کرنی چاہیے اس کی جگہ وہ ہوتا تو اسے والد سے زیادہ رقم پاکستان خرچے کو بھیجتا، وہ دینی جانے کے بجائے کسی ایسے ملک جاتا جہاں خواہ زیادہ ملے۔ میں جو شکار پھانسا چاہتی تھی وہ فرہاد علی کی صورت میں پورا اثر رہا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبالا تھا گھر میں غربت و مفلسی کے ڈبرے تھے والد اقبال صبح رکشہ چلاتا تھا۔ رکشے سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ گھر میں خوشی آتی۔ گھر کا ہر فرد روکھی سوکھی روٹی کھا کر صبر و شکر کر کے سو جاتا تھا۔ میری والدہ ایک اسکول میں ماسی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ مہینہ ختم ہونے پر انہیں جو تنخواہ ملتی تھی اس سے گھر کے خرچ میں سہارا مل جاتا تھا۔ میرے والد کی ایک عادت بہت خراب تھی، وہ باتوں ہی بہت تھے، ان کے پسندیدہ موضوع پر بات چھڑ جانے پر وہ گھنٹوں باتیں کرنے میں وقت برباد کر دیتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے انہیں یہ بھی احسان نہ ہوتا تھا کہ یہ وقت ان کا بہت قیمتی ہے۔ اس وقت میں سواریاں ملنے پر ان کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان

کا پسندیدہ مشغلہ پرانی فلمیں دیکھنا تھا، گھر میں ڈھیروں گانے کی آڈیو کیسٹ موجود تھیں۔ جب وہ پرانے گانے گھر میں سنتے تھے ہم بہن بھائیوں کو ہنسی آ جاتی تھی کہ یہ کون سے زمانے کے گانے سن رہے ہیں۔ ان گانوں میں وہ ایسے مکن ہو جاتے تھے انہیں اپنے ارد گرد کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ ان کی اس حرکت کا ان کے دوست بہت مذاق بناتے تھے جب دوست پوچھتے۔

”یار ہالے تم پرانے گانے سنتے ہوئے پرانے زمانے کے اداکار اور اداکاراؤں کی تصاویر دیکھ کر کہاں کھو جاتے ہو۔“

میرے ابا پہلے ان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور پھر بولتے۔

”ارے بے وقوف اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے..... میں ماضی میں کھو جاتا ہوں۔“

”ماضی میں۔“ وہ پوچھتے۔

”ہاں ماضی میں انسان کوئی بھی ہو وہ ماضی میں زندہ رہتا ہے۔ اسے ماضی پسند ہوتا ہے ایسے ہی مجھے ماضی پسند ہے۔“

”اور جو حال گزر رہا ہے اس کا کیا کرو گے؟“

”جب یہ حال ماضی بنے گا تو مجھے یہ بھی اچھا لگے گا۔“ وہ ہنسنے ہوئے کہتے۔

”بہت خوب تم ماضی کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟“

”میں جب پرانے اداکاروں کی تصاویر دیکھتا ہوں میں سوچتا ہوں میں اس وقت کیسا تھا؟“ ابا کہتے۔

ابا کی اس طرح کی باتوں کی بنا پر ان کے یار دوست خطبلی اور ناجانے کیا کیا القابات سے ان کی غیر موجودگی میں نوازتے تھے ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ ابا ملنے میں درپیش لگاتے تھے۔

ہمارے گھر میں ابا کی یہ غیر ذمہ داری ہی مفلسی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ان کے یار دوست بھی رکشہ چلاتے تھے مگر اتنی غربت کسی کے گھر میں نہیں تھی، میرا بڑا بھائی کمال جو کہ کمالے کے نام سے مشہور تھا۔ تعلیم حاصل نہ کر سکا اور اس کی صحبت غلط قسم کے لوگوں میں ہو گئی تھی۔ وہ سب نفیسی تھے، نشہ پورا کرنے کو چھوٹی چھوٹی چوریاں بھی کیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی چوریاں کرنے کی عادت پختہ

”کمالے حقیقت کی دنیا میں آ جا تو جو باتیں کر رہا ہے ایسی، بھکی، بھکی باتیں پاگل لوگ ہی کرتے ہیں۔“ ابا کہتا۔

”میں پاگل ہوں۔“ کمالے غصے میں آ جاتا۔

”پاگل ہے نہیں ہو جائے گا۔“ ابا کہتا۔

”ٹھیک ہے میں اب تجھے پاگل بن کر ہی دکھاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ غصے سے باہر نکل جاتا۔

ابانے بہت کوشش کی کمالے سدھر جائے مگر وہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ اس کا سدھر نااب مشکل تھا۔

میری بڑی بہن نازش بھی مستقبل سے مایوس تھی

غریب گھرانوں میں اچھے رشتے کہاں سے آتے ہیں جو

اس کے لیے آتے۔ امی جان نے اسے اپنے ایک رشتے

دار سے سفارش کروا کر ایک پرائیویٹ اسپتال میں نرس

لگوا دیا تھا۔ وہاں سے اتنی تنخواہ نہیں ملتی تھی پھر بھی یہ شکر تھا

کہ کچھ رقم تنخواہ کی صورت میں مل جاتی تھی۔ وہ روزانہ صبح

گھر سے نکلتی اور رات گئے اسپتال سے لوٹی تھی۔ اسپتال

میں کام کرتے ہوئے ایک لڑکے کا مران سے دوستی ہوئی

وہ نازش سے شادی کا خواہش مند تھا۔ اس نے صاف کہہ

دیا تھا کہ اسے جہیز میں کچھ نہیں چاہیے۔ اس منگانی کے

دور میں لڑکی کے لیے ایسا رشتہ اتنا سکی نعمت سے کم نہ تھا۔

ابا بھی لڑکے کے گھر والوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس

لئے یہ رشتہ طے پا گیا اور نازش کا مران کی لہن بن کر اس

کے گھر چلی گئی۔ میں اپنے دونوں بہن بھائیوں کی نسبت

اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوئی تھی کہ پڑھ رہی تھی۔

میں میٹرک پاس کر کے انٹر میں آ چکی تھی۔

کمالے کو شادی کا بہت شوق تھا۔ اس کے کارنامے شہر

بھر میں بہت مشہور تھے۔ اس لیے کوئی بھی اسے اپنی لڑکی

دینے کو تیار نہ تھا۔ اس احساس محرومی کے سبب وہ دوران

ڈکیتی جس بنگلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاتا تھا گھر کی

کسی خاتون کو زیادتی کا نشانہ ضرور بنا تھا۔ اس کی یہ

حرکت ایسے لے ڈوبی جن خواتین کے ساتھ اس نے

زیادتی کی تھی ان کے ذہن میں اس کی صورت کا خاکہ بن

گیا تھا اور پولیس نے ان خواتین کی مدد سے کمالے کی

صورت کا خاکہ تیار کر لیا تھا اور ایک دن پولیس نے اسے

گرفتار کر لیا۔ وہ کئی سال مختلف مقدمات میں جیل میں سزا

بھگتا رہا اور ایک دن کمالے کی سزا پوری ہو جانے پر قید

ہوئی تھی اب وہ اور اس کے دوست شہر جا کر ڈکیتیاں بھی کرنے لگے تھے۔ چوری اور ڈکیتی سے جو انہیں آمدنی ہوتی تھی وہ جوئے اور نشے میں پوری ہو جاتی تھی۔ چند دن کے عیش کر کے پھر بھکاری بن جاتے تھے۔

میرے ابا نے بہت کوشش کی وہ سدھر جائے، بچپن

میں کمالے کی خوب پٹائی بھی لگائی مگر وہ سدھرتا نہیں تھا۔

بڑے ہونے پر ابا سے بدتمیزی کرنے لگا تھا ابا جب اسے

طریقے سے روزی کمانے کا مشورہ دیتا وہ چڑھ کر بولتا۔

”ابا تو نے حلال طریقے سے روزی کما کر کتنے محل کوشی

بنالیے ہیں اس دور میں حلال طریقے سے گھر کا چولہا نہیں

جل سکتا۔ دی کیا کھائے گا کیا پیے گا۔“

”تو میری مثال مت دیا کر۔“ ابا کو غصہ آ جاتا۔

”کیوں نہ دوں ساری زندگی تو نے حلال روزی کے

چکر میں ہمیں بھوکا مار دیا ہے۔ گھر سے غربت کا خاتمہ نہ

ہو سکا۔ تیرے دوست آج مزے کر رہے ہیں۔“

”میرے دوستوں کے بیٹے ہونہار ثابت ہوئے ہیں۔

وہ غیر ممالک میں جا کر کما رہے ہیں اور وہاں جو کچھ کما

ہیں اپنے گھر بھیج دیتے ہیں۔“

”پھر مجھے بھی باہر بھیج دے۔“ وہ کہتا۔

”بیٹا پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں جو

اپنے ملک میں رہتے ہوئے کچھ نہ کر سکا وہ دوسرے ملک

میں جا کر کیا کرے گا سوائے رسوائی و بدنامی کے کچھ نہیں

دلا سکتا۔“

”مجھے ایک بار باہر ملک بھیج کر دیکھ لے کہ میں کچھ

کر سکتا ہوں یا نہیں۔“

”میرے پاس تمہیں باہر بھیجنے کو کچھ بھی نہیں ہے باہر

جانے کو لاکھوں روپے چاہیے ہوتے ہیں۔“ ابا کہتا۔

”اس مکان کو بیچ دے کچھ رشتے داروں سے ادھار

پیسے لے لیں گے۔“ کمالے کہتا۔

”ہمارے پاس سرچھپانے کو بھی ایک ٹھکانہ ہے

کیا اسے بیچ کر اس چھت سے غیر محفوظ ہو جائیں۔“ ابا

کہتا۔

”ایک دفعہ میں باہر چلا جاؤں پھر دیکھنا میں اتنی دولت

کے ڈھیر تیرے قدموں میں لگا دوں گا جس کا تو نے تصور

بھی نہیں کیا ہوگا اس دولت سے جتنے چاہے محل خرید لیتا۔“

سے چھوٹ آیا۔

سزا مل جانے پر ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ سدھر جاتا لیکن وہ جیل میں رہ کر اور پکا بد معاش بن کر آیا تھا، کمالے نے اپنا بڑا مضبوط گروپ بنالیا تھا، یہ گروپ پولیس سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ کبھی پولیس سے سامنا ہو جانے پر وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو جاتے تھے۔ پولیس کو ان کی تلاش تھی۔ پولیس کے لیے انہیں گرفتار کرنا اتنا آسان نہ رہا تھا۔ وہ ایک کامیاب ڈکیتی کر کے چھپ جاتے تھے۔ کراچی میں چھپنے کے لیے انہوں نے ایک فلیٹ بھی لیا ہوا تھا۔ واردات کر کے اسی فلیٹ میں چھپتے تھے۔ کسی نے ان کی مخبری کر دی، پولیس نے کامیاب چھاپہ مارا اور کمالے کے دو دوستوں کو پکڑ لیا۔ باقی ساتھی اور کمالے پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ مجھے اسی اور میری بہن نازش کو کمال کے مرنے کا بہت دکھ تھا۔ اس کے برعکس ابا کو اس کے مرنے پر کوئی دکھ نہیں ہوا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

”ایسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ جس راہ پر کمالے نکل گیا تھا مجھے اس کا یہ انجام پہلے ہی نظر آ گیا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔“

”پھر بھی یار وہ تیرا خون تھا ایسی بات مت کر۔“ رفیق نے کہا۔

”وہ گند اخون تھا اسی لیے ایسا نکل گیا، اچھا خون ہوتا تو کبھی ایسی غلط راہ نہ نکلتا۔“ ابا بولا۔

”صدہ زیادہ ہونے پر یہ ایسی بات کر رہا ہے۔“ عبدالرشید نے رفیق کے کان میں کہا۔

”ہاں ایسا ہو جاتا ہے۔“ رفیق نے کا۔

ہر آدمی اپنے لحاظ سے ابا کے جملوں پر بات کر رہا تھا۔ چند دن کمالے کا تذکرہ رہا اور پھر لوگوں نے اس کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا۔ ابا کو کمالے کی موت نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایک دن وہ بھی ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ انٹر کر کے میں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ گھر کی ساری ذمہ داری امی جان کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔ ان کی اتنی آمدنی نہیں تھی کہ گھر کا خرچ چل سکے۔ میری تعلیم اتنی تھی کہ میں کسی پرائیویٹ اسکول میں پڑھا سکوں یہ بھی اتفاق تھا کہ میں نے خوب رنگ و روپ نکال لیا تھا۔ میں جب سڑک پر چلتی تھی لوگ مجھے ایک بار دیکھنے پر ضرور مجبور

ہو جاتے تھے۔ میں نے غربت میں رہتے ہوئے بھی امیری کے خواب دیکھے تھے۔ والدین نہ سہی کم از کم شوہر کے گھر میں عیش کر سکتی تھی۔ اس مقصد کے لیے مجھے کسی امیر گھرانے کے لڑکے کو پھانسا تھا۔ میں جس اسکول میں پڑھا رہی تھی وہاں کئی نیچر ایسی تھیں جو پیسے والے لوگوں کو گھانٹ کر عیش کر رہی تھیں۔ موبائل پر ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا، بیلنس منگوانا، ان کے ساتھ جا کر شاپنگ کرنا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ ان کی تنخواہ اتنی نہ تھی جتنا وہ اپنے اوپر خرچ کرتی تھیں، میں حیرت سے ان کو دیکھتی تھی اور ان کی قسمت پر رشک بھی کرتی تھی۔

ایک دن صبح میں بارش ہو گئی، بچے اسکول نہیں آئے تھے جو چند بجے آ گئے تھے ان کو ایک کلاس میں بٹھادیا گیا تھا۔ ہم چند نیچر گپ شب لگانے میں مصروف تھیں۔

”نبیلہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم سب کی تنخواہیں اتنی کم ہیں مگر تمہارے ٹھاتہ باٹ رئیسوں والے ہیں۔“ میں نے ہمت کر کے کہہ دی۔

”یہ ٹھاتہ باٹ تمہارے بھی ہو سکتے ہیں اور ہم سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں تم کم عمر ہو خوبصورت ہو جو بھی تمہیں دیکھے گا وہ تمہارا دیوانہ ہو جائے۔“ شائلہ نے کہا۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہم نے کون سا تم سے مذاق کیا ہے۔ ہم بھی سنجیدہ ہیں۔“ نبیلہ نے کہا۔

”ایسی واہیات بات کر رہی ہو اور مجھے کہہ رہی ہو کہ سنجیدہ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہ تم پرانے دور کی ہو اور نہ ہم پرانے دور کی ہیں۔ یہ جو دور ہے اس میں چالاکی کے بغیر گزارا نہیں، جہاں بھی کام کرنے جاؤ مالکان مزدور کا خون چوسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے شارٹ راستے تلاش کرنا پڑتے ہیں۔“

”شارٹ کٹ راستے۔“ میں چونکی۔

”جب کئی سیدھی انگلی سے نہ نکلتے تو پھر ٹیڑھی انگلی سے نکالنا پڑتا ہے۔ ہم سے اسکول میں کام خوب لیا جاتا ہے اس کے مقابلے میں اجرت بہت کم ہے، مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی بازار شاپنگ کے لیے جانے پر ہماری کئی ماہ کی تنخواہ ایک دن میں ختم ہو جائے پھر تم ہی بتاؤ کہ شارٹ

راستہ نہ نکالیں تو پھر کیا کریں۔“ نبیلہ نے کہا۔
 ”اور یہ شارٹ کٹ راستہ کون سا ہے؟“ میں نے
 پوچھا۔
 ”تم واقعی بھولی ہو یا بھولی بننے کی ایکٹنگ کر رہی
 ہو۔“ شاملہ نے کہا۔

پر لے جا کر ہمارے ساتھ کچھ وقت گزار لیتے ہیں۔ جب
 ہم سے دل بھر جائے تو پھر کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتے ہیں۔
 ان کی مثال ایک بھنورے کی سی ہے۔ وہ ہر گلی کارس چوس
 لیتا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے وہ دولت کا سہارا لیتے
 ہیں۔“

”یہ کام تو بہت ہی خراب ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”مجبوری اور بھوک غلط اور صحیح کی تمیز کھود جاتی ہے۔
 انسان کو اپنی ضرورت یاد رہتی ہے کہ اسے کس طرح پورا
 کیا جائے۔“ شاملہ نے کہا۔

میں ان کی باتیں سن کر وقتی طور پر پریشان ہو گئی تھی میں
 نے یہ باتیں فلوں اور ڈراموں میں ضرور سنی تھیں لیکن
 حقیقت میں یہ بات آج آشکار ہوئی تھی۔ ان کی باتیں
 سن کر رات تک میں انہی باتوں میں الجھی رہی کیا زندگی
 انسان کو اس قدر بھی گرا دیتی ہے۔ جس کا وہ تصور بھی نہیں
 کر سکتا ہے مجھے اپنی ساسی نیچر ز سے دلی ہمدردی ہو گئی تھی
 اور کیوں نہ ہوتی ان کی ایسی باتیں سن کر میرے رونگٹے
 کھڑے ہو گئے تھے وہ گمراہی کی جانب چل پڑی تھیں۔
 موبائل چیز ہی ایسی ہے کہ انسان ایک اسی کے سہارے
 دوسروں کے گھروں میں پہنچ جاتا ہے۔ جنہیں جانتا نہیں
 موبائل کی بدولت ان سے شاسانی حاصل کر لیتا ہے
 میرے ذہن پر کچھ دن ان کی باتوں کا اثر رہا پھر اس کا اثر
 زائل ہونے لگا۔ ان کی باتیں زندگی کی تلخ حقیقت تھی۔
 انسان کی زندگی میں ایسی لمحات آ جاتے ہیں جب وہ اچھے
 برے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔

ہر لڑکی کی طرح میری زندگی میں بھی مختلف خواہشیں
 تھیں۔ ایسی خواہشات جو دولت سے پوری ہو سکتی ہیں۔
 میں جن باتوں کو برا سمجھ رہی تھی انہیں اچھا سمجھنے لگی تھی۔ کوئی
 نوجوان یا بڑی عمر کا شخص اگر کسی لڑکے کے دل کے ارمان
 پورے کر کے اسے مینے میں دو تین بار کچھ دیر کواپنے ساتھ
 لے جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے دونوں کی خواہشیں
 پوری ہو گئیں اور پھر میں اس روش پر چل نکلی کہیں میں
 انہیں سمجھانے کا سوچ رہی تھی اور کیا اب خود اس راہ
 کا انتخاب کر چکی تھی۔ میں نے اپنی ساسی نیچر کی طرح ایک
 نمبر لایا نمبر ملنے پر دوسری طرف سے آواز آئی۔
 ”آپ کون ہیں؟“ میں نے اپنی آواز کو مترنم بنایا۔

”میں واقعی بھولی ہوں اب بتاؤ۔“ میں نے کہا۔
 ”جب آدمی کم ہو خرچ زیادہ ہو پھر انسان ایسے کام
 کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اسے زیب نہیں دیتے۔ ہم
 جیسی مڈل کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے
 گھروالے ہمیں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی غرض سے
 کام پر بھیج دیتے ہیں کہ اس بہانے دولت بھی آئے گی اور
 کسی لڑکے سے دوستی ہو جائے پر اچھا رشتہ بھی گھر بیٹھے
 آجائے گا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔“ نبیلہ ایک لمحے کو روکی اور
 میرے چہرے کو دیکھا۔
 میں اس کی جانب متوجہ تھی۔

”اس دور میں مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور
 تنخواہیں ایسی ہیں کہ اونٹ کے منہ زیرہ۔ ایسے میں اس دور
 میں موبائل بڑے کام کی چیز ہے۔ گھروالے سمجھتے ہیں کہ ہم
 نے موبائل گھروالوں سے رابطے کے لیے رکھا ہے مگر یہ
 ہمیں ہی پتا ہے کہ یہ کس مقصد کے لیے رکھا ہے۔ موبائل
 سے مختلف نوجوانوں سے دوستی بہت آسانی سے ہو جاتی
 ہے وہ دوستی میں ہم پر دولت لٹانے لگتے ہیں۔ اگر کسی بڑی
 عمر کے آدمی سے دوستی ہو جائے تو پھر بات ہی کیا ہے۔ وہ
 نوجوانوں سے زیادہ دولت لٹاتے ہیں اور ناز خیرے بھی
 خوب اٹھاتے ہیں۔“ نبیلہ نے بتایا۔

”کیا ایسے بے وقوف اس دور میں بھی مل جاتے
 ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”بے وقوف نہیں عظیمند ہوتے ہیں۔“ نبیلہ تلخی سے
 بولی۔
 ”عظیمندو کیسے؟“

”جس طرح انسان گھر کا پکا کھا کر اکتا جاتا ہے اسی
 طرح مرد کی بھی یہ فطرت ہے اسے باہر کا کھانے کی
 ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ وہ ہم جیسی مجبور لڑکیوں سے
 دوستی کر کے اپنی دولت بچھاؤ کرتے ہیں اور پھر وہ مینے
 میں بھی دو چار بھی تین چار ہمیں مختلف ٹیکس ہاؤس یا فلیٹ

”بھئی فون آپ نے کیا ہے پہلے مجھے بتائیں کہ آپ کون ہیں؟ اور کس سے بات کرتی ہے۔“ وہ بولا۔
 ”مجھ لیں آپ سے بات کرنی ہے۔“
 ”مجھ سے بات کرنی ہے مگر کیوں؟“
 ”بس ایسے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے بات کروں۔“
 ”مجھ سے بات کر کے بیٹا تمہیں مایوسی ہوگی۔“ وہ بولا۔

”یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“
 ”یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہوں، ریٹائرڈ ہونے پر اوپر کی آمدنی بند ہو جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ پر جو پیسے ملے تھے اس کا شاندار مکان تعمیر کرا لیا ہے۔ پینشن ملتے ہی ٹیکس چھین لیتی ہے، بچے بوڑھے والد کو کہاں لفٹ کراتے ہیں۔ والد جب تک چھل دار درخت ہو ہیوی بچے بڑی محبت دکھاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے اس جہاں میں ان سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی نہیں ہے مگر جب انسان ریٹائرڈ ہو جائے پھر اس کے ساتھ مختلف بیماریاں ہو جاتی ہیں جو آخر وقت تک اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ مجھ سے بات کرنے پر تمہیں میں یہی بتاؤں گا کہ آج مجھے یہ تکلیف ہے رات کو سکون کی نیند نہیں آئی، جوڑوں کا درد بہت تنگ کرنے لگا ہے۔ شوگر بہت بڑھ گئی، کنٹرول میں نہیں آ رہی ہے۔
 اس سے قبل وہ مزید کچھ کہتا میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

”انکل مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔
 میں نے دو تین جگہ بات کی یہ محض اتفاق ہی تھا جس سے بھی بات ہوئی وہ ریٹائرڈ ہی ملا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ آج کا دن میرے لیے مبارک نہیں ہے اس لیے اس کام کو دوسرے دن کرنا چاہیے۔ دوسرے دن کچھ کامیابی ہوئی پہلے دو خواتین سے بات ہوئی، میں نے ان سے فرضی نام لے کر جان چھڑائی۔ ایک نوجوان سے رابطہ ہونے پر میں نے اس سے بات کی وہ اس وقت آفس میں کام میں مصروف تھا اس نے رات میں مجھ سے رابطہ کیا۔
 ”ہاں اب مجھ سے بات کریں، میں بالکل فری

ہوں۔“ رابطہ ہونے پر وہ بولا۔
 ”آپ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“
 ”میری آپ سے کہاں ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے پوچھا۔
 ”میری ملاقات کہیں نہیں ہوئی ہے، میں خود ملاقات کی خواہش مند ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”اچھا..... یہ بات ہے آواز آپ کی بڑی اچھی ہے صورت بھی بہت اچھی ہوگی۔ مجھے دانش کہتے ہیں۔“
 ”دانش کہتے ہیں اور نام کیا ہے؟“
 ”نام بھی یہی ہے اس لیے لوگ مجھے دانش کہتے ہیں۔“

”پھر تو عقل بھی بہت ہوگی۔“
 ”بس تھوڑی بہت ہی ہے۔ آپ کی محبت ملے گی تو زیادہ عقل آ جائے گی۔“ دانش نے ہنسنے ہوئے کہا۔
 ”مجھ میں اتنی عقل کہاں اگر عقل ہوئی تو کسی اچھی جگہ ملازم ہوتی بچری نہ کر رہی ہوتی؟“
 ”اچھا آپ بچہ پر کیا نام ہے آپ کا؟“
 ”میرا نام کسی ہے۔“ میں نے اپنا فرضی نام بتایا۔
 ”تمہاری تعلیم کتنی ہے اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے کسی اچھی نوکری کے لیے کہیں بات کروں۔“
 ”میں انٹر پاس ہوں کیا انٹر پاس کو اچھی نوکری مل سکتی ہے۔“

”اس دور میں سفارش کے بغیر کہاں اچھی نوکری ملتی ہے۔ میں کوشش کر کے کہیں تمہیں اچھی نوکری دلا دوں گا۔ میرے تعلقات بہت ہیں۔“ دانش نے کہا۔
 ”ایسا ہو جائے گا۔“ میں نے بے یقینی سے کہا۔
 ”ہاں میں کہہ رہا ہوں کام ضرور ہوگا۔“
 ”میری یہ خوش نصیبی ہوگی کہ اچھی نوکری مل جائے۔“ میں نے کہا۔
 ”تم مجھ سے رابطہ رکھو میں تمہیں اچھی نوکری دلا کر دم لوں گا۔“

”مجھ پر تمہارا یہ بڑا احسان ہوگا۔“ میں نے کہا۔
 ”کیا ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔“ دانش نے پوچھا۔
 ”ہاں ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے مجھے دو دن پہلے بتانا پڑے گا۔“

بھنورے کی طرح ہرکلی کارس چوس لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے نئی نئی لڑکیوں کی تلاش انہیں رہتی ہے۔ دوسری اچھی لڑکی مل جانے پر پرانی لڑکی سے ایسے آنکھیں پھیر لیتے ہیں کہ جیسے جانتے ہی نہیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تھا۔ اس لیے میں نے اس دوران کئی اور لوگوں سے دوستی کر لی تھی اس لیے جب دانش نے مجھ سے بے رخی اختیار کی میں نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ میں ایک ایسی راہ پر چل نکلی تھی کہ آئے دن نئے نئے لوگوں سے دوستیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان لوگوں میں زیادہ عمر کے لوگ زیادہ نئی قسم کے تھے۔ وہ دولت خرچ کرنے اور نئے تحائف دینے میں کنبوئی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس کے برعکس نوجوان لڑکے کرچم کرتے تھے میری امی جان حیران بھی تھیں اور خوش بھی تھیں کہ میری اسکول اور ٹیوشن بڑھانے سے اتنی آمدنی ہو رہی ہے کہ گھر کا خرچ خوب اچھا چل رہا ہے۔ میں جس راہ پر چل نکلی تھی اس راہ میں پیسہ ہی پیسہ تھا زندگی اچھی گزر رہی تھی جیسے پیسے آ رہا تھا ویسے ہی نکل جاتا تھا بچت نہیں ہو رہی تھی۔

ایک روز میں جب سوکر اچھی میری نظر آئینے پر پڑی میں بری طرح چونکی چہرے پر ہنسی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لڑکی کی عمر بڑھنا خطرے کی علامت ہوتی ہے جیسے دنیاوی حسن عارضی ہوتا ہے ایک بار ڈھلک جائے پھر مرد بارہ لوٹ کر نہیں آتا ہے۔ میرا حسن بھی ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ میری عمر 29 سال ہو چکی تھی۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اچھے دنوں کا انتظار کر لوں اپنے بہتر مستقبل کے لیے جو کچھ کرنا تھا فوری کرنا تھا مجھے کسی ایسے بے وقوف نوجوان کو اپنے جال میں پھانسا تھا جس کے پاس دولت بھی ہو جس کی دولت سے میری زندگی کے باقی دن بھی اچھے گزر جائیں۔ ہمارے رشتے دار ہم سے جنس ہوتے تھے۔ وہ اس بات پر کڑے رہتے تھے کہ میں اسکول نیچر ہو کر اتنا خرچ کیسے کر لیتی ہوں گھر کے علاوہ خود پر خرچ کرنا ایک طرح سے میری مجبوری تھی۔ اچھے کپڑے پہننے میک اپ کر لینے سے انسان کی شخصیت میں نکھار آ جاتا ہے۔ خواتین کا چہرہ ہی ہوتا ہے جس پر مرد مرثا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا میں اپنے چہرے سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ہمارے رشتے

”وہ کیوں؟“
”وہ اس لیے کہ مجھے گھر پر بتانا پڑے گا کآج میں دیر سے آؤں گی ورنہ میری والدہ فکرمند ہو جائیں گی۔“ میں نے کہا۔

”اولاد جوان ہو تو والدین کو فکر رہتی ہے ٹھیک ہے میں تمہیں دو دن پہلے بتا دیا کروں گا۔“ دانش نے کہا۔
کئی دن تک اس سے ٹیلی فون پر رابطہ رہا وہ ہر بار ملاقات کے لیے اصرار کرتا رہتا تھا۔ میں خود بھی اس سے ملنا چاہتی تھی لیکن اس طرح کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس پر گھر پڑی ہوں۔ دانش کے اصرار پر میں نے ایک دن ملاقات کے لیے رکھ لیا۔ اس دن میں نے اسکول سے چھٹی لے لی تھی۔ گھر پر بھی احتیاطاً یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے آج اسکول میں دیر ہو جانے کی اس لیے فکرمند نہ ہونا۔

دانش 45 سال کا آدمی تھا۔ چہرے سے ہی بڑا عیاش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سرکاری محکمے میں ایسی پوسٹ پر فائز تھا جہاں اس کی اوپر کی آمدنی بہت زیادہ تھی مجھے دیکھتے ہی وہ میری خوبصورتی پر مر مٹا تھا۔ دانش مجھے ایک وی آئی پی ہوٹل میں لے گیا جہاں اس نے میری خوب خاطر مدارت کی میرے منہ کرنے پر بھی کئی ڈشیں منگوائی تھیں۔ ہوٹل سے واپسی پر اس نے مجھے دو انتہائی قیمتی سوٹ بھی دلوائے جب میں نے دانش سے کہا کہ ”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ اس پر وہ زور سے ہنسا۔

”ارے بھئی دوستی میں یہ سب چلتا ہے جب تم یہ سوٹ پہنو گی یاد دیکھو گی اس وقت تمہیں میری یاد ضرور آئے گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہو ایسا ہوتا ہے خفیہ کی اس لیے زیادہ اہمیت ہے۔“ میں نے کہا۔

چند ملاقاتوں پر دانش نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کیا مجھے شاپنگ بھی کراتا تھا بڑی اچھے اچھے ریسٹورنٹ بھی لے کر جاتا رہا اور پھر ایک دن وہ مجھے گھمانے کے بہانے اپنے دوست کے ایک فلیٹ پر لے گیا اور اسی دن دانش نے اپنی خدمت کرنے کی قیمت بھی وصول کر لی۔ مجھے یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ فلیٹ اس کے دوست کا نہیں بلکہ اس کا ذاتی فلیٹ ہے اور اس نے یہ فلیٹ اپنی عیاشی کے لیے رکھا ہوا ہے۔ دانش جیسے لوگوں کی مثال ایسی ہے کہ وہ

داروں میں کئی جگہ میرے رشتے کی بات بھی چلی مگر میرے بھائی کی شہرت اتنی اچھی نہیں تھی جو بات بن جانی مجھ سے جمیل ہونے والے رشتے دار ہمارے خلاف رشتہ لے کر آنے والوں کو اتنا بھردیتے تھے کہ وہ دوبارہ پھر پلٹ کر ہمارے گھر کا رخ بھی نہ کرتے تھے۔ مجھے بھی ایسے لوگوں کی ضرورت نہ تھی جو دوسروں کی باتوں میں آجائیں رشتہ قائم ہو کر ٹوٹ جانا یہ بڑی بدنامی والی بات ہوتی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ رشتہ ہی نہ ہو وہ اچھا ہے۔

آئینے نے آج مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اس خوبصورتی کے ماند پڑنے سے پہلے پہلے ایسے بے وقوف امیر نوجوان کو تلاش کرنا تھا جو مجھ سے شادی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ موبائل پر اب تک جس نوجوان نے مجھ سے دوستی کی تھی وہ صرف اپنی ہوس مٹانے کی غرض سے دوستی کی تھی۔ کوئی بھی ایسا نوجوان نہیں ملا تھا جو مجھ سے شادی کا خواہش مند ہو۔ میں فیس بک بھی استعمال کرنے لگی تھی۔ فیس بک پر میرے ایک ہزار فریڈ بن چکے تھے۔ کاشف سے بھی میری دوست فیس بک پر ہوتی تھی اس کا تعلق میرے شہر سے ہی تھا۔ اس کا ذہن عادی مجرموں جیسا تھا، وہ کئی چھوٹی موٹی وارداتیں کر چکا تھا۔ وہ اس چکر میں تھا کہ کوئی بڑی واردات کر کے باقی زندگی شرافت کی گزاریں۔

ایک دن ملاقات ہونے پر وہ مجھ سے کھلی گیا۔ اور اپنے سارے کارنامے کھل کر بتا دیئے اسے اس بات پر فخر بھی تھا کہ آج تک وہ اتنی جرائم کی وارداتیں کر کے پکڑا نہیں گیا ہے۔

”تم ان دنوں فیس بک بہت استعمال کر رہی ہو؟“
”کیا فیس بک استعمال کرتا جرم ہے۔“ میں نے کہا۔
”یہ میں نے کب کہا ہے۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ہے۔“

”جیسے سب لوگ فیس بک استعمال کرتے ہیں ایسے ہی میں بھی فیس بک استعمال کر رہی ہوں۔“

”تمہارے دوست غیر ملکی زیادہ ہیں اس لیے میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ کہیں تمہارا باہر ملک میں بسنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“

”میں نے وقت پاس کرنے کے لیے ان سے دوستی

بنالی ہے ویسے مجھے مختلف ممالک کی سیر کرنے کا بہت شوق ہے انسان کو ملک سے باہر بھی لٹکانا چاہیے۔“
”تمہارا شوق پورا کر دوں تو کیسا رہے گا۔“ وہ ایک خاص ادا سے مسکرایا۔

”تم میرا شوق پورا کرو گے اپنی خواہشات پورا کرنے کو بقول تمہارے پاس پیسے نہیں ہوتے چھوٹی چھوٹی جرائم کی وارداتیں کر کے خواہش پوری کرتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ میں چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرتا ہوں لیکن اب میں بڑی بڑی وارداتیں کر کے اتنی دولت اکٹھی کر لینا چاہتا ہوں کہ باقی زندگی سکون کی گزر جائے۔“

”تمہاری سکون کی زندگی جیل میں ہی گزر سکتی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں بہت سنجیدگی سے تم سے بات کر رہا ہوں اور تم میری بات کو مذاق میں اڑا رہی ہو میں تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔“

”اچھا! میرا فائدہ وہ کیسے؟“

”تم کل سے پھول بن چکی ہو دس پندرہ سال بعد کوئی تمہیں نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ جو وقت ہے اس کا فائدہ اٹھا لو۔“

وہ بات ٹھیک کہہ رہا تھا اس لیے میرے ذہن کو لگی تھی۔

”میں کس طرح فائدہ اٹھاؤں؟“

”میری بات پر عمل کر کے تم اتنا کمالو گی کہ باقی زندگی تم کسی بھی اچھے ملک میں گزار لو گی۔“

”مجھے کیا کرنا ہو گا۔“ میں سنجیدگی سے بولی۔

”فیس بک تم استعمال کرتی ہو اس پر امیر نوجوانوں

سے دوستیاں کر لو ان کے پاس دولت بہت ہوتی ہے انہیں

محبت کے جال میں پھنساؤ جب وہ تمہاری محبت کے جال

میں پھنس جائیں پھر ان کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی

کوشش کرو کہ پاکستان میں کچھ نہیں رکھا ہے ہم دونوں باہر

جا کر شادی کر لیتے ہیں۔ وہیں رہ کر دونوں مل کر کمائیں

گے اور اپنی آنے والی نسل کا مستقبل تاننا ک بنا لیں گے۔

فلاں ملک میں میرے ماموں رہتے ہیں وہ ہماری باہر

جانے میں مدد کروں گے مرد کی فطرت ہے اس کی یہی

ذہن پر ایسا اثر پڑا تھا میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہماری پولیس ایسی ہے کہ وہ اچھے اچھوں سے جرم قبول کرا لیتی ہے۔
”صائمہ تم ایسے نوجوانوں پر محنت کرو جن کے والد باہر کمانے گئے ہوں۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔

”ایسے نوجوانوں کو پھانسا آسان ہوگا مگر کاسٹریز براہ باہر ہوتے گھر میں والدہ ہوتی ہیں بینک سے رقم لانا بینک میں رقم جمع کرانا چیک جمع کرانا یہ سب ذمہ داری ان نوجوانوں پر ہی ہوتی ہے ایسے نوجوانوں کو بے وقوف بنا کر رقم ایٹھ لیتا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ انہیں تم آسانی سے بہکا سکتی ہو کہ تمہارا والد زیادہ رقم نہیں بھیج رہا ہے اسے تم لوگوں کی فکر نہیں ہے تم خود جا کر باہر قسمت آزمائی کرو زیادہ فائدے میں رہو گے میں بھی تمہارے ساتھ جا کر باہر کام کروں گی دونوں مل کر کام کرنے سے زیادہ رقم اکٹھی ہو جائے گی جو ہمارے بچوں کے کام آئے گی ان کا مستقبل شاندار ہوگا ہمارے بچوں کے پاس غیر ملکی شہریت ہوگی۔“

کاشف مسلسل میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ بات اچھی کر رہا تھا میرے دل کو مگی تھی اس طرح کے چند نوجوانوں کو پھانسا کر ہم دونوں ہی امیر بن سکتے تھے۔ خواہش تو میری تھی یہی تھی کہ میں باہر ملک میں جا کر شاہانہ زندگی گزاروں مگر جانے کو ٹھیک ٹھاک رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ غریب لوگ خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس امیر لوگ ادھر سوچتے ہیں اور ادھر ان کا سوچا پورا ہو جاتا ہے۔ میں اکثر یہی سوچتی تھی کہ کاش میں بھی کسی امیر گھرانے میں پیدا ہو جاتی خوب عیش کی زندگی گزارتی، امیر لوگوں کی بیٹیوں کے رشتے بھی اچھی جگہوں پر ہو جاتے ہیں۔

فیس بک پر میرے دوستوں میں فراہادی ایسا نوجوان تھا جس کا والد دہلی میں کام کر رہا تھا۔ فراہادی گھر کے تمام معاملات دیکھتا تھا۔ اس پر محنت کر کے مجھے کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ کم عمر تھا مگر اس کی عمر سے مجھے کیا لیتا مجھے اس کی رقم سے غرض تھی۔

فراہادی سے ملاقات ہوئی وہ ہر ہفتے مجھ سے ملاقات کرنے حیدر آباد آنے لگا تھا۔ وہ جب بھی شہر آتا ہوٹل میں ہی ٹھہرتا تھا۔ میرے گھر چلنے کے اصرار پر وہ آئندہ کا وعدہ

خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں کا مستقبل محفوظ رہے۔ وہ تمہاری باتوں میں آ جائے گا جب وہ جانے کے لیے پیسے لائے گا ہم اس سے پیسے جھین کر اسے قتل کر دیں گے۔ اس طرح ہم خوب دولت بنالیں گے۔“

”تم قتل کر کے خود بھی پھنسو گے اور مجھے بھی جیل کی ہوا کھلاؤ گے۔“

”تم گھبراؤ نہیں تم قتل کا الزام نہیں آئے گا، ہم اس طرح واردات کریں گے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔“

”میں کیسے نہیں پھنسوں گی۔“ میں نے پوچھا۔

”دیکھو صائمہ میں ایجنٹ کا کردار ادا کروں گا۔ تمہیں اپنے دوست کو اس کے پاس جمع ساری دولت لانے کو تیار کرنا ہوگا۔ جب وہ دولت لے آئے اس کی ساری دولت اپنی تحویل میں لے کر میرے پاس بھیج دینا کہ جاؤ اپنا ویز ایجنٹ سے لے آؤ۔ جب تمہارا دوست میرے پاس آئے گا ہم اس کا کام تمام ایسے کریں گے کہ کسی کو کاناں کام خبر نہ ہوگی۔ تمہارے پاس پولیس آئے گی نہیں اور تفتیش کی غرض سے آ بھی جائے تو تم کہہ سکتی ہو کہ وہ باہر جانے کے چکر میں ایجنٹ کے پاس گیا تھا پھر وہاں سے لوٹا نہیں ہے۔ پولیس ایجنٹ کو ڈھونڈتی رہے گی اور میں معاملے کے دہنے تک چھپ جاؤں گا۔ کہو کیسا پلان ہے؟“

”پلان اچھا ہے اگر پولیس نے تشدد کر کے مجھ سے اقرار جرم کرا لیا تو.....“ میں ٹھہرا گئی۔
”تمہارا بہت رسک تو لیا پڑتا ہے۔ جب تم نے اپنے دوست کو قتل نہیں کیا تو پھر ڈرتی کیوں ہو ڈرتا مجھے چاہیے جو تمہارے دوست کو قتل کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالوں گا، تم یہ بات کہہ کر آسانی سے بچ جاؤ گی کہ تم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے اور وہ تمہیں شادی کے بعد باہر لے کر جانا چاہتا تھا۔ ایجنٹ کے پاس جانے کا کہہ کر گیا تھا اور پھر لوٹا نہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو شادی کرنا کوئی جرم نہیں ہے میرا دوست اگر کسی باہر بھیجنے والے ایجنٹ کے پاس جا کر اگر نہیں لوٹا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ میں نے کہا۔

میں لالچ میں آ گئی تھی۔ کاشف کی باتوں کا میرے

کر کے رہ جاتا تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ فرہاد مجھ سے تنہائی کی ملاقات کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے ڈھیروں تھکے تحائف دے کر مجھے مرعوب کر رہا تھا۔ میری ادویہ عمر کے لوگوں سے دوستی رہی تھی، پھر وہ ان کے سامنے بہت ہی کم عمر اور شرمیلا واقع ہوا تھا۔ وہ مجھ سے جس چیز کا طالب تھا وہ بات کہتے ہوئے گھبراتا تھا۔ میں جب اسے غور سے دیکھتی وہ میری نظروں کی تاب نہ لا کر نظریں نیچی کر لیتا تھا۔ میں بھی سب سمجھتے ہوئے بھولی بنی ہوئی تھی۔ جلد بازی میرے کردار کو اس کی نظروں میں مگر اسکتی تھی۔

ایک دن ناجانے وہ کس ترنگ میں تھا، اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ میں اس کی بے باکی پر حیرت زدہ رہ گئی۔ کہاں وہ اتنا شرمیلا بنا ہوا تھا اور کہاں یہ اس کی جرات کہ مجھے اپنی بانہوں میں لیے لیتا تھا۔ ”فرہاد طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس طبیعت بہت اچھی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجھے لگ نہیں رہا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اپنی بانہوں میں بھرنے کو کتنے چکر لگائے ہیں مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی آج اس قدر جوش آ گیا ہے کہ برداشت نہ ہوا۔“

”اور تم نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں بھی کیسا ہوں کہ تمہیں بیٹھنے کو بھی نہیں کہہ رہا ہوں آؤ بیٹھو۔“

”میرا دل اس وقت بیٹھنے کو نہیں لیٹنے کو چاہ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”طبیعت وغیرہ تو ٹھیک ہے نا۔“ فرہاد علی نے کہا۔

”تمہیں دیکھ کر طبیعت اگر خراب بھی ہوتی ہے تو ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس وقت تمہیں محسوس کر رہی ہوں اس لیے لیٹ کر تم سے باتیں کرنا چاہ رہی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں لیٹ جاؤ یہ بیڈ آرام کرنے کے لیے ہی ہے۔“ فرہاد علی نے کہا۔

”دیکھو کوئی شرارت نہیں کرنا“ مجھے تمہارے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔“ میں نے معنی خیر انداز میں اسے دیکھا۔

”تمہیں دیکھ کر مجھے خود پر کنٹرول کرنا بہت مشکل

ہو جاتا ہے۔“

”کیا واقعی؟ کیا میں اتنی خوبصورت ہوں۔“ میں نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے۔“ وہ میرے قریب کھسک آیا۔

فرہاد جس انداز میں بیڈ پر آیا تھا نہ وہ لیٹنے میں اور نہ بیٹھنے میں شام کر گیا جاسکتا تھا۔ وہ میرے اس قدر قریب آ گیا تھا کہ اس کی سانسیں میرے سینے سے ٹکرا رہی تھیں۔

”میں جب بھی تم سے مل کر لوٹتا ہوں پیاسا ہوتا ہوں۔“

”کیوں ہوٹل والے پانی نہیں دیتے۔“ میں نے زور

دار قہقہہ لگایا۔

میری اس بات پر وہ مسکرا دیا۔

”مذاق اچھا کر رہی ہو۔“ وہ بولا۔

”تم بھی کر لو کس نے روکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں جس طرح کا مذاق کروں گا پتا نہیں تم سہ پاؤ گی یا نہیں۔“

”مجھے تمہاری باتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اتنا ڈرو گی تو تم مجھ سے پیار کیسے کرو گی۔“ یہ کہتے ہوئے فرہاد نے مجھے گدگدی کر دی۔ میں جیسے ہی اچھلی اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”بس ڈر نہیں۔“ فرہاد علی نے قہقہہ لگایا۔

”تم نے اچانک مذاق کیا ہے نا اس لیے ڈر گئی۔“ میں نے کہا۔

”بھلا مذاق بتا کر بھی کیا جاتا ہے۔“ وہ میرے چہرے کی طرف جھٹکا چلا گیا۔

میں نے خود سپردگی ظاہر کر دی تھی اس لیے فرہاد علی نے بے باک ہونے میں کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھادی تھی۔ وہ اپنی مراد کو پا گیا تھا۔ اس لیے ضرورت سے زیادہ ہی خوش تھا۔ میں بھی یہی چاہتی تھی مجھ سے جب بھی ملے خوشی خوشی گھر جائے۔

”فرہاد تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”اس موضوع پر ہماری پہلے بھی تفصیل سے بات ہو چکی ہے کہ میں اپنے بچوں کا مستقبل تانناک بنانا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیسے بنے گا“ اس کے لیے تم نے کیا پلاننگ کی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”پلاننگ ابھی کی نہیں ہے، مستقبل میں کرنے کا ارادہ ہے۔“ فرہاد علی نے کہا۔

”یعنی تم حال سے بے خبر ہو ارے بھی جس کا حال اچھا ہو اس کا ماضی اور مستقبل اچھا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تم نے کون سا فلسفہ سنا دیا ہے یہ ضرور سنا ہے کہ جو حال میں پلاننگ کر لیتا ہے اس کا مستقبل تباہ نک ہوتا ہے۔“

”میں نے بھی یہی بات کی ہے، دیکھو تم نے حال میں پلاننگ کی مستقبل میں کامیابی ہوئی۔“

”ہاں بالکل ٹھیک۔“

”تم نے حال میں پلاننگ کی اور مستقبل میں کامیاب ہوئے اب تم جب مستقبل میں آئے وہ تمہارا حال ماضی بن گیا، لہذا ثابت ہو گیا کہ تمہارا ماضی اچھا تھا۔“ میں نے کہا۔

”استادوں سے بات کرنے میں ہم جیسے لوگوں کا جیتنا مشکل ہے۔“ فرہاد نے اپنے کانوں کو باقاعدہ ہاتھ لگا لیے۔

فرہاد علی پر میری محنت رائیگاں نہیں گئی، 21 سالہ فرہاد میری باتوں میں آ گیا۔ ہم نے اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کو آسٹریلیا شفٹ ہونے کا پروگرام بنالیا تھا۔ فرہاد پیٹ کا ہلکا تھا، وہ مجھ سے وعدہ کرتا تھا کہ ہم دونوں میں جو باتیں ہو رہی ہیں وہ کسی تیسرے شخص کو بتائیں چلے گی مگر وہ کسی تیسرے کو ضرور بات بتا کر اپنا پیٹ ہلکا کر لیتا تھا۔ میری اور فرہاد کی دوستی فرہاد کی والدہ کو پسند نہیں تھی۔ اس لیے وہ فرہاد کو میرے خلاف بھرتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں کسی اچھے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی ہوں میرا کردار بھی مشکوک ہے، میرے خلاف بہت کچھ بھرنے کے باوجود فرہاد مجھ سے دور ہونا نہیں چاہتا تھا، میں اس کے حواس پر بری طرح سے چھا چکی تھی۔ گھر میں میری مخالفت کے باوجود وہ مجھے اپنانا چاہتا تھا۔ میری کچھ دار ہاتوں نے اسے میرا دیوانہ کہے ہوئے تھا اور میں اس دیوانگی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

ایک دن گھروالوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود فرہاد

علی بارہ لاکھ روپے لے کر میرے پاس آ گیا، کاشف نے فرہاد علی کو مو بائل پر کال کر کے بتا دیا تھا کہ ہم دونوں کے ویزے آگئے ہیں آسٹریلیا جانے کی تیاری رکھو۔ فرہاد بہت خوش تھا۔ اسے آسٹریلیا جانے کی بڑی خوشی تھی۔

میں ابھی کینٹین میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ استاد پیارے اپنی تربیگ میں میرے پاس چلے آئے۔

”خلیل جبار تمہاری رپورٹنگ بہت اچھی جا رہی ہے۔ لوگ تم سے جلیس ہو رہے ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، ابھی جتنی خبریں تمہارے پاس ہوتی ہیں وہ کسی کے پاس بھی نہیں ہوتی ہیں۔“

”یہ آپ کی بات درست ہے کہ میرے پاس خبریں زیادہ ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صبح ہی صبح آجاتا ہوں اور تمہاری کورٹ کے بند ہونے پر ہی جاتا ہوں۔ اس لیے کورٹ کی کوئی خبر چھپ نہیں سکتی۔“ میں نے کہا۔

”جتنی محنت تم کرتے ہو اتنی محنت کوئی نہیں کرتا مجھے تم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں تم ایک دن ضرور نام پیدا کرو گے۔“

”میرے پاس چائے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ چائے کا ذکر کہاں سے آ گیا ہے۔“ استاد پیارے بولے۔

”یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہیں چائے پینے کے لیے آپ میری تعریف تو نہیں کر رہے ہو۔“

”استاد پیارے کو ایک کپ چائے پلا بھی دو گے تو کیا ہو جائے گا۔ کینٹین والے نے ویسے بھی وکیل کے لیے چائے کا کپ تین روپے اور صحافیوں کے لیے پانچ روپے کا کپ کیا ہوا ہے۔“

”پانچ روپے میں وہ ایک کیتلی بھی دے دیتا ہے جس میں دو کپ آسانی سے بن جاتے ہیں۔“ میں نے استاد پیارے کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو پانچ روپے کے کئی بسکٹ بھی آ جائیں گے۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”لیکن میرے پاس دس روپے نہیں ہیں آپ تو جانتے

پورے مہینے قرآن شریف کی تلاوت کراتی ہیں۔ قرآن شریف ختم ہونے پر نیا جوڑا اور کچھ رقم بھی دے دیتی ہیں۔ عید پر وہ رقم ہمارے کام آ جاتی ہے۔ اخبار سے ہمیں کیا ملتا ہے ہزار روپے مہینہ۔“ رفاقت نے کہا۔
”بس ہزار روپے مہینہ یہ بڑی زیادتی ہے تمہارے ساتھ۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”اچھا میں چلتا ہوں یہ اخبار مختار کار کے آفس میں پہنچاتا ہے ان کا اشتہار اخبار میں لگا ہے۔“ رفاقت کو یاد آنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ کیا چیز ہے بھئی؟“ استاد پیارے نے رفاقت کے جانے پر میری طرف مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہ حضرت ہمارے ساتھ گورنمنٹ ریس بزیل پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے، مقامی اخبار روزنامہ بشارت میں کتابت کرتے تھے اب کمپیوٹر کا دور آنے پر دفتر میں چرچی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ اسکول کے زمانے سے بہت سیدھے ہیں۔“

”ہاں بھی ان کی گفتگو کرنے کے انداز سے ہی پتا چل گیا ہے۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”ان کے دفتر میں رفاقت کا بھولے پن کا ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا وہ کیا لطیفہ ہے؟“

”رفاقت جب کتابت کرتا تھا ایک دن اسے جو کام دیا گیا تھا وہ کام رفاقت بڑی سستی سے کر رہا تھا۔ اخبار کے مالک مشرف رضا جعفری نے رفاقت کے پاس جا کر دیکھا کہ جو کام اسے پانچ بجے تک کر لینا چاہیے وہ نہیں کر پایا ہے اس لیے وہ سخت غصے میں آ گئے اور غصے سے بولے۔
”رفاقت پانچ بج رہے ہیں اور تم نے ابھی تک کام نہیں کیا ہے۔“

رفاقت نے جواب دینے یا شرمندہ ہونے کی بجائے بڑے بھولے پن سے پہلے مشرف جعفری کو دیکھا اور پھر اپنی گھڑی کو دیکھا اور پھر بولا۔ پانچ بجتے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔“

مشرف جعفری کو ان کے بھولے پن پر بڑے زور کی ہنسی آ گئی وہ اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے جب پانچ بجے کے بعد پورٹرا اور سب ایڈیٹر

ہی ہیں میں صبح گھر سے دس روپے جیب میں رکھ کر چلتا ہوں کورٹ کے اشتہار مل جانے پر اپنی جیب گرم ہو جاتی ہے ورنہ خالی جیب ہی گھر جانا پڑتا ہے۔ آج دس روپے کے میں نے دو اخبار خرید لیے ہیں وکیل صاحب کا اخبار میں اشتہار آیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس محنت اشتہار کو بھی آج ہی آنا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں میں چائے کا انتظام کر لوں گا، بس کوئی جاننے والا نظر آ جائے۔“ استاد پیارے نے کینٹین میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

”تحلیل صاحب کورٹ میں بہاریں آرہی ہیں۔“ رفاقت نے میرے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اس نے یہ بات اتنی زور سے کہی تھی کہ استاد پیارے نے بھی سنی لی۔

”کورٹ میں بہاریں میاں ہم نے اپنی جوانی میں بہارو پھول برساؤ فلم دیکھی تھی کورٹ میں بہاریں یہ کیا نام ہوا۔“ استاد پیارے چونکے۔

”کورٹ میں بہاریں سے رفاقت کی مراد ہے کہ کورٹ میں مانگنے والی فقیریاں بہت نظر آرہی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”مسٹر رفاقت تم ان فقیریوں پر کوئی غلط نگاہ مت ڈالنا۔“

”کک..... کک..... کیوں؟“

”یہ فقیریاں اس کورٹ کا حصہ ہیں دن میں خیرات مانگتی ہیں اور شام میں یہ اور ان کے مرد کورٹ کے باہر ریڈیو پاکستان کی فٹ ہاتھ پر موڑے اور جتی بتاتے ہیں۔“

”رفاقت بڑے شریف آدمی ہیں ان کی شرافت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہ رمضان کے مہینے میں بازار حسن میں رہنے والی طوائفوں کے گھر پر قرآن شریف کی تلاوت کرنے روز صبح صبح جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ استاد پیارے کو ایک جھٹکا لگا۔

”ہاں ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ بات درست ہے ہم قرآن شریف پڑھنے جاتے ہیں جس طوائف کو قرآن شریف پڑھنا نہیں آتا وہ مختلف لوگوں کی خدمات لے کر

آئے تو مشرف جعفری نے ہنستے ہوئے رفاقت کی بات بتاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو رفاقت نے ایسے کہا کہ پانچ منٹ باقی ہیں کہ جیسے یہ پانچ منٹ میں سارا کام کر لے گا۔“

”اخبارات کے دفاتر میں ایسے بھولے لوگ آ جاتے ہیں مالکان انہیں جواب دینے کی بجائے کام سے فارغ نہیں کرتے۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”رفاقت کتابت کرتے ہوئے غلطیاں بہت کرتا تھا جب مالک اس سے کہتا کہ تمہاری غلطیاں بہت آ رہی ہیں

اس پر رفاقت بڑے بھولے پن سے کہتا۔

”آپ کتابت کو پڑھیں نہیں ورنہ غلطی نظر آ میں گی“ جب کتابت کو نہیں پڑھیں گے تو غلطی بھی نظر نہیں آئے گی۔“

”بہت خوب۔“ استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”صحافی برادری یہاں بیٹھی ہے اور ایک بڑی خبر کورٹ میں ان کی منتظر ہے۔“ ایک کورٹ کے چپرائی نے ہمیں دیکھ کر کہا۔

”بڑی خبر۔“ استاد پیارے چوہنگے۔

”ہماری کورٹ میں قتل کے ملزمان کو پولیس لے کر آئی ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

کورٹ میں دوسرا اور ایک عورت کو پولیس لے کر آئی تھی۔ انہیں تین دن کے ریمانڈ پر کورٹ نے پولیس کسٹڈی میں دے دیا تھا تاکہ پولیس مزید پوچھ گچھ کر سکے۔

”ان کو کس کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔“

میں نے پولیس سے پوچھا۔

”چند دن قبل فرہاد علی نامی نوجوان کا قتل ہو گیا تھا اور اس کی لاش سائٹ کے گندے نالے سے ملی تھی۔ اس کے قتل کے الزام میں ان کو گرفتار کیا گیا ہے۔ ملزمہ صائمہ اور اس کے دو ساتھی کا کاشف اور فرحان ہیں۔“

”کیا آپ نے فرہاد کو قتل کیا ہے؟“ میں نے صائمہ سے پوچھا۔

”قتل میں نے نہیں کا کاشف نے اپنے ساتھی فرحان کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ میں بلاوجہ پھنس گئی ہوں ان کے

ساتھ کی وجہ ہے۔“ صائمہ نے کہا۔

”جب تم قتل میں ملوث نہیں تو پھر پولیس نے تمہیں کیوں پکڑا ہے۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”مجھے لالچ نے پھنسا یا ہے میں کا کاشف کی باتوں میں آ گئی تھی۔ اس نے پورا یقین دلایا تھا کہ میں قتل کے

مقدمے میں نہیں پھنسون گی اور یہ فرہاد علی کا قتل ایسے کریں گے کہ کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ مگر ہوا اس کے برعکس۔

پلان کے مطابق میں نے ویزا لینے کو کا کاشف کے پاس فرہاد علی کو بھیج دیا تھا۔ میں مطمئن تھی کہ میرا کچھ نہیں بڑے گا“

کا کاشف اور فرحان نے مل کر فرہاد کو قتل کر دیا اور رات میں سائٹ کے علاقے میں کھیتوں میں دفن کرنے کو فرہاد علی کی لاش لے گئے۔ ایک چوک پر پولیس کی سخت چیکنگ چل رہی تھی۔ چیکنگ دیکھ کر دونوں ہی بوکھلا گئے اور بوکھلاہٹ

میں لاش کو گندے نالے میں پھینک دیا اور گھر چلے گئے۔

فرہاد علی کی گمشدگی پر اس کے چچا دلاور علی نے میرے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرا دی تھی۔ لاش مل جانے پر پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا اور اپنے رواجی حربوں سے سب کچھ اگلو الیا۔ پولیس نے میرے بیان کی روشنی

میں کا کاشف اور فرحان کو بھی گرفتار کر لیا اور اب ہمیں کورٹ میں ریمانڈ کے لیے لائے ہیں۔“

”تمہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ تم ایک قتل کرنے جا رہی ہو جو اچھا اقدام نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”لالچ! دولت کے لالچ میں میں نے فرہاد علی سے فیس بک پر کا کاشف کے کہنے میں آ کر دوستی کی اور کا کاشف کی حماقت سے ہی ہم تینوں قتل کے الزام میں گرفتار ہو گئے ہیں۔“ صائمہ نے بتایا۔

”کیا تمہیں اپنے اس عمل پر شرمندگی نہیں ہے۔“

استاد پیارے نے پوچھا۔

”انسانیت کا قتل کوئی اچھا فعل نہیں ہے جو کچھ ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔“ صائمہ نے کہا۔

اخبار کے لیے ہمیں اچھی خبر مل گئی تھی۔ اس لیے ہم نے مزید تفصیل معلوم کر کے اپنی رپورٹ کو مکمل کر لیا۔



ایک سودیولہ چاندکی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 13

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈیا پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزر رہے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر..... وہ خوف..... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔





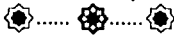
”گئے ہم سب ہم میں سے کوئی شاید ہی پاکستان پہنچ سکے، جہاز یوں میں لٹھیا بلوائی چھپے ہوئے ہیں یا اللہ خیر۔“ کسی خاتون نے واویلا کیا تھا ٹرین کی رفتار بڑھ رہی تھی۔

”یہ جسے پکار رہی تھی وہ تم تھے؟“ خاتون نے

سمت دیکھتی رہی تھیں ان کی آنکھوں میں اطمینان پھیل رہا تھا نو جوان نے اسی گیلے کپڑے کے ٹکڑے سے اس کا چہرہ پونچھا تھا۔

”بے فکر ہو جائیں عین آپ تنہا نہیں ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، معذرت چاہتے ہیں آپ کو تنہا چھوڑنا مقصد نہیں تھا ہم آپ کے ہمراہ ہی تھے ہم زیادہ تفاوت پر نہیں تھے اس ٹرین میں آپ کے ساتھ تھے آپ سے وعدہ کیا تھا آپ کو اس سفر میں تنہا نہیں چھوڑیں گے ہم نے آپ کو تنہا نہیں چھوڑا عین۔“ نو جوان یقین دلا رہا تھا خاتون فرط مسرت سے مسکرائی تھیں اور آنکھوں میں آنی نمی کو پونچھا تھا عین نے نو جوان کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا تھا نو جوان اس کا ہاتھ تھامے دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر پٹیاں رکھنے لگا تھا اس کا لہجہ اطمینان بخش تھا اور لہجہ بھرپور جیسے وہ زندگی کی نوید ہمراہ لایا تھا عین کی بے جان آنکھیں زندگی کی نوید پا کر جھپکنے لگی تھیں۔ جیسے اس نو جوان کے آجانے سے اس ڈھارس ہوئی تھی۔

”ہم بحفاظت آپ کو پاکستان لے کر جائیں عین اب منزل دور نہیں ہے ہم بہت قریب ہیں اپنی منزل کے۔“ نو جوان یقین دلا رہا تھا عین نے اطمینان سے آنکھیں پٹی تھیں اس کی آنکھوں کے کناروں سے جیسے اطمینان کے آنسو ٹوٹ کر گرے تھے جنہیں نو جوان نے پوروں پر سمیٹ لیا تھا۔



عمر نے اسے سر جھکائے بیٹھے دیکھا تھا پھر چلتا ہوا اس کے پاس آیا تھا کھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ کر اس کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے تھے خوش نمائے اسے سیر اٹھا کر دیکھا تھا عمر کی آنکھیں اطمینان دلاتی ہوئی تھیں۔

”یہ تم سمجھیے کیا آپ کو قید میں ڈال دیا گیا ہے یا آپ مصیبت میں پھنس گئی ہیں مدعا یہ ہے کہ خالدا آپ کو حیریت کے ساتھ دیکھنے کی تہنیتی ہیں وہ ہمیں چاہتیں

پوچھا تھا مگر نو جوان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر عین کا ہاتھ تھاما تھا۔

”عین آپ ٹھیک ہیں؟“ نو جوان نے پکارا تھا۔
”ت..... تے..... مو.....! ان پتھرائی آنکھوں میں حرکت ہوئی تھی بے جان پتھلیاں حرکت میں آئی تھیں، نو جوان نے اس کے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں لیا تھا۔

”ہم آپ کو کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا عین۔“ نو جوان نے مدہم لہجے میں کہا تھا عین کی آنکھوں میں زندگی کی رفق دکھائی دینے لگی تھی خاتون اور دیگر لوگوں نے اس کو حیرت سے دیکھا تھا۔
”اس بچی کی طبیعت بہت بگڑ گئی، تیز بخار سے جلتی رہی اور تمہارا نام پکارتی رہی۔ تم اس کے خاوند ہو اس تقسیم نے کتنے دل جدا کیے ہیں صد شکر قسمت نے تم دونوں کو ملا دیا۔“ خاتون نے کہا تھا نو جوان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا عین کو تھام کر اٹھا کر اس کو اپنے ساتھ لے کر توجہ سے دیکھا تھا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا یہ پانی پلا دو اس کو بڑی مشکل سے پورے ڈبے میں اب یہ اتنا سا پانی ملا تیز بخار سے جسم پتھک رہا تھا میں پٹیاں تک نہ کر سکی، تمہارا نام پکارتی رہی، اس کی پتھرائی آنکھوں میں پہلی بار زندگی دکھائی دی ہے کسی اپنے کو دیکھ کر بے چینی جانی رہتی ہے۔ بیٹھو یہاں۔“ خاتون نے نو جوان کے لیے جگہ بنائی تھی وہ سیٹ پر بیٹھ گیا اور عین کا سراپا اپنی گود میں رکھ کر اس کے منہ میں پانی کے قطرے ڈالنے لگا تھا۔

”عین ہم آپ کو کچھ ہونے نہیں دیں گے آپ فکر نہ کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ تنہا نہیں ہیں۔“ نو جوان نے کہا تھا عین کی آنکھوں سے خاموشی سے آنسو ٹوٹ کر گرے تھے ان آنکھوں میں سکوت کی جگہ سکون دکھائی دیا تھا نو جوان نے اس کے آنکھوں کے کنارے سے ایک ٹکڑا اچھاڑا تھا اور پانی میں بھگو کر عین کی پیشانی پر رکھا تھا عین کی آنکھیں اس نو جوان کی

جوان کی بیٹی کے ساتھ ہوا وہ آپ کے ساتھ ہو، ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھیں وہ اس وقت ایک صدے سے دو چار ہیں۔“ عمر نے سمجھایا تھا خوش نما کچھ نہیں بولی تھی، چپ چاپ اسے دیکھنے لگی تھی۔

عمر نے اس کے بندھے ہوئے پاؤں بھی کھول دیے تھے وہ خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا میں فرار ہو سکتی ہوں؟ ”آپ جا ہیں تو یہاں سے جاسکتی ہیں خالہ سورہی ہیں ان کی نیند گہری ہے ان کو خبر نہیں ہوگی میں کہہ دوں گا مجھے خبر نہیں میں ابھی آیا ہوں یہ لاعلمی کام آجائے گی آپ جہاں جانا چاہتی ہیں جاسکتی ہیں۔“ عمر نے مشورے کے ساتھ اجازت بھی دی تھی۔

مگر وہ جانے کیوں اٹھ نہیں سکی تھی عمر نے اسے دیکھا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا تھا اور چلا ہوا اندر کمرے میں چلا گیا تھا خوش نما تب بھی اسی طور بیٹھی رہی تھی قید اور رہائی ایک موقع پر کیسے سوالیہ نشان پر کھڑی ہو جاتی ہے جہاں کوئی مفہوم سمجھ نہیں آیا، وہ قید اور رہائی کا فرق سمجھ نہیں سکی تھی خالہ کے کھانسنے کی آواز آتی تھی۔

آواز نے خوش نما کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا وہ ابھی تھی اور خالہ کی چار پائی کے پاس آن بیٹھی تھی ان کا ہاتھ تمام کر ان کو بغور دیکھا تھا اس نے ماں کا لمس محسوس نہیں کیا تھا اکبری بیگم کا ساتھ کم رہا تھا وہ ماما کے اس گرم لمس کا احساس جیسے یادداشت میں نہیں رکھتی تھی اب خالہ کا ہاتھ تمام کر جانے کیوں وہ احساس روح میں اترتا محسوس ہوا تھا، خالہ کی آنکھ بھی کھلی تھی انہوں نے خوشنما کو بغور دیکھا تھا جیسے اس کے چہرے میں کوئی اور چہرہ دیکھ رہی ہوں، مہینا وہ ادنیٰ بیٹی کو اس کے چہرے میں دیکھ رہی تھیں، وہ نیم پاگل خاتون خوشنما کی ہمدردی کا باعث بنی تھیں خاتون نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے یکدم خوش نما کا ہاتھ دبوا تھا۔

”تم بھاگ رہی ہو؟“ انہوں نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

”تم نے ساری رسیاں کھول لیں بھاگ جانا چاہتی تھیں نا تم۔“ وہ سختی سے پوچھ رہی تھیں خوش نما نے سر آہستہ سے نفی میں ہلایا تھا اور دہم لہجے میں بولی تھی۔

”نہیں میں بھاگ نہیں رہی تھی، میں آپ کے سامنے ہوں بھاگنا ہوتا تو دروازے کی سمت جاتی آپ کی چار پائی کی سمت نہیں، یہ خوشنما نے جتنا تھا خاتون یکدم ٹھنک کر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”ہاں تم نہیں بھاگیں مگر کیوں، تم ڈر گئی ہونا؟“ وہ اسے پوری آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی تھیں۔ خوشنما کچھ نہیں بولی تھیں۔

”باہر کتنے بھیڑیے ہیں، یہ بات سمجھ آگئی تمہیں نوج کھائیں گے نا تجھے، اب سچائی پتا چل گئی نا؟“ خالہ نے جواز ڈھونڈا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی، تب خالہ نے اس کا چہرہ چھوا تھا۔

”ہاجرہ، تو نا سمجھ ہے میری بیٹی یہ لوگ گدہ کی طرح نوچتے ہیں سارا ماس کھا لیتے ہیں اور ہڈیاں بھی نہیں چھوڑتے تجھے ان کے ہاتھوں بے عزت ہوتے نہیں دیکھ سکتی تو نے عزت سنبھال کر رکھی ہے تو عزت سے جی لے بیاہ کر لے عمر سے میں برابر والے مولوی صاحب سے بات کرتی ہوں کل شام ہی نکاح پر دھوا دیتی ہوں دو بول سے زندگی بدل جاتی ہے میری بیٹی، عزت سے جی لے عزت کی زندگی آسائش کے بنا بھی آرام سے گزر جاتی ہے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لو تو روح پر سکون رہتی ہے کیونکہ عزت زیادہ اہم ہے میری بیٹی اور عمر چاہے تجھے آسائش سے بھری زندگی نہ دے سکے مگر تجھے عزت ضرور دے گا عمر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے ایسا پر قسمت والوں کو ملتا ہے میری بیٹی کی قسمت اچھی نہیں تھی وہ عمر کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکی وہ اپنی زندگی جی ہی نہیں پائی مگر میں چاہتی ہوں کسی اور لڑکی کے ساتھ ویسا نہ ہو جو ہاجرہ کے ساتھ

تھے پاکستان جانا ہے تو نئی زندگی میں قدم رکھ کر پاکستان جا مجھے تسلی ہوگی کہ تیرے ساتھ کوئی ہے، عمر بہت نیک بچہ ہے اگر تھے پاکستان جا کر ہی زندگی گزارنا ہے تو وہ تھے پاکستان لے جائے گا مگر یہ سب ہونے دے میری بچی ان بوڑھی آنکھوں کا کوئی اعتبار نہیں چراغ سحری کی مانند ہے اس بیمار ماں کی زندگی جانے کب یہ لو بھی بجھ جائے۔ اطمینان سے مرنے دے اس بوڑھی ماں کو۔“ خالہ نے کہا تھا اور وہ لب بلیج کر رہ گئی تھی، عمر دروازہ کھول کر باہر آیا تھا اسے ایک نگاہ نادانستگی میں دیکھا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ نگاہ بدل کر ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگی تھی خوشنما ہاجرہ بننے جا رہی تھی ہاجرہ کی زندگی ہاجرہ کے خواب خالہ نے اسے ہاجرہ کی طرح سنوار دیا تھا اور یہ زندگی کیسے مینی بدل رہی تھی، کیا یہ رنگ زندگی اسے دینا چاہتی تھی کیا ہی ان لکیروں میں درج تھا؟ اوہ اس زندگی سے بھاگی تھی جو بدنامی کی زندگی تھی، اس نے کوٹھے پر شعور سنبھالا تھا کوٹھے کی زندگی دیکھی تھی امرا کی اولاد ہو کر بھی وہ کوٹھے کی زینت بنی تھی اور ایک طوائف کی زندگی جیتی رہی تھی اللہ اس سے کیا چاہتا تھا؟ کیا اس کی عبادتوں اور ریاضتوں کا کوئی صلہ تھا یہ؟ کیا اس کے رب نے اس کی شب بھر کی عبادتوں کے عوض اسے یہ عزت اور توقیر کی زندگی نوازی تھی کیا عمر اس کی دعاؤں کا صلہ تھا۔

اور نواب زادہ جلال الدین پٹوئی؟ اس کی سوچ تھم کر رہ گئی تھی آج کتنے دنوں بعد یہ خیال دل کے پاس سے ہو کر گزرا تھا سوچیں اس قدر ابھی ہوئی اور ابہام کا شکار تھیں کہ وہ کسی اور طرف نہ دیکھ سکی تھی نہ سوچ سکی تھی اب دھیان آیا تھا تو یہ ذکر کچھ عجیب اور پرانا سا لگا تھا۔ وہ جس کیفیت میں کونٹھا چھوڑ کر بھاگی تھی کوئی اور خیال ذہن میں نہ آیا تھا اب دھیان آیا تھا کہ ایک بار اگر نواب زادے سے بات کر لی تو شاید زندگی اس سچ پر نہ ہوتی، مگر عمر کی سمت دیکھتے ہوئے

ہوا، تیرے چہرے میں ہاجرہ کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔“ خالہ کی آنکھیں بجھنے لگی تھیں اور جانے کیا سوچ کر خوش نما نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”تو نکاح کرنے کو تیار ہے نا میری بچی۔“ خالہ نے اس کا چہرہ تھام کر اس آس سے پوچھا تھا اور خوش نما نے سر اٹھکی سے اثبات میں ہلا دیا تھا کمرے کے دروازے پر کھڑے عمر پر نگاہ پڑی تھی اور وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی، دنیا کی صعوبتوں کو سہتے ہوئے اس نے مردم شناسی تو سیکھ لی تھی کہ اب کبھی میں آتا تھا کہ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا اتنا تو معلوم تھا کہ کوئی اسے بیٹی جیسا مان دے رہا ہے کوئی بیٹی جیسی عزت دینا چاہتا ہے اور اسے مطمئن اور خوش دیکھنا چاہتا ہے اس کا ہاتھ محفوظ ہاتھوں میں دے کر اس کا مداوا کرنا چاہتا ہے جو گناہ سرزد بھی نہیں ہوا مگر خالہ نے اپنی ہاجرہ کو جس طرح مرتے دیکھا تھا وہ اسے اس موت کے ہاتھوں مرتا نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔

قسمت اگر ایک بہاؤ تھا تو وہ اس کے ہاتھوں خود کو بہنے سے نہیں روک سکتی تھی، شاید ایسا ہی ہونا لکھا تھا خالہ نے اسے سرخ گوٹے کنارے والا جوڑا نکال کر دیا تھا اور پہننے کو کہا تھا۔

”میں کل تک کا انتظار بھی نہیں کر سکتی میری سانس کا کیا اعتبار کل کا دن دیکھوں بھی کہ نہ دیکھوں، تو جوڑا پہن میں ساتھ والے گھر جا کر مولوی صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔“ خالہ نے کہا تھا۔

وہ کچھ بولنے لگی تھی جب خالہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا تھا۔

”مجھ پر اعتبار کیا ہے تو یقین رکھ ہاجرہ، میں تیرا برا نہیں چاہ سکتی، کوئی ماں اتنا سخت جگر نہیں رکھتی میں بس تجھے محفوظ ہاتھوں میں سوچنا چاہتی ہوں۔“

”مگر خالہ۔“ خوش نما نے جانے کیا بولنا چاہا تھا۔

”دیکھ ہاجرہ خاطر جمع رکھ، یقین رکھ قسمت کا سب سے بہترین فیصلہ ہو گا یہ دعائیں دے گی کل کو مجھے اگر

ایہہ تان ٹھک جگت دے تھیو، لاون جال
چو فیرو

کرم شرع دے دھرم بناون سنگل پاون پیرہن
ذات مذہب ایہہ عشق نہ بھجدا، عشق شرع دا

دیری
ندیوں پار ملک بجن دا، لہر سو بھنے گھیری
ستگور بیڑی پھر کھلوتے، تیں کیوں لائی دیری
بالہا شاہ، تینوں ملسی، دل نوں دے دلیری
پتیم پاس، تے ٹولنا کسی نوں، بھل کیوں شکر
دو پہری

آئینے میں کسی کی آنکھیں دکھائی دیتی بے قرار
کرنے لگی تھیں۔

”الوداع نواب زادہ جلال دین محبت کا وہ باب
تمام ہوا، ہم مان چکے ہیں کہ محبت وہی تھی اور زندگی یہی
قسمت میں لکھا نہ تھا اور دنیا داری ضروری تھی سوہم نے
مان لیا سو آپ اور آپ کی محبت فراموش ہوئی چاہتی
ہے الوداع نواب زادہ جلال الدین۔“ خوش نمائے
آنکھیں بند کی تھیں، اور محبت کے اس باب کو تمام کر دیا
تھا۔

جلال کا چہرہ یادداشت سے نکل کر شکوہ کرتا دکھائی
دیا تھا اور پھر مدہم ہوا تھا خوش نمائے یہ آخری تذکرہ
خود سے کر کے ماضی کا ہر باب بند کر دیا تھا اور زندگی
کے نئے راستوں پر چلنے کو تیار تھی۔

نابندھن..... نئی زندگی اور.....

حکمر یہ کیسا نیا رشتہ تھا جس میں ڈھول باجے یا جشن
کا سماں تھا جس میں گیت نہیں تھے سہاگ کے نغے
نہیں تھے دعائیں نہیں تھیں کیا ہر لڑکی کی شادی ایسی
ہوتی ہے، یا طوائف کے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے، مگر
ایک طوائف کی زندگی جیتے ہوئے اس نے بھی نکاح
کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا بھی تو جلال کا خیال بھی
سرسری سا رہا تھا دل میں کہیں اور دانستہ اس ذکر کو
دہرایا نہیں تھا ان بند آنکھوں سے ملال آنسوؤں کی

نواب زادے کا خیال جانے کیوں پرایا سا لگا تھا جیسے
وہ اپنے ساتھ ایماندار نہ رہی تھی، جیسے عمر اس کی ساری
سوچیں پڑھ رہا تھا وہ نگاہ چراگئی تھی۔

”نواب زادہ، محبت صرف ایک چھت کے نیچے
رہنا اور ہاتھ تھام کر چلنا نہیں محبت اس احساس سے سوا
ہے اور کبھی کبھی محبت کو مصلحت کے رنگ میں بھی رنگنا
پڑتا ہے سوہم اپنی سوچوں کے دروازے آپ پر بند کر
رہے ہیں وہ حاکم خاتون تھی جن کو آپ سے عشق تھا
اور جس عشق کا دم آپ بھی بھرتے تھے وہ عشق تمام ہوا
حاکم خاتون نہیں رہی خوشنما بھی مر گئی اور اب یہاں
ہاجرہ ہے بس ہاجرہ نواب زادے کے ذکر سے واقف
نہیں اور نواب زادہ کسی ہاجرہ کو نہیں جانتا نواب زادہ
کی زندگی یوں بھی گچی محبت کی راہ پر گامزن تھی اور وہ
محبت حاکم خاتون کی محبت سے کئی گنا زیادہ زوردار تھی
آپ کو آپ کی محبت نصیب ہو نواب زادے ہم آپ
کے لیے دعا گو ہیں خوش نما اب ہاجرہ کا پیکر ہے اور
ہاجرہ عمر کی ہونے جا رہی ہے اس ذکر کے علاوہ ہمیں
کوئی اور مدعا یاد نہیں ہماری یادداشت سکڑ رہی ہے اور
اس سکڑتی ہوئی یاد میں آپ کا ذکر دھندلا سا گیا ہے
وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے نواب زادہ جلال الدین
چلو، ہم الگ الگ دنیاؤں کا حصہ بن کر سانس لیتے ہیں
اور فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی بس یہی تھی اور قسمتوں
میں یہی درج تھا اس سے آگے کے تمام ذکر اور
کہانیاں یادداشت کا حصہ نہیں اور تمام ذکر پرانے ہیں
جس کے اسلوب نا سمجھ میں آنے والے ہیں، سو بھول
جانا مناسب ہے کہ یاد رکھنے کو کچھ ہمراہ نہیں۔“ ہاجرہ
نے گہری سانس لی تھی اور آئینے میں خود کو دیکھا تھا۔

آس یا راسارے میری

میری جاں دکھاں نے گھیری

اندروں دھوڑا ہو یا خبر نہ پیندی تیری

سنجی، بن وچ مٹی سائیاں، چور شنگ نے گھیری

ملاں قاضی راہ بتاؤں، دین بھرم دے پھیرے

اپنی بقا کی جنگ لڑنا پڑ رہی تھی اور آج وہ کانگریس کی حمایت پر تنا کھڑا ہے اس سے بہتر تھا کہ وہ اور اس کا خاندان پاکستان چلے جاتے تاکہ آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتے اس قانونی نوٹس کا مطلب جانتے ہیں نا آپ مرزا صاحب زمانے کی انگلیاں آپ کی طرف انہیں گی اور بنی بنائی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔“ قریبی دوست اقبال نے سمجھایا تھا مرزا صاحب غصے سے بیچ و تاب کھا کر رہ گئے تھے۔

”اس لڑکے کو جہنم رسید کرنا ہوگا ہم اسے برداشت نہیں کر سکیں گے، مرزا سراج الدولہ کی عزت سے کھیلنا معمولی بات نہیں یہ بات اس کل کے لوٹے کو سمجھ میں آ جائے گی رسی چل گئی مگر بل نہیں گئے نوابی چلی گئی مگر تیمور اب بھی پھنکار والے ہیں سانپ کا سر چکنا ہمیں بھی خوب آتا ہے، مرزا سراج الدولہ کوئی معمولی انسان نہیں ہیں ایسے داؤ بیچ کھیلنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ناکوں سے نہ چوادیے تو نام بدل دینا۔ موصوف بچوں والے کھیل کھیل رہے ہیں ان کو خبر نہیں سراج الدولہ ایسے کھیل اپنے بچپن سے کھیل رہا ہے۔“ وہ غصے سے بیچ و تاب کھا رہے تھے۔

”حیرت تو ہے مرزا صاحب نوابی اطوار ختم نہیں ہوئے نواب صاحب کے جانے کے بعد بھی موصوف کو پوری حمایت حاصل ہے، حکمت صاحب نواب صاحب کے وفادار دوستوں میں شمار ہو رہے ہیں اب کیا جنت میں جا کر منہ دکھانا ہے ان کو جو وفاداریوں کا ثبوت دے رہے ہیں ایسے لوگ بھی شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہوتے ہیں شاہ جنت رسید ہو گئے اپنے حواری چھوڑ گئے انہوں نے ہی اکسایا ہوگا نواب زادے کو ورنہ اس کل کے بچے میں اتنا دم کہاں جمعہ جعاً ٹھہ دن ہوئے کانگریس کی شمولیت سنبھالے آپسے تیمور دون کی شمولیت سے نہیں آتے یہ حکمت میاں کی مہارت ہے ان کے پیچھے وہ اپنا تجربہ بروئے کار لا رہے ہیں قانون کے شکنجے میں جکڑنا چاہتے ہیں آپ کو

صورت رواں تھا اور عمر جو وہاں سے گزر رہا تھا وہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

جلال کسی خاص کام سے نکل رہا تھا جب فتح النساء وہاں آئی تھی۔
”ہمیں آپ سے بات کرنا ہے جلال۔“ فتح نے روکنا چاہا مگر جلال نے رک کر بے تاثر انداز میں دیکھا تھا۔

”ابھی بات نہیں ہو سکتی، ہم جلدی میں ہیں جو بھی مدعا ہے اسے بعد کے لیے اٹھا رکھیے، ہم فی الحال آپ کو وقت نہیں دے سکیں گے۔“ جلال نے کہا تھا اور فتح النساء اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”ہم آپ سے صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ آپ اس رشتے کو توڑنے سے قبل ایک بار سوچ لیں اور.....!“ فتح النساء بات مکمل کرنا چاہتی جب نواب زادہ نے انہیں روک دیا تھا۔

”فی الحال اس سلسلے میں بات نہیں ہو پائے گی فتح النساء، ہم معذرت خواہ ہیں، ہم آپ سے اس متعلق ضرور بات کریں گے، ہمیں ٹھوڑا وقت دیجیے۔“ جلال نے غیبت سے انہیں دیکھا تھا گویا انہیں تاخیر ہو رہی تھی اور فتح النساء نے ان کی آنکھوں کا تعرض جانتے ہوئے سر ہلا دیا تھا وہ بیٹھے تھے اور آگے بڑھ گئے تھے فتح النساء ان کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

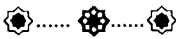
”کیا اس لڑکے کی اتنی ہمت کہ ہمیں للکار رہا ہے؟“ مرزا سراج الدولہ ہاتھ میں پکڑے نوٹس کو دیکھ کر غصے سے دھاڑے تھے۔

”چوٹی کے بھی پر کل آئے مرزا صاحب مگر یہ اس لڑکے کی سمت سے زیادہ حکمت صاحب کی شہ ہے وہ لڑکا کیا اس کی اوقات کیا نواب صاحب کی ہلاکت کے بعد اس میں اتنا دم نہیں رہا تھا ابھی کل تک لاچار سا وکیلوں کی منتیں کر رہا تھا کہ کوئی اس کی مدد کرے اسے

میں ہے آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کریں خاموشی سے۔“ اقبال صاحب نے رسائیت سے مشورہ دیا تھا مرزا صاحب بھڑک اٹھے تھے۔

”اب ہم کیا اس کل کے لوٹے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں، ہم نے تو ان کے والد محترم کو ناکوں چنے چوہا دیے تھے یہ کسی کھیت کی مول ہیں جلد ان کو خیر ہو جائے گی انہوں نے کس کو لکارا ہے جس میدان میں یہ اترے ہیں ہم اس میدان کے پرانے اور گھاگ کھلاڑی ہیں جلد بتادیں گے انہیں۔“ سراج صاحب سلگ رہے تھے جلال نے ان کو قانونی نوٹس کر کے بتا دیا تھا کہ وہ کیا کر سکتے ہیں انہوں نے اپنے والدین کے قتل کا مقدمہ ان پر ڈالا تھا اور ان کی سازشوں کو جواز بنایا تھا دوسرا انہوں نے اس ہتک عزت کا دعویٰ کیا تھا جو انہوں نے نواب صاحب پر کیچڑا تھا لاکھ کچھ النساء ان کی بیٹی ہے اس کا مقدمہ جلال نے ابھی کیا تھا اور مرزا صاحب آپ سے باہر ہو گئے تھے۔

”اس لڑکے کے چودہ طبق روشن نہ کر دیے تو پھر کہنا یاد رکھے گا کہ کس پر مقدمہ کیا تھا دیکھ لوں گا اس لوٹے کو اور ساتھ اس کے حمایتی حکمت بہادر یار جنگ کو بھی دونوں کہاں کے نور ماہیں پتا چل جائے گا ان کو۔“ سراج الدولہ پھنکارے تھے اقبال صاحب ان کو تسلی دینے کو ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ان کو تسلی دینے لگے تھے۔



بخار کچھ کم ہوا تھا خاتون نے عین کا ماتھا چھو کر دیکھا تھا۔

”اللہ تیرا شکر ہے بچی کا بخار کم ہے ورنہ ہم تو بہت پریشان ہو گئے تھے تمہاری آمد سے جیسے اسے راحت ملی ہے۔“ خاتون نے نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا عین پر سکون انداز میں آنکھیں میچے سو رہی تھیں، نوجوان نے جواباً خاموشی سے عین کو دیکھا تھا اور ان کی

کسی بھی طرح نواب زادہ سے بات کر کے اس کیس کو یہیں ختم کریں اگر یہ باقاعدہ کورٹ میں چلا گیا تو عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔“ اقبال صاحب نے حمایت میں کہا تھا۔ سراج صاحب نے سلکتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

”چھٹی کا دودھ یا دودلا دوں گا ان موصوف کو ان کی اتنی مجال مرزا سراج الدولہ پر مقدمہ کرے، ہم لیسرو یتیم جان کر ہمدردی کر رہے تھے ان کو بچہ سمجھ رہے تھے مگر وہ خود کو زیادہ تیس مار خان سمجھنے لگے ہیں تو ان سے دودھ پاتھ کرنا ہی پڑیں گے خدا پناہ ہم پر اپنے والدین کے قتل کا مقدمہ ڈال دیا اور اس ہتک عزت کا بھی جو ہم نے بھی کی ہی نہیں سراج الدولہ کو اتنی آسان کھیر سمجھ لینا اس لوٹے کو دکھا دیں گے ہم بھی کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتے ہیں دانت کھٹے نہ کر دیے تو ہمارا نام بدل دینا ان کو سبق سکھا کر رہیں گے۔“ سراج صاحب غصے سے دھاڑے تھے اقبال صاحب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ان کو دلا سے دیا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

”جوش سے نہیں سراج صاحب ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ آج کا بچا آپ کو آنکھیں دکھا رہا ہے جو ان معاملات کو سمجھ بوجھ سے سلجھانے کی ضرورت ہے کہیں وہ مثل نہ بچ ہو جائے کہ ”ماروں گھٹنا پھوٹے آکھ۔“ آپ کا بہت نام اور مقام ہے معاشرے میں آج کا لوٹا آپ پر انگلی اٹھا دے گا تو عزت دو کوڑی کی نہیں رہے گی، جاٹ مراتب جانیے جب تیر ہوئیں ہو جائے آپ کو بہت سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوگی مرزا صاحب اپنے وکیل کو بلوایئے۔ ان سے سکون سے بات کیجیے بھس میں ڈال چنگاری جما لو دور کھڑی والا معاملہ نہ کریں آپ کا کانگریس میں عرصہ دراز سے نام ہے اس بچے کو اس طرح جانیے کوئی مینڈک سمندر میں چھلانگ لگا کر پھدک رہا ہے کہ اس نے کنویں کو خیر باد کہہ دیا اور اب ساری دنیا اس کی مٹھی

پیشانی پر آتے بال ہٹا کر ان کا آچل سر پر جمایا تھا۔

”کتنا عرصہ ہوا تمہاری شادی کو، ایسی محبت نہ دیکھی نہ سنی۔“ خاتون نے متاثر ہوتے ہوئے کہا تھا مگر نوجوان نے ایک لفظ نہ کہا تھا وہ خاموشی سے عین کو دیکھتا رہا تھا ٹرین اپنی رفتار سے چلتی رہی تھی۔



کھوہ وچ پانی

ماں میری رانی

پیو میرا راجہ

پٹھہ کھوڑا تازہ

چاندی دیاں پوڑیاں

سونے داد وازہ آل مال ہو یا تھا مال

دور خیالوں سے آتی آواز نے خوش نما کے دامن کو پکڑا تھا محلے کی عورتیں لڑکیاں جانے کیسے اکٹھا ہو گئی تھیں ان کے گانے کی آوازیں خوش نما کے کانوں میں پڑ رہی تھیں وہ ذوق و شوق سے گارہی تھیں۔

جے تو سپاہیاں گیا جنگ وچ

لا کے مینوں جھورا

برہوں ہڈنوں ایوں کھا جاؤ

جیو چھو لپاں نوڈھورا

کیا یہ خوش منانے کا وقت تھا کیسا رابطہ جڑ رہا تھا وہ حیران اور سراسیمہ سی بیٹھی تھی جیسے سانس رکی کسی گلی تھی اور وہ ہلک جھپکنا بھول گئی تھی۔

چچر ادا مہینہ

پانی دیواں شرافتدی نوں

حال وی کی آکھاں

حال وی کی آکھاں

منہ دے مٹھے دل دے کھوٹے نوں

لڑکیاں جیسے عمر کو چھیڑنے لگی تھیں ہنسی مذاق ڈھولک کی تھاپ، یہ کیا تھا اس اہتمام کے معنی کیا تھے۔

میرے داج دیے کڑا ہے
سیس شکر کیتا دی آئی اے

تے رل کے کھائیے

اس گڈی آئیں بابلا جھڑی دھیاں دے دیس نوں

جاوے

ہیڑے اتے بہہ جا بابلا تینوں سہریاں دا حال

سناواں

خواتین سر سے راگ لگا رہی تھیں ڈھولک کی

تھاپ ماحول میں گونجتے ہوئے ایک خوشی کا سماں

باندھ رہی تھی۔

چھند پراگے آئے جائے چھند پراگے کھیرا

دھی تہاڑی اے داں رکھینا جیو مند ری وچ ہیرا

اس نے سر اٹھا کر نگاہ کی تھی تو ماحول ساکت تھا اور

صحن خالی اس کا وہم تھا کیا یا کوئی واقعی سہاگ کے

گیت گارہا تھا؟

ہا بریں برسیں کشن گیتا تے کھٹ کے لیا نا فیتہ

ن عشمے نے ڈنگ مارا کڑی سب دا بہانہ کیتا

عورتیں ہنس رہی تھیں ڈھولک کی آواز ماحول کو گھیر

رہی تھی۔

نیلی گھوڑی دے وکیلا تیری

جے پہلی پیش ہار چھٹ جائے

وگدی اے رلوی ماہی وے وچ دو بھلے پیلے ڈھولا

کیسا ماحول بن رہا تھا مگر کوئی دکھائی کیوں نہیں

دے رہا تھا یہاں کے مہمان کہاں تھے ان کی آواز

ماحول میں رچی بسی تھیں تو وہ خود کہاں غائب تھے۔

آسائیں ال پھردی

تیری میری اک جنڈری خواہاں وچ نت مل دی

اور اس ماحول میں یکدم خاموشی چھانے سے

اکبری بیگم کی آواز اس کے گرد گونجنے لگی تھی۔

الڑبلا ہاؤے دا ماوا اکنک لیا دے گا

بادی بہ کے چھٹے گی ماں پونیاں وٹے گی

بادی من پکاوے گی باوا بیٹھا کھاوے گا

بھاگنے پر اکسارہا تھا وہ چلتے ہوئے داخلی دروازے تک گیا تھا اور جا کر دروازہ مھول دیا تھا اور خوش نما کی سست دیکھا تھا اس کی آنکھیں واضح طور پر جتا رہی تھیں کہ آنکھیں اور فوراً اور بھالیں مگر جانے کیا ہوا تھا کہ خوش نما انھیں نہیں پائی تھی عمر اسے منتظر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔



”نام و مقام بنانے کے لیے تم جو اچھے، جھکنڈے بنارہے ہو یہ کام نہیں آئیں گے میاں جاؤ منہ دھو کر آؤ ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تمہارے ہم سے نکر لینا آپ کو بہت مہنگا پڑ سکتا ہے اس نوابی کا ٹونا پھوٹا تاج اٹھا کر ایک طرف پٹخ دیں نواب گئے اور نوابی بھی گئی اب وہ نوابی صرف نام کی رہ گئی ہے سو خواب سے جاگ جائیے سیدھے سے مقدمہ واپس لیجیے ورنہ آپ ہمیں جانتے ہیں آپ کے والد محترم پرانے دوست ہیں سو بچہ سمجھ کر لحاظ کر رہے ہیں آپ کا اس کو غنیمت جانے ورنہ ہم سے برا کوئی نہیں دشمنوں کے دانت ایسے کھٹے کرتے ہیں کہ وہ یاد کرتے رہ جاتے ہیں آپ بچے ہیں سو پالنے میں جا کر کھیلے بڑوں کے کام بڑوں کے لیے رہنے دیجیے شاہاں۔ یہ کیس واپس لیں ہم اپنی عزت پر ایسا کوئی کچڑ برداشت نہیں کریں گے اور اگر اس کچڑ کے چھینے ہم پر آئے تو ہم آپ کو بھی نہیں بخشیں گے مت بھولیے کہ نواب زادی پاکستان روانہ ہوئی ہیں اور ہمارے صاحبزادے ان کا سہاگ بننے جارہے ہیں ایسا نہ ہو آپ کی حماقتوں کی سزا آپ کی ہمشیرہ کو جھکنڈا پڑے کرے کوئی اور بھرے کوئی والا معاملہ نہ ہو جائے کہیں۔“ وہ صاف دھمکی دیتے ہوئے مسکرائے تھے۔ جلال ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا وہ پرسکون دکھائی دیے تھے اطمینان سے اٹھتے ہوئے ان کو دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں بولے تھے۔

کا کا کھڑکھڑے گا خوش نمائے سر اٹھا کر دیکھا تھا اکبری بیگم کہیں دکھائی نہ دی تھیں اس نے اٹھ کر بے اختیار ان کو ڈھونڈنا چاہا تھا تبھی عمر سے لکرائی تھی عمر نے ان کو تھام کر گرنے سے بچایا تھا اور وہ ساکت سی ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”کیا ہوا، آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں، خالہ مولوی صاحب کو بلانے گئی ہیں آپ خیریت سے ہیں مزاج گرامی ٹھیک ہیں آپ کے؟“ وہ متشکر ہوا تھا مگر وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی، تب عمر نے اسے تھام کر بٹھایا تھا اور منگے سے پانی کا گلاس بھر لایا تھا اور خوش نما کی سست بڑھایا تھا۔ عمر اس نے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا تھا اور اسے خالی خالی آنکھوں سے دیکھا تھا تب وہ گلاس ایک طرف رکھ کر اس کے سامنے بیٹھا تھا اور توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ اس نکاح سے خوش نہیں ہیں تو اس نکاح کے منعقد ہونے کا کیا سبب رہ جاتا ہے ہم آپ کی کیفیت سمجھتے ہیں آپ تذبذب کا شکار ہیں آپ ہمیں نہیں جانتیں ہمارے نام سے واقف ہوئے کوئی ڈھائی لمحے ہوئے ہوں گے یہ رشتہ یقیناً ایک بوجھ جیسا لگ رہا ہو گا مگر خالہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی بہر حال میں چاہتا ہوں آپ یہاں سے چلی جائیں اگر آپ کو کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”فوجیوں کی ایک ٹرین کل پاکستان روانہ ہو رہی ہے آپ کا بندو بست اس ٹرین میں کر سکتا ہوں۔“ عمر نے کہا تھا پھر کچھ سوچ کر بولا تھا۔

”مگر کل تک شاید آپ انتظار نہ کر سکیں اگر آپ یہ نکاح نہیں چاہتی تو اس کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ خالہ کی واپسی سے قبل اس گھر سے نکل جائیں آپ کو یہ مشورہ ہرگز نہ دیتا مگر اس وقت کے لیے یہ ناگزیر ہے ورنہ خالہ اپنی کر کے رہیں گی۔“ وہ اسے

”مرزا صاحب جو بن پڑتا ہے کر لیجیے مگر یہ مقدمہ واپس نہیں لیا جائے گا اور یہ دھمکیاں دینا بند کیجیے آپ نواب زادہ جلال الدین پنوڑی سے مخاطب ہیں ادب و ادب ملحوظ رکھیں۔“ وہ پرسکون انداز میں گویا تھے مرزا صاحب آپ سے باہر ہو گئے تھے۔

”بہت رکھ لیا رکھ رکھاؤ اور ادب بھی ملحوظ خاطر رکھ لیے، بھاڑ میں جائے سب حد ادب کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت آپ کو بھی ہے نواب زادہ ہم آپ کے والد کے پرانے دوستوں میں سے ہیں اگر آپ نے ماضی کا یہ قصہ اٹھایا تو ہم بھی ماضی کے کئی قصے نکال لائیں گے۔ پھر مت کہیے گا کہ آپ کے مرحوم باپ کا بھی لحاظ نہیں کیا نہ خاندانی تعلقات کا اگر آپ نے یہ مقدمہ واپس نہ لیا تو پھر ہم بھی مدافع کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقہ اپنائیں گے اور سوچ لیں بات کہاں سے کہاں جاسکتی ہے۔ کیوں کہ مرزا کا دماغ جب محوم جاتا ہے تو پھر مرزا کو اپنی اولاد بھی نظر نہیں آتی، ایسا نہ ہو کہ ہم آپ کو ایسا سبق سکھائیں کہ آپ کی روح بھی کانپ جائے ہمارے قہر کو آواز نہ دیں تو بہتر ہوگا مرزا اچھوں کے ساتھ اچھا ہے سواس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے جتنی جلدی ممکن ہو اس مقدمے کو واپس لیں یا اس مقدمے کو کچھ دے دلا کر ختم کریں، عزت کی بات ہے تو اسے برابری پر جانتے ہیں۔ دونوں خاندان معمولی نہیں ہیں سو بات کو آرام سے سکون سے سمیٹ دیتے ہیں مطلع کیجیے اس مقدمے کو واپس لینے کے لیے کیا مانگتے ہیں آپ اگر بات پھیل گئی تو پھر ہم اس سکون سے بات نہیں کریں گے جنائے دے رہے ہیں۔“ مرزا صاحب پھنکارے تھے اور جلال مسکرا دیا تھا۔

”چاچا جان اتنا غصہ کیوں ابھی تو ابتدا ہے آپ نے جو کیا اس کا آدھا بھی نہیں بہت جھیلا ہے آپ کو اب جان کی نری کی وجہ سے مگر اب اور نہیں جوا آپ نے کیا اس کی سزا تو آپ کو ملے گی اور دھمکیاں کسی اور کو دینیجیے

گا آپ نواب زادہ جلال الدین کے مہمان ہیں ان کی زمین پر کھڑے ہیں سو آپ کو اس گستاخی کے لیے معاف کیا جاتا ہے ورنہ ہم گستاخ لہجہ برداشت نہیں کرتے ابا جان کی نریوں کا بہت فائدہ اٹھا چکے آپ مگر اب آپ کا سامنا جلال سے ہے اور جلال ایسے شخص کیلئے کوئی معافی نہیں رکھتا اگر اپنے ابا جان اور اہل خانہ کے خون کا حساب آپ سے نہ لیا تو ایک قرض روح پر رہ جائے گا چاچا جان سواس قرض کو اتارنا ضروری ہے سو جواب دہی تو ہوگی جرم کیا ہے تو سزا بھی ملے گی جو جال آپ نے بنا اور ہمارے خاندان کو سازش کا حصہ بنایا وہ گناہ اتنا معمولی نہیں کہ ہم آپ کو بخش دیں اور زندہ چھوڑ دیں اس مقدمے کو واپس نہیں لیا جائے گا نا ہی کوئی معافی ملے گی اس گناہ کی سزا آپ کو خیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جائے گی اور آپ یاد رکھیں گے۔“ جلال بولا تھا اور وہ ہنسنے لگے تھے۔

”اپنی غلطی پر پچھتائیں گے آپ چھوٹے نواب خون کے آنسو روئیں گے آپ مرزا سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی آپ کو۔“ وہ دھمکاتے ہوئے گھورتے ہوئے پلٹے تھے اور محل سے باہر نکلتے چلے گئے تھے جلال ان کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

”یہ ہم کیسا سن رہے ہیں جلال، آپ نے ہم سے پوچھے بنا کسی مشورے کے بنایا یہ سب کیوں کیا؟“ حکمت صاحب نے پوچھا تھا اور جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے تب حکمت صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

”جلال بنایا یہ مناسب اقدام نہیں تھا اس موقع کی مناسبت سے نہیں فی الحال آپ کو ایسا کوئی فیصلہ نہیں لینا چاہیے تھا نواب صاحب کا لکھن بھی میلا نہیں ہوا اور ہم کوئی نقصان نہیں چاہتے مرزا ان انسانوں میں سے ہیں ہم جن کی صف کو انسانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں ایسے انسانوں سے جتنی تفاوت رکھی جائے

مناسب ہے ایسے لوگوں کے لیے خاموشی بہترین جواب ہوتا ہے۔“ حکمت صاحب نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا تھا جلال نے ان کو دیکھا تھا۔



”چوبیس گھنٹے کا وقت دے آئے ہیں ان موصوف کو اگر انہوں نے کیس واپس نہیں لیا تو ہم پھر اپنا طریقہ اپنائیں گے یہ لوڈا ناک میں دم کر رہا ہے ہم سے قابل قبول نہ ہوا تو ہم انتہائی راہ بھی اختیار کریں گے مگر اس عمر میں اور اس مقام میں لوگوں کو ہنسنے کا موقع نہیں دیں گے عزت ہمیں بھی عزیز ہے میاں وہ اگر یہ بات نہیں سمجھتے تو ہاتھ میڑھے کرنا ہمیں بھی آتا ہے۔“ مرزا سراج الدولہ نے غصے سے ٹپٹپٹے ہوئے وکیل کو دیکھا تھا وکیل نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو تسلی دیتے ہوئے بیٹھنے کا کہا تھا۔

”پریشان کیوں ہوتے ہیں آپ کو یقین دلاتے ہیں وہ کل کا بچہ آپ کا کچھ بگاڑ نہ پائے گا کل ملنے جائے تو کئی ڈنڈا یادو چار کا بچہ ہمراہ لے جائیں ان موصوف کو تھماتے ہوئے کہیے کہ میاں کھیلنے کی عمر ہے جاؤ شاباش گلی میں جا کر کھیلے، بڑوں کے ساتھ ایسی شیطاناں کرنے کی کیا تک ہے؟“ وکیل نے منہ میں پان رکھتے ہوئے کہا تھا اور مسکراتے ہوئے مرزا صاحب کو دیکھا تھا جس کا رنگ فق ہوا ہوا تھا۔

”وکیل صاحب اس عمر میں عزت بچانا چاہتے ہیں ناک کٹ جائے گی ہماری اگر یہ ثابت ہو گیا کہ بلوائیوں سے حملہ ہم نے کروایا اور نواب صاحب کے خاندان کو ہم نے مروایا۔“ مرزا متفرق تھے

”ہاں تو کون گواہی دینے آئے گا۔ کیا مذاق کرتے ہو میاں وکالت جنے دے کر نہیں پڑھی ہم نے اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ کیس میں سرے سے کوئی دم نہیں مان بھی لیا جائے کتا پ اس سازش کا حصہ رہے ہیں تو کیا یہ ثابت کرنا گڈے گڑیوں کا کھیل ہے چھوٹے نواب دماغ کے کچے ہیں آپ بس جوانی کا جوش ہے اور وہ بھی دودھ کے ابال کی طرح سے جھٹ

”پچا جان میرے والدین کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ ہم ان کے قاتل کو یوں معاف کر دیں ابا جان اور دیگر اہلخانہ کی ارواح کو کیا منہ دکھائیں گے ہم تو بخشے بھی نہیں جائیں گے۔“ جلال نے کہا تھا تو حکمت صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

”ہم سمجھتے ہیں بیٹا جوان خون کس طرح جوش مارتا ہے ہمیں یہ بھی سمجھ آتا ہے مگر آپ سوچئے اس طرح آپ مرزا صاحب کو مزید مشتعل کر دیں گے وہ اس سے بھی بھیا تک اقدام کے بارے میں سوچیں گے اور میں آپ کو کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا آپ ہمارے قریبی دوست کے تحت جگر ہیں اور ہم آپ کی خیریت دل سے مطلوب چاہتے ہیں خدا را محتاط رہیے اور کوئی بھی ایسا اقدام کرنے سے قبل ہم سے مشاورت کرنا ضروری ضرور چاہیے آپ کا جوش اور ہمارا تجربہ دشمن کے دانت کھٹے کرنے میں معاون ہو سکتا ہے، نواب صاحب کی ایسی بے رحمانہ موت کا ہمیں افسوس ہے ہم آپ کا دکھ سمجھتے ہیں ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہیں آپ کا بچ جانا اللہ کا کوئی کرم ہی ہے اگر اس روز آپ بھی گھر پر ہوتے تو آپ بھی اس حادثے کا حصہ بن چکے ہوتے مگر اللہ نے خاص کرم کیا ہے کہ نواب صاحب کے وارث حیات ہیں دشمن تو ایسا بھی نہیں چاہتا تھا بہر حال آپ کو بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کی معاونت کے لیے قدم قدم آپ کا ساتھ دیں گے نواب زادہ جلال الدین مگر آپ سے ہم بہت سمجھداری اور میانہ روی کی توقع رکھتے ہیں فوری طور پر کوئی بھی قدم نہ اٹھائیں، بہت دانشمندی کی ضرورت ہے اور آپ کی سلامتی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔“

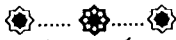
سے بیٹھ جاتا ہے۔ سوانظار کریں کہ یہ ابال کناروں تک آ کر واپسی کی سمت دوبارہ سرکنے لگا چھوٹے نواب کو اصلاح کی ضرورت ہے بزرگ بن کر صلاح دیجیے بس ان کو جتائے کہ ایسا کچھ ہے ہی نہیں بچے ہیں بھلتے کتنی دیر لگے گی۔“ وکیل صاحب پر سکون انداز میں مسکرائے تھے مرزا صاحب نے ان کو گھورا تھا۔

”ہماری جان پر بنی ہے اور آپ کو مذاق سوچ رہا ہے آپ کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ آپ ہمارا مذاق اڑائیں۔“ مرزا صاحب برہم دکھائی دیے تھے مگر وکیل صاحب مسکرا دیے تھے۔

”مذاق کہاں اڑا رہے ہیں اداہام پال رکھے ہیں بس اور کچھ نہیں ہے ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں بہر حال ایک بات سمجھا رہے ہیں ایسے مقدمے میں سالوں لگتے ہیں قاتل کو ڈھونڈنا آسان نہیں اور گواہ موجود نہیں آپ کی عقل گھاس چرنے لگی ہے یہ اہم بات آپ کی عقل میں کیوں نہیں آتی کہ وہ کل کا لونڈا گواہ کہاں سے ڈھونڈے گا بلوائی اسے پتا سرناو ہاتھ میں تھا کر گئے تھے بلوائیوں نے حملہ کیا تھا یہ سب جانتے ہیں اور بلوائیوں نے ان کے محل اور خاندان پر حملہ کیا تھا یہ بات بھی سب جانتے ہیں تو پھر مزید کیا ثابت کرنا ہے، بلوائیوں نے کتنے قتل کیے کتنی عصمت دریاں کیں، ان سب کے کتنے مقدمے درج ہوئے ہیں اب تک کتنے بلوائیوں کو سزا ملی ہے دماغ سٹھیا گیا ہے آپ کا مرزا صاحب اور کچھ نہیں ہے اس لونڈے نے خوف میں مبتلا کر دیا ہے آپ کو بس یہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی جواز نہیں ہے آپ کو نفسیاتی جنگ لڑ کر ہران چاہتا ہے تاکہ آپ خود اپنا جرم قبول کریں اور پکڑیں جائیں وہ لونڈا اتنا پیچ نہیں ہے۔“ بلوائیوں کے لیے کہیں کوئی مقدمہ کسی جگہ درج نہیں ہوا بلوائیوں کا چہرہ کوئی شناخت نہیں کرتا کتنے بلوائی تھے کون ڈھونڈے گا، لوٹ کھسوٹ میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے بس اور ان

بلوائیوں نے بس یہی کیا عدالت میں کھلی اڑے گی ان موصوف کی ہنسیں گے سب ایسا مقدمہ کہیں درج ہی نہیں آپ کس بنا پر دم سادھے بیٹھے ہیں ہوش کے ناخن لیں ڈرنا بند کریں کچھ نہیں ہوگا بس سکون سے بیٹھے اور سر دھنیے زندگی کو غالب کی غزل سمجھ کر سرور پیجیے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے سگار مرزا صاحب کی طرف بڑھایا تھا مرزا صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے اور وکیل صاحب ہنس دیے تھے مرزا تشکر دکھائی دیے تھے۔

”کیسا خون خشک کر رکھا ہے اس لونڈے نے آپ کا حد ہو گئی مرزا صاحب آپ تو کمال کے بزدل نکلے اتنی بڑی سازشوں کے محرک اتنے خوفزدہ دکھائی دے رہے ہیں جب کوئی ثبوت چھوڑا ہی نہیں تو ڈر کیا، بلوائی درحقیقت آسمان سے ٹپکے تھے اور ان کو کوئی نہیں جانتا بلوائیوں نے جس طرح دنگا فساد کرنا تھا قتل و غارت گری کرنا بھی انہوں نے کی خواہ مخواہ کی فکر میں خود کو ہلکان نہ کریں جیسے گھر لمبی تان کر سو جائیں ہم آپ کے خادم موجود ہیں نا، ہم سنبھال لیں گے اس لونڈے نے آپ پر ہتک عزت کا دعویٰ کیا ہے کل ہم اس پر ہتک عزت کا دعویٰ کریں گے۔ آپ کی عزت اتنی ارزاں نہیں ہے فکر نہ کریں مقدمہ ہمارے حوالے کیا ہے تو سکون سے بیٹھ جائیں اب ہم سنبھال لیں گے۔“ وکیل صاحب مسکرائے تھے اور سگار کے کش لینے لگے تھے مرزا صاحب نے خاموشی سے ان کو دیکھا تھا۔



”فتح النساء نے شکوہ کتنا نظروں سے جلال کو دیکھا تھا وہ سر جھکائے کوئی اہم فائل دکھ رہے تھے ان کے وکیل دستخط کے منتظر تھے اور منتظر تو فتح بھی تھی کہ ان سے بات ممکن ہو سکے مگر وہ گویا اس بات سے یکسر نا واقف تھے فتح کو گھلا کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس کرانا پڑا تھا تب جلال نے کسی قدر چونک کر ان کی

سمت دیکھا تھا اور دستخط کر کے فائل وکیل صاحب کی سمت بڑھادی تھی وکیل فائل تھام کر چلتے بنے تھے اور تب جلال فتح کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”کیسے کیا مدعا ہے آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہی ہیں خیریت ہے۔“ وہ رسائیت سے پوچھ رہے تھے فتح النساء نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر نرمی سے بولی تھیں۔

”ہمیں آپ کی فکر ہو رہی ہے جلال آپ کا اقدام مناسب نہیں ہے مرزا اور ان کے صاحبزادے کو کون نہیں جانتا۔ ان سے مخالفت مول لینے کا مطلب جانتے ہیں آپ نواب صاحب کے اکلوتے وارث ہیں اور آپ کا ان کے لواحقین میں سے زندہ رہ جانا حیران کن ہے دشمن یقیناً ایسا نہیں چاہتا تھا مگر اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا اور اب آپ اس طرح مرزا سے مخالفت مول لے رہے ہیں مجھے اختلاف ہے آپ کو اس درجہ غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا ہم نہیں کہتے کہ آپ نے غلط کیا مگر یہ قبل از وقت ہے فتح النساء نے ان کو مشورہ دینا چاہا تھا مگر جلال نے ہاتھ اٹھا کر ان کو مزید بولنے سے روک دیا تھا اور پرسکون انداز میں بولے تھے۔

”ہم سدباب ڈھونڈ نکالیں گے فتح النساء آپ کو فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں ہے ہم جانتے ہیں ہم نے جو کیا وہ مناسب ترین قدم ہے بظاہر بلوائیوں نے حملہ کیا مگر وہ ایک منصوبہ سازی سے زیادہ ایک پھیانک سازش تھی اور اس سازش کے پیچھے جو چیزیں تھیں ہم اس کو دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں ہم جانتے ہیں گواہ موجود نہیں اور اسی نوعیت کا یہ پہلا مقدمہ ہے مگر کسی کو تو پہل کرنا بھی ہم ایسے فسادی کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے کتنے بے قصور اس قتل و غارت گری کی نذر ہوئے ان میں سے کسی ایک کو اگر انسان ٹل جاتا ہے تو یہ اقدام ان تمام مرنے والوں کی روح کو تسکین فراہم کرے گا ہمیں اس کا یقین ہے۔

آج لوگ اس نوعیت کے مقدمے پر نہیں گے ہمارے بے وقوفی خیال کریں گے مگر کل جب مرزا صاحب بے نقاب ہوں گے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے تو ہر کوئی جان جائے گا کہ نواب زادہ جلال الدین غلط نہیں تھے ہم اپنے اس اقدام پر مطمئن ہیں اور ہمیں کسی جگہ ہنسائی کا کوئی خوف نہیں۔“ وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولے تھے اور فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

”ہمارا مقصد یہ نہیں تھا چھوٹے نواب ہم آپ کو غلط نہیں سمجھتے نا آپ اس ضمن میں اکیلے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں مگر ہم آپ کی فکر کر رہے تھے نواب صاحب کی جمع پونجی ہیں آپ ان کی نسل کے اکلوتے وارث وہ آپ کو بہت کامیاب دیکھنا چاہتے تھے آپ کے حوالے ہے ان کی آنکھوں میں کئی خواب تھے اور ہم ان کی جلائی کے لیے دعا گو ہیں اللہ آپ کو کامیابی اور کارمرازی دے۔“ فتح النساء کہنے تو بہت کچھ آئی تھیں مگر کچھ زیادہ نہیں کہہ سکی تھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی تھیں ابھی نواب زادے نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا اور وہ چونک کر مڑی تھیں اور چھوٹے نواب کی سمت دیکھا تھا مگر وہ ان کی سمت متوجہ دکھائی نہیں دیے تھے اور اس آہستگی سے انہوں نے فتح النساء کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا فتح النساء پلٹ کر ان کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔

”اگرچہ ہم میں بہت سے اختلاف ہیں اور ہماری ازدواجی زندگی کسی سمت جاتی دکھائی نہیں دیتی مگر اس کے باوجود ہم آپ کے خلاف کھڑے نہیں ہیں نا آپ کی مخالفت کر رہے ہیں آپ کے ہمراہ کھڑے ہیں ہم جب تک آپ کو ضرورت ہے ہم آپ کے ہمراہ اسی طور کھڑے رہیں گے جب آپ کو ضرورت نہ رہے ہمیں مطلع کر دیجیے گا ہم آپ سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے۔“ وہ مدد مہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں وہ جیسے جان گئی تھیں کہ وہ اس لمحے تنہا ہیں اور ان کو سہارے کی ضرورت ہے سو انہوں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا

”ہم نے حکمت چاہا سے کہہ دیا ہے آپ کو اور آپ کی بوا کو کل میں منتقل کر دیں اگر چاہا آپ کو ہماری ضرورت نہیں مگر آپ ہمارے نام سے منسلک ہیں اور ہم اس بے وفائی کے باوجود آپ سے دستبردار نہیں ہو سکتے اگرچہ ابا جان کی خواہش تھی کہ آپ کو دھوم دھام سے رخصت کر کر کل میں لاتے مگر شوشی قسمت ابا جان رہے نہیں اور حالات بھی اس قابل نہیں رہے سوا ب جو بھی ہو وہ معنی نہیں رکھتی۔“ وہ سرسری سے لہجے میں بولے تھے فتح النساء نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”کاش ہم آپ کو اپنی وفاداری کا یقین دلا سکتے کاش ہم آپ کو بتا سکتے کہ محبت میں شراکت اور تقسیم نہیں ہوتی اور جو خانوں میں بٹ جائے وہ محبت نہیں ہوتی ہم تو تب سے آپ کی وفاداری کا دم بھرتے رہے ہیں جب آپ سے کسی حوالے سے منسلک بھی نہیں تھے رشتہ تو آپ سے بہت بعد میں بڑا مگر آپ کو یقین نہیں اور ہم محبت کا کوئی حوالہ دینا اب ضروری خیال نہیں کرتے اگر لفظ شور مچانے کے باوجود اپنا وجود چھو بیٹھے ہیں تو خاموشیاں اپنا آپ کہاں منا سکتی ہیں بہتر ہو گا خاموشیوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں اور گفتگو کو رد کر دیں محبت کو متروک قصہ قرار دے دیں اور وفاداریوں کو انجانی داستان تعلقات خواب ہو رہے ہیں تو کوئی اور جواز ضروری نہیں۔“ فتح النساء اٹھی تھیں ان کی آنکھیں متواتر بھیگ رہی تھیں اور بھی جلال نے ان کو پکارا تھا۔

”رکھیے۔“ فتح النساء اس حکم نامے پر رک گئی تھیں اور تبھی وہ پرسکون لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

”ہم جواز ڈھونڈنا نہیں چاہتے مگر جو اس خاندان کی روایت ہے ہم اسے پورا کرنا ضرور خیال کرتے ہیں بہر طور آپ اس خاندان کی بہو اور نواب زادہ جلال الدین پنڈی کی زوجہ محترمہ ہیں سو آپ کا حق ہے اس گھر پر اور ان درو دیوار پر آپ اس گھر میں ہی

تھا اور قریب بیٹھ کر چھوٹے نواب کی دلجوئی کرنے لگی تھیں مگر چھوٹے نواب نے سرنئی میں ہلاتے ہوئے ان کی سمت بتا دیکھے کہا تھا۔

”ہمیں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کون کس سمت کھڑا ہے، کون حمایت یا مخالفت میں ہے ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہم تنہا نہیں کیونکہ اماں ابا کی دعائیں اور یادیں ہمارے ہمراہ ہیں اور اللہ کا ساتھ بھی ہمیں مضبوطی دے رہا ہے جہاں تک معاملہ آپ کی مخالفت کا ہے تو ہم الزام دینے والے کون ہوتے ہیں آپ جو ضروری سمجھتی ہیں روا رکھیں اگر آپ کھل کر مرزا صاحب کی حمایت کرنا چاہتی ہیں تو اجازت ہے ہم آپ کو منع نہیں کریں گے۔“ ان کا لہجہ عجیب شکوہ کنناں تھا اور فتح النساء کے کلیجے میں جیسے کسی نے انی ہسٹو دی تھی وہ تڑپ کر چھوٹے نواب کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”ہم..... ہم بھلا مرزا صاحب کا ساتھ کیوں دیں گے۔“ ان کی آواز بھرا گئی تھی اور تذلیل کے احساس سے چہرہ سرخ پڑ گیا تھا وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ان کی جانب دیکھنے لگی تھیں۔

”کاش آپ سچ اور غلط کی تمیز کر سکتے یا مخالفت اور حمایت کے معنی جان پاتے یا صرف آنکھیں کھول کر سچائی کو ایک نظیر دیکھ سکتے آپ کی باتیں ہمارے دل میں پیوست ہوتی ہیں اور آپ کے جملے ہمارے دامن کو نہیں دل کو داغ دار کرتے ہیں۔“ وہ جیسے درد سے کراہ کر رہ گئی تھیں مگر جلال نے ان کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا اور بولے تھے۔

”آنکھوں دیکھا سچ نظر انداز کرنا آسان نہیں ہوتا فتح النساء ہم ہزار خطائیں معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر بے وفائی نہیں اور بے وفائی بھی کیسی جو روح کو زخم دے گئی۔“ جلال کا لہجہ بیجا بیجا سا تھا۔ فتح النساء کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی بھی چھوٹے نواب نے ایک نگاہ ان پر ڈالی تھی اور گویا ہوئے تھے۔

ہوئے دیکھنے لگی تھیں۔ نو جوان خاموشی سے دیکھنے لگا تھا تب عین نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر اس نو جوان کا چہرہ چھوا تھا اس کے نقوش کو چھو کر جیسے احساس کرنا چاہا تھا کہ وہ حقیقت ہے یا خواب؟ اور ان کی آنکھیں می سے بھرنے لگی تھیں اگلے کئی لمحوں تک وہ خاموشی سے اس نو جوان کو دیکھتی رہی تھیں۔

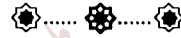
”ہم وعدہ خلاف نہیں عین، ہم اپنے کہے کا مان رکھنا جانتے ہیں ہم نے جو کہا تھا ہم ان لفظوں کی پاسداری اپنی آخری سانس تک کریں گے وقت کو بدلنا بڑا یا موت کو شکست بھی دینا پڑی تو ہم دے کر رہیں گے مگر اپنے کہے کو ہر صورت پورا کریں گے۔“ نو جوان نے کہا تھا عین النور اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور نو جوان نے ان کا چہرہ دیکھا تھا۔

”عین ہم اختیار نہیں رکھتے نا کوئی حق ورنہ ہم ان آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی بہنے نہ دیتے ہم آپ کی عزت و حرمت کے معنی جانتے ہیں اور ہمیشہ آپ کا رتبہ اور مقام ہماری نظروں میں بہت بلند رہے گا ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے ان آنکھوں کی نمی چھونے اور پونچھنے کا اختیار ہمیں نہیں سویرائے کرم اس بے چینی کو سمیٹ دیں جو اس لمحے دل میں پھیلتی جا رہی ہے ہم اتنا یقین رکھتے تھے کہ آپ ایک بہادر لڑکی ہیں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہیں سو ہم نے ایک لمحے کو سوچے بنا آپ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔“ نو جوان نے کہا تھا اور عین النور پھیلتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھیں وہ درد کی کیفیت سے غڈ حال دکھائی دی تھیں گویا دل کے اندر ایک سمندر تھا جو آنکھوں کے راستے بہہ جانے کو تیار تھا وہ جیسے جیج کر رونا چاہتی تھیں۔

”آپ نے ہمیں تنہا چھوڑ کر اچھا نہیں کیا تیمور۔“ ان کی آواز اور لہجہ شکوہ کا غماز تھا تیمور اسے دیکھ کر کہہ گئے تھے۔

رہیں گی جب تک کہ ہم اس رشتے کی سمت تلاش نہیں کر سکتے آپ کا اس رشتے کے ایک سرے کو تھا سے رہنا ضروری ہے کیونکہ رشتے کا دوسرا سرا ہم تھا سے کھڑے ہیں۔ ہم دونوں کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔“ جلال مدہم لہجے میں بولے تھے۔ فتح النساء نے مڑ کر جلال کو دیکھا تھا۔

”چھوٹے نواب رشتے کو سرا نہیں مل سکتا جب دو لوگ رشتوں کے سروں کو تھام کر کھڑے ہوتے ہیں تو رشتہ تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے رشتوں کی ڈور پلک پذیری کی محتاج ہوتی ہے اور تناؤ سازگار ماحول فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے اور رشتہ اپنا تاثر کھونے لگتا ہے رشتے کا تاثر کھونا اسے بے وقعت کر دیتا ہے اس صورت حال میں شکوے معیوب ہوتے ہیں اور وضاحتیں ذکر ممنوع۔“ فتح النساء پلٹی تھیں اور چلتی ہوئیں وہاں سے نکل گئی تھیں جلال ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔



”تیمور.....!“ عین نے بند آنکھوں سے پکارا تھا نو جوان نے ان کے نازک ہاتھ کو تھاما تھا۔ ”عین آنکھیں کھول لے ڈریے مت ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ نو جوان نے کہا تھا اور ان کو اٹھا کر بٹھایا تھا عین نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں کھولنے کی با مشکل کوشش کی تھی۔

”تیمور..... ہم خیالوں میں دیکھنے لگے ہیں آپ کو آپ کہاں کھو گئے ہیں نظروں کے سامنے کیوں نہیں آتے، دکھائی کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے تو وعدہ کیا تھا نا اس سفر میں ہمارے ساتھ رہیں گے؟“ وہ جیسے خیالوں میں تیمور سے مخاطب ہوئی مگر نو جوان نے ان کے ہاتھ کو مضبوط سے تھام کر گرم جوشی کا احساس دلایا تھا۔

ہاتھ میں وہ لمس صاف محسوس کیا جاسکتا تھا عین جو مدہم لہجے میں کھوئی کھوئی سی بولی تھیں ان کو چوہ نکلتے

”ہم معذرت چاہتے ہیں مگر اس سفر میں یہ موڑ بھی ضروری تھا اگر ہم آپ کے ہمراہ رہتے تو آپ زندگی کو جینے میں ایسا حوصلہ نہ دکھاتا میں اور ہم نے دانستہ آپ کا ہاتھ چھوڑا تھا کیونکہ وہاں مسئلہ فقط ایک جان کا نہیں تھا اس ٹرین میں موجود تمام مسافروں کی سلامتی کا تھا اگر ہم آپ کے ہمراہ اس ڈبے میں سوار ہو جاتے تو ہم میں سے کوئی بھی منزل تک نہ پہنچ پاتا ہم سب مارے جاتے بلوائی اس ٹرین کو بھی لاشوں کا ڈھیر بنا دیتے ہم اس زمین پر لاشیں بن کر کٹڑوں میں بکھر جاتے سب کی جانوں کو بچانے کے لیے یہ اقدام ضروری تھا عین جب ہم نے آپ سے کہا تھا کہ ٹرین کی رفتار دھیمی ہوگی اور جھاڑیوں میں جیسے بلوائی اس ٹرین میں چڑھنے کا ارادہ باندھنے لگے بھی ہم ان بلوائیوں سے قبل اس چلتی ہوئی ٹرین میں سوار ہوں گے ان بلوائیوں کا کوئی ساتھی اس ٹرین میں تھا جس نے ان کی راہ ہموار کرنے کو ٹرین کی زنجیر پھینچی تھی ہمارا قیاس درست ثابت ہوا تھا وہاں اس ویرانے میں ٹرین کو روکنے کا مقصد یہی تھا کہ تمام مسافروں کو وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے جب ہم نے ان بلوائیوں کو ان جھاڑیوں میں دیکھا تھا ہم بھی سب سمجھ گئے تھے سو جو منصوبہ اس لمحے ہم نے بنایا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے یہ ضروری تھا مگر ہم اس ٹرین میں سوار ہوتے اور ہمارے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اگر ہم آپ کو اس ٹرین میں سوار کرادیں گے تو بلوائی بھی اس ٹرین میں سوار ہو جاتے سو ٹرین کی رفتار بڑھانا ضروری تھا اس سے قبل کہ جھاڑیوں میں جیسے بلوائی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہم نے آپ کو ٹرین میں سوار کرادیا اور خود دانستہ ڈرائیور کے ڈبے والے خانے کی سمت دوڑنے لگے ہم نے دھیمی رفتار کے باعث جلد اس ڈبے تک رسائی اختیار کر لی اور ہم نے ڈبے میں سوار ہو کر ڈرائیور کو رفتار بڑھانے کا اشارہ کیا۔

اور تبھی اس سے قبل کہ بلوائی اس ٹرین میں سوار ہو پاتے ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی اس کے بعد ہمارا اس ڈبے میں رہنا ضروری تھا کہ ہم ٹرین کو با حفاظت اس مقام سے نکال کر پاکستان کی طرف بڑھ سکتے ہم اب پاکستان کے قریب پہنچ چکے ہیں سو ہم نے اس ڈبے میں واپس آنا ضروری خیال کیا۔“ تیمور نے بتایا تھا تبھی عین چوکی تھیں۔

”مگر زنجیر کس نے کھینچی اس بار کیا دوبارہ بلوائیوں کی کوئی چال تھی۔“ عین نے پوچھا تھا تیمور نے نا اچھی سے سرفنی میں ہلایا تھا۔

”اس متعلق ہم لاعلم ہے مگر کوئی ہے ضرور اس ٹرین میں جو دشمن کا حصہ ہے اور ہمارے ساتھ اس سفر میں ہے۔“ عین نے گردن موڑ کر ان خاتون کو دیکھا تھا پھر تسلی کر کے تیمور کی طرف دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

”اس ریل گاڑی میں ایک شخص تھا شہاب اس نے بہت پریشان کیا ہمیں اس ٹرین میں ہم سب لاچار رہے بس مسلمان ہیں جو اپنا بہت کچھ اس زمین پر گنوا کر لے ہوئے پاکستان کا رخ کر رہے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آیا جس حالت میں ہم بے گھر ہوئے کوئی کسی پر اس طرح بری نظر رکھ سکتا اس ریل گاڑی میں ہر مسافر دوسرے کے لیے بے پناہ ایثار اور عزت رکھتا دکھائی دیا مگر شہاب ایسا تھا جو اس بے یار و مددگار وقت میں بھی خیانت کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیا اس نے ہمیں اس درجہ پریشان کیا کہ ہم انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔“ عین بولی تھی تو تیمور نے چوکتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

”ایسا کیا کیا آپ نے؟“ تیمور کے پوچھنے پر عین نے خاموش ہو کر ساتھ بیٹھے مسافروں کا جائزہ لیا تھا پھر تسلی کر کے دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

”اس نے ہوس پرستی کی حد چھلانگنا چاہی تھی اس کی نظر ہم پر بھی وہ ہمیں بیت الخلا لے جا کر اپنے ناپاک

ارادے پورا کرنا چاہتا تھا اور تبھی ہم نے اسے ٹرین سے نیچے پھینک دیا تھا آپ نے بتایا تو جانے کیوں مجھے شہاب یاد آیا ان کی ہمشیرہ ابھی ابھی ایسی ڈبے میں سوار ہیں مگر.....!“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی تھیں اور تیور نے چونکتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

”کوئی بے یار و مددگار مسلمان کسی دوسرے لاچار مسلمان بھائی بہن کا استحصال اس صورت حال میں نہیں کر سکتا یہ شہاب کچھ اور تھا ہمیں اس پر شبہ ہونے کو ہے کیا وہ اب بھی زندہ ہے؟“ تیور نے پوچھا تھا عین نے کچھ نا سمجھتے ہوئے لاعلمی سے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

”ہم نہیں جانتے ہم نے اس ٹرین سے دھکا دے کر گرا دیا تھا ہم اسی پشیمانی میں تھے کہ ہم نے کسی کی جان لینے کی ٹھانی اور ایسا کر گزرے ہمیں بلوائیوں کے سر قلم کرنے کا اتنا افسوس نہیں تھا وہ غیر قوم تھے مگر شہاب کو مارنے کی شرمندگی ہمارے دامن سے پٹی تھی

ہم سانس نہیں لے پا رہے تھے ایک احساس جرم ہماری جان لیے جارہا تھا ہم اس حالت کو اسی لیے پہنچے کہ ہم احساس جرم میں مبتلا تھے شہاب کی ہمشیرہ کو ہم پر شک ہے کہ ان کے بھائی کو کہیں غائب کیا ہے شہاب ٹرین میں ہے یا نہیں ہم نہیں جانتے مگر وہ شخص کچھ عجیب سا ہے اور اس کی ہمشیرہ بھی۔“ عین نے شبہ ظاہر کیا تھا تیور کچھ سوچتا دکھائی دیا تھا۔

”آپ کیا سوچ رہے ہیں تیور؟“ عین نے پوچھا تھا۔

”ہم اس بیچ پر سوچ رہے ہیں عین جس پر آپ سوچ رہی ہیں دو بار ٹرین کی زنجیر کھینچنا اور اسے ویران میں روکنے کی کوشش کرنا ایک بڑا منصوبہ ہے یقیناً وہ جانتے ہوں گے کہ اگر ایک مقام پر ٹرین ان کے منصوبہ سازی کا شکار نہ بنے تو وہ کسی دوسرے مقام پر ٹرین کو اس طور بلوائیوں کی نذر کر دیں جانے ایسی کئی ٹرینیں ان کے ایسے منصوبوں کا شکار ہوئی ہوں گی یہ ٹرین دو منصوبوں سے بال بال بچی ہے مگر ہمیں شبہ

ہے شہاب اگر زندہ ہے اور اس ٹرین میں سوار ہے تو وہ اس ٹرین کے مسافروں کے لیے مسلسل خطرہ ہے اور دوسری بات جو ہم سوچ رہے ہیں وہ شخص یا تو مسلمان نہیں اور اپنی شناخت چھپا کر اس ٹرین میں سوار ہوا ہے یا پھر گھگھاگ ہے اور بے ضمیر شخص ہے ایسے لوگ مونی کی تاک میں رہتے ہیں اور ان کے لیے ان کے مطلب کے سوا کچھ اہم نہیں ہوتا ہمیں محتاط رہنا ہے عین ان لوگوں کا پاکستان میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں ایسے لوگ یا تو جائیدادوں کے حصول کے لیے سرحدیں پھلانگتے ہیں یا پھر ان کے ارادے اس سے سوا ہو سکتے ہیں بہر حال ہم آپ کے ساتھ ہیں اور اب آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو بھی ہوا ہم سنجال لیں گے ٹرین پاکستان کے بہت قریب ہے ہم منزل تک پہنچنے والے نہیں۔“ تیور نے کہا تھا اور عین نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا پھر مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

”اگر شہاب زندہ ہوا تو؟“ ان کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

”اگر شہاب زندہ بھی ہے تو ہم اسے دیکھ لیں گے عین آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ تیور نے تسلی دی تھی۔

”ہم پاکستان پہنچ کر حیدر سے ملنا چاہتے ہیں تیور ہم نے یہ سفر حیدر کے لیے کیا ہے مگر اب جب منزل قریب ہے تو ہم ڈر رہے ہیں ہم اتنی بڑی خلقت میں کیسے ڈھونڈیں گے انہیں وہاں تو بہت سے لوگ ہوں گے اور بہت سے کیمپ اور جانے اندراج کرنے والے کوئی مدد کر بھی پا میں گے کہ نہیں اور حیدر جانے وہ کیسا رد عمل دیں گے۔“ عین متفکر دکھائی دی تھیں تیور ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا پھر آہستگی سے شانے اچکا دیے تھے اور عین بولی تھی۔

”جانے کیوں ہمارا دل بہت بے چین ہے تیور ہمیں جلال بھیا اور اماں ابا کی بہت یاد آ رہی ہے لگتا

اپنی عصمتوں کی قربانیاں کیوں دیں بیٹوں نے گردنیں کیوں کٹوا لیں اور سر کے سایہ سے مہربان آسمان جیسے والدین کیوں مارے گئے سبب کیا تھا صرف مقام بدلنا اس قدر ضروری تھا کہ باقی سب غیر ثانوی ہو گیا ہمیں کسی سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تیمور۔ بس ڈر لگ رہا ہے ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہم کوئی جواب خود ڈھونڈنے کے قابل نہیں تو کسی اور کو کیا جواب دیں گے؟ کیا بتائیں گے کسی نے پوچھ لیا تو ہم نے خود کو اس قدر الجھا لیا ہے پاؤقت اتنا الجھا رہا ہے یہ کیا ہے ہم الجھنوں میں کیوں گرتے جا رہے ہیں جب منزل دو گام ہے تو، گنونا کیوں ضروری تھا اتنے پیارے رشتوں کو کون گنوتا ہے اتنے خواب کون گنوتا ہے تیمور؟ کہاں کے دانا تھے ہم کیا دانائی کی ہم نے کیا یہ عمل دانائی میں شمار بھی ہوگا کہ نہیں؟ اور دانائی بھی کیسی کیا دانائی کہتی ہے کہ سب گنوا دو حیرت ہوتی ہے سوچتے ہیں تو سوچیں الجھتی جاتی ہیں دانائی کہتی ہے کہ یہ سب گزرز روں یہ دانائی کا سفر ہے کیا یہ منزل دانائی کا پیش خیمہ ہے دانائی ایسی ہدایتیں دیتی ہے کہ بے وقوفی اور اگر یہ دانائی ہے تو اس دانائی نے کیا دیا ہمیں خالی ہاتھ رہ جانا دانائی ہے سب گنوا دیا عقلمندی ہے۔“ وہ غم سے نڈھال دکھائی دی تھیں بعضوں کے چہرے سے نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے، کیا باقی رہا تھا تیمور نے ان کے دکھ کو نڈھال دیکھ کر نگاہ پھیر لی تھی۔

”ہمارے پاس آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں ہے عین ہم کسی سوال کا کوئی جواب با جواز نہیں رکھتے، مگر شاید اس سوال اور اس ایک سوال سے جڑے سوالوں کے جواب ہم بھی ڈھونڈ نہ پائیں کہ ہجرت ضروری ہوں تھی، مگر یہ مقام کا بدلنا فقط جگہ کی تبدیلی نہیں ہے یہ نظریات کی تبدیلی ہے یہ سفر یونہی اختیار نہیں کیا یہ تاریخ کی اب تک کی سب سے بڑی ہجرت ہے اور تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت رہے گی دنیا کے کسی مقام پر ایسی ہجرت نہیں دیکھی گئی ایسا صرف

ہے ہم ان کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں لگتا ہی نہیں کہ وہ زندگی کا حصہ ہی نہیں رہے ایسا لگتا ہے وہ سب وہیں ہیں بس ہم سفر کر کے آگے بڑھ آئے ہیں آگے تو بڑھ گئے ہیں مگر ہم نے زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ زندگی کہیں پیچھے چھوٹ گئی ہے تیمور ہم نہیں جانتے ہم کس سفر میں ہیں یا کس منزل کی سمت بڑھ رہے ہیں سب بہت خالی خالی سا لگتا ہے لاشیں دیکھتے دیکھتے جیسے ہم خود بھی کوئی لاش بن گئے ہیں اپنا وجود زندگی سے خالی لگتا ہے کیسا سفر ہے یہ تیمور کیسی منزل ہے ویرانی ہی ویرانی ہے ہر طرف سفر میں کتنے لوگ ساتھ ہیں مگر کوئی ایک بھی ہمراہ نہیں لگتا

کیا کیا ہم نے کیسے خواب دیکھے کیسے آنکھیں گنوا لیں، کیا کہیں گے ہم نے ہجرت کیوں ضروری خیال کی؟ کیا مقام اتنے اہم ہوتے ہیں اور زندگیاں عصمتیں اتنی سستی کہ مقام بدلنے کے لیے عصمتوں کو گنوا دیا جائے یا انسانی وجودوں کو لاشوں میں بدلتا چپ چاپ دیکھا جائے ہم بے حس ہیں یا کچھ اور، ہجرت کیوں ضروری تھی تیمور کل کی آنے والی نسلوں نے ہم سے پوچھا تو ہم کیا جواب دیں گے انہیں جب شہاب کی نظریں ہمیں ٹوچ کھا رہی تھیں ہم نے تب بھی یہی سوچا تھا اور اب بھی ہجرت کیوں ضروری تھی تیمور ہم نے ہجرت کو انسانی زندگیوں اور عصمتوں پر ترجیح کیوں دی؟ بہتر نہ ہوتا ہم ہجرت کا نہ سوچتے اور اسی مقام پر رہ جاتے ہجرتوں سے کیا بدلے گا کیا بدلا اس بے درد سامانی کی حالت میں ہم ایک نئے دیس کی سمت گامزن ہیں اور کون جانے اس زمین پر زندگی کیا ہوگی اور زندگی باقی رہے گی کہ نہیں ایسے کئی سوال دماغ میں اٹھتے ہیں تیمور مگر ان کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے یا ان سوالوں کا کوئی جواز ہمارے پاس ہے اس وقت سے نکل تو آئے ہیں مگر جس وقت میں داخل ہونے جا رہے ہیں اس وقت کو کیا جواب دیں گے ہجرت کیوں ضروری تھی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں نے

نواب زادی عین النور خوش ہوئے اور خوشی منائیے آپ نے بہت کچھ کنوایا مگر آپ ایک باشعور قوم کا حصہ ہیں ایک ایسی قوم جو جاگتی قوم ثابت ہوئی جس نے کھلی آنکھوں سے قربانیاں دے کر اپنے مفادات کو ایک طرف رکھ کر مقام کی تبدیلی کا فیصلہ کیا آپ کی ان قربانیوں کو ہمیشہ سراہا جاتا رہے گا ہمیں فخر ہے ہم ایک عظیم قوم کا حصہ ہیں اور اس عظیم ہجرت کا حصہ بھی۔“

تیسرا ایک عزم سے مسکرایا تھا اور عین اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ٹرین مخصوص رفتار سے چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی منزل بس دو گام بھی خوابوں کی تعبیر کا وقت بس آیا ہی چاہتا تھا مگر ایسے میں ماضی جانے کیوں بے چین کر رہا تھا جانے کیوں گزرے تمام لمحے دامن پکڑے رہے تھے عین نے بے چین ہو کر آنکھیں میچ لی تھیں۔



”میاں لگتا ہے تقسیم کی خبر اب آئی کہ تب جانے کیوں لگتا ہے کہ اب آزادی کے دن دور نہیں جناح صاحب نے فرنگیوں کو ٹیکل ڈال دی ہے ایسا قائل کیا ہے کہ اب بس ان کو بھاگتے ہی بنتی ہے۔“ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے شطرنج کی بساط پر چال چلتے ہوئے حکمت صاحب کو دیکھا تھا نواب صاحب مسرور سے دکھائی دیتے تھے اور حکمت صاحب اپنے دوست کی اس بات کو سن کر مسکرا دیے تھے۔

”بات تو آپ کی مناسب ہے جناب مگر ہمیں خدشہ ہے بات اگر تقسیم کی ہوئی تو فقط جگہوں کی تقسیم سے زیادہ یہ وسائل کی تقسیم نہ بن کر رہ جائے ایسا نہ ہو کہ ہندو کھیل کھیل جائیں اور سارے وسائل اپنے نام لکھوالیں اور مسلمانوں کے حصے میں فقط بنجر زمین کا ٹکڑا ہی آئے ہندوؤں کو تو دشمنی نکالنے کا موقع چاہیے چالاک قوم ہے اور ایسے کام کرنے میں پیش پیش بھی جناح صاحب کو اس ضمن میں انگریزوں کو قائل ضرور کرنا چاہیے۔“ حکمت صاحب نے مہرہ کو اپنی منتخب چال دی تھی اور نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

مسلمانوں نے کر کے دکھایا ہے کیونکہ یہ فقط مقام کی تبدیلی نہیں ایک مقام سے دوسرے تک منتقل نہیں یہ نظریات کے باعث ہوا دنیا کی تاریخ کی یہ سب سے بڑی ہجرت ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے سے نہیں ہوئی یہ ہجرت نظریات کے باعث ہوئی عقیدے کے باعث ہوئی اور قومی نظریات کے اختلاف کے باعث ہوئی دو قومی نظریات کا پیش ہوا اس سوال کا جواب تھا اور اتنی بڑی تعداد میں زمین کے ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے تک منتقلی اس بات کا ثبوت ہے اور جواب بھی ہجرت کیوں ضروری تھی؟ یا ہجرت کیوں ہوئی اس کا جواب دو قومی نظریہ ہے دو قوموں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے مذہب نسل ذات پات رہن سہن اور سوچنے کے اطوار پاک و ہند میں رہنے والی ان دو قوموں میں قدر مشترک کا باعث نہ تھا اور یہی بات اس ہجرت کا باعث بنی جن کو عقیدے اور رہن سہن کا خیال تھا یہ ہجرت ان لوگوں نے اختیار کی اگلی منزل پر جا کر کیا ہوتا ہے یا کیا ملتا ہے، کل کوئی سوال پوچھتے گا تو جواب کیا ہوگا؟ یہ بعد کے سوچنے کی باتیں ہیں مگر تاریخ اس ہجرت کو بھولے گی نہیں کیونکہ نظریات کے لیے کوئی دوسری قوم اتنی بڑی ہجرت بھی نہیں کر پائے گی یہ قوم خود کو زندہ قوم ثابت کر چکی ہے اور ثابت کر چکی ہے کہ نظریات کس قدر ضروری ہے اور اختلافات کیا حق رکھتے ہیں بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں نے اتنی قربانیاں کیوں دیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے اور جواب بھی سو تاریخ ان قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی اور کوئی دوسری قوم ایسی قربانیاں بھی دے نہیں سکے گی پاک و ہند کی اس تاریخ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور ساتھ ہی اس بہادر قوم کو کبھی خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا مگر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا لوگ گھر توڑتے ہیں ہم نے گھر چھوڑے ہیں اپنے پیارے قربان کیسے ہیں جائیداد چھوڑی ہیں ہم سے ناداں اور ہمیں ملیں گے

”پہلے یہی سہی مگر جناح صاحب بہت دور اندیش ہیں ان کی نگاہ ہر معاملے پر یقیناً وہ وسائل کی بات بھی کر چکے ہوں گے، ویسے Lord Wavell نے فروری 1947ء میں دونوں قوموں کو خدشے سے باہر تو نکال لیا تھا کہ وسائل کی تقسیم کیسے ہوگی۔

The crude bountries was prepared by lord wavell though but cater redcliffe given the responsibilities to chair 2 commissions which were working on the boundries of punjab and bengal and that demarcation of the boundaries muslims and non muslims natural waberouses and irrigation systems

اس بارے میں اگرچہ طے تو پا چکا ہے مگر شاید ریڈ کلف اس معاملے میں باقاعدہ اعلان تقسیم کے وقت ہی کریں ایسی خبر سننے میں آئی تو ہے مگر حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا شاید فرنگی سامراج بھی تقسیم کے اعلان کا منتظر ہے اور اس کے بعد باقاعدہ ان وسائل کی تقسیم کا اعلان بھی کرے گا بہت ممکن ہے کہ ایسا کوئی اعلان تقسیم کے عمل کے فوری بعد ہو یا اعلان کے بعد اس بارے میں فی الحال کوئی قیاس آرائی ممکن نہیں مگر خیر آئی ہے کہ ایسا کچھ طے تو پا چکا ہے۔“ نواب صاحب بولے تھے اور حکمت صاحب مسکرائے تھے۔

”مسلم لیگ کے سرگرم رکن ہیں آپ اندر کی خبریں آپ کے پاس نہیں ہوں گی تو اور کس کے پاس ہوں گی نواب صاحب جناح صاحب کے قریبی دوستوں میں ہیں آپ ایسی خبروں کی ترسیل آپ تک نہ ہوا یا ممکن نہیں۔“ حکمت صاحب مسکرائے تھے تو

نواب صاحب بھی مسکرا دیے تھے۔

”خیر ایسی بات نہیں جناح صاحب اچھے دوست ہیں مگر تمام راز ہم تک نہیں آتے۔“ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے مہرا آگے بڑھایا تھا تبھی حکمت صاحب بولے تھے۔

”اودہ کہیں یہ خبر آپ کے سمدھی نے تو آپ تک نہیں پہنچائی؟“ ان کا لطیف سا طنز نواب صاحب کو مسکرانے پر مجبور کر گیا تھا۔

”ایسی بات نہیں مرزا سراج الدولہ بڑے آدمی ہیں ان کے پاس ایسی چھوٹی باتیں ہم تک منتقل کرنے کے لیے وقت نہیں ویسے میاں یہ تو وہی بات ہوگئی کہ کپڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم خیر بھی تھا؟“ نواب صاحب نے کہا تھا تو حکمت صاحب بے ساختہ ہنسے تھے۔

”واہ واہ پندہ پرور کیا بات یاد دلا دی غالب کی بات ہی کیا ہے تقسیم کے اس زور نے غالب کی شاعری کو قدرے دبا دیا ہے مگر کبھی وقت ملا تو قبوے کی چسکیوں کے ساتھ غالب کی شاعری کا تذکرہ ضرور کریں گے۔“ حکمت صاحب نے کہا تھا اور نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا پھر زری سے غالب کا شعر پڑھ دیا تھا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ”میاں کیا بات کردی جنت کی حقیقت اور غالب دو متضاد چیزیں ہیں یہ نظریہ کفر ہے۔“ حکمت صاحب نے کہا تھا۔

”غالب کا فرقتے کیا؟“ نواب صاحب نے نقطہ اٹھایا تھا پھر بولے تھے۔

”ویسے وہ ادب جو زندگی کی تعمیر و تشکیل سے عاری ہے اسے خارج از ادب سمجھا جائے تو مناسب ہوگا، اردو شاعری میں کفر و الحاد کو عہد قدیم کے نامور شعرا

ایسا کیوں کرتے ہیں اگر مرزا صاحب نے برا کیا اور ہم بھی ایسا ہی روا رکھیں تو ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا؟ ہم چاہتے تو ان کو سزا دے سکتے تھے ان پر ہتک عزت کا دعویٰ بھی کر سکتے تھے مگر ہم نے بہتر معاف کرنا چاہا اور ایسا اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں کیا اللہ کی مرضی ہے اس بندے کا جو بھی عمل پسند آئے اللہ سے قریب کرنے کو اللہ کی تلقین کافی ہے اللہ کی راہ پر چلنا ہی اسے بندے سے قریب کرتا ہے اور اللہ خوش ہو کر رحمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے ہم اللہ کے قریب ہونے کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ اللہ بھی ہم سے قریب ہے کہ نہیں اللہ کی ہدایات پر عمل پیرا ہونا اللہ کی قربت حاصل کرنا ہے ایک بندے کا بہتر عمل اللہ کی مرضی کو پورا کرنا ہے اللہ کی مرضی سب باتوں سے زیادہ اہم ہے۔“ سیف صاحب نے کہا تھا اور حکمت صاحب نے سر ہلا یا تھا۔

”بے شک ایسا ہی ہے ویسے نواب صاحب آپ سے ایک بات کرنا چاہتے تھے ہم۔“ حکمت صاحب کچھ تذبذب کا شکار دکھائی دیے تھے۔

”جی کہیے۔“ نواب صاحب ہمدن گوش ہوئے تھے۔

”ہم آپ سے عین بیٹی کی بات کرنا چاہتے تھے۔“ حکمت صاحب نے مدعا بیان کیا تھا۔

”عین کی بات۔“ نواب صاحب سمجھ نہیں تھے۔

”کھل کر کہیے حکمت صاحب بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی عین بیٹی سے متعلق کیا بات کرنا چاہتے تھے آپ۔“ نواب صاحب نے پوچھا تھا اور حکمت صاحب گویا ہوئے تھے۔

”در اصل معاملہ یہ ہے کہ عین بیٹی۔“ تبھی آہٹ ہوئی تھی اور دونوں نے چونک کر دیکھا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



لے موضوع بنانے سے گریز کیا ہے اردو ادب کے ان معزز شاعر غالب کے کچھ اشعار کو ہم کفر والی پر مبنی نہیں کہہ سکتے اس معاملے میں دو نظریات ہو سکتے ہیں مگر غالب کے ان اشعار کا مقصد محض شوخی و طرافت تک محدود ہے کیونکہ غالب کے ہی صوفیانہ اشعار بلندی فکر میں اس درجہ تک پیچھے ہوتے ہیں کہ کہیں سے بھی ان کا عقیدہ تو حید متزلزل معلوم نہیں ہوتا بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے اور ہم تقسیم پاکستان کی بات کر رہے تھے وسائل کی بات کر رہے تھے نواب سیف نے کہا تھا اور حکمت صاحب نے یقین دیا تھا۔

”اور آپ کے سدھی کی بات ہو رہی تھی ویسے آپ کے سدھی عجیب گھاگ انسان ہیں انہوں نے جو چال چلی آپ نے اس کو بے نفاست سے ختم کر دیا مگر ہمیں نہیں لگتا ایسا انسان معافی کے لائق ہے آپ نے سانپ کو دوسری بار ڈنگ مارنے کا موقع دیا ہے اللہ خیر کرے۔“ حکمت صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا تھا اور نواب صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے حکمت صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے تھے۔

”ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ ناگ کا سر پکچل دیتے اور اسے دوسرا موقع نہ دیتے آپ کے پاس موقع تھا آپ ثبوتوں کی بنیاد پر ان حضرت کو چھٹی کا دودھ یا دولا سکتے تھے ان کو سبق ملنا بنتا تھا اتنی بڑی سازش رچی انہوں نے کہ آپ کے خلاف اگر وقت پر ثبوت اکٹھے نہ ہوتے تو سوچے کیا سے کیا ہو سکتا تھا۔“ حکمت صاحب حمایت کرتے ہوئے گویا تھے نواب صاحب نے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کو دیکھا تھا۔

”جانے دیجیے حکمت صاحب بندے اور اللہ میں ہی فرق ہے کہ بندہ انسان کی خامیاں گننے، شمار کرنے کا عمل ہمیشہ جاری رکھتا ہے اور اللہ کی ذات ہر خطا کو معاف کر دیتی ہے اور پھر دہرائی نہیں اللہ ہماری ہزار خطائیں معاف کرتا ہے اور جتنا تا نہیں پھر ہم بندے

بے نور قندیل

سلیم اختر

چراغ اپنے ارد گرد روشنی بکھیرتا ہے اندھیرے میں راستہ دکھاتا ہے، مگر وہ ایسی قندیل تھی جو روشنی ہونے کے باوجود بے نور تھی۔ ایک بدنصیب کی داستان الم

وہ دوسرے دہائیوں کی تلاش میں پاکستان آئی تھی

تقسیم ہند سے قبل میرے خاندان کے زیادہ تر افراد میرٹھ میں رہتے تھے اور سب کے سب اچھی اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ملک تقسیم ہوا تو بہت سے مسلمانوں کے ہمراہ ہمارے خاندان کے کئی افراد بھی پاکستان جانے کو تیار ہو گئے مگر میرے دادا جان نے میرٹھ میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے بھائیوں اور دیگر عزیزوں نے بہت اصرار کیا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ پاکستان چلیں لیکن انہوں نے باپ دادا کا بنایا ہوا گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کوئی بھی فرد ان کو قائل نہ کر سکا۔

دادا جان کے بیٹے یعنی میرے ابا جان کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ پاکستان جا کر آباد ہوں۔ مگر باپ کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہ تھی لہذا خاموشی اختیار کر لی۔ بعد میں جب ان کی اولاد ہوئی تو انہوں نے اپنے بچوں کی شادیاں بھی وہیں مسلمان خاندانوں میں کر دیں۔ جب میں نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت دادا اور دادی دونوں ہی اگلے جہان سدھار گئے تھے۔ میرے ابا جان حیدر آباد کن میں ملازمت کرتے تھے اس لئے میں امی اور بہن بھائی بھی ان کے ساتھ حیدر آباد ہی میں رہتے تھے۔

میری امی کے کئی عزیز پاکستان میں تھے۔ میں، ابا جان اور امی جان دونوں کی زبانی اپنے پاکستانی رشتے داروں کے تذکرے سنی رہتی تھی۔ خطوط بھی پڑھتی تھی اور تصویریں بھی دیکھتی تھی اس لئے میرا بھی جی بہت چاہتا تھا کہ میں بھی پاکستان جاؤں، اس پاک سرزمین کو دیکھوں اور اپنے رشتے داروں سے بھی ملوں لیکن میری خواہش پوری ہونے

کی امید نہیں تھی کیونکہ ہمارا خاندان مالی لحاظ سے بہت ہی کمزور تھا۔ ابا جان اکثر بیمار رہتے تھے۔ بس دال روٹی چل رہی تھی۔ ابا جان کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان جائیں مگر حالات اور جیب اجازت نہ دیتے تھے۔ ہم لوگ صرف تنہا ہی کر سکتے تھے، خواب ہی دیکھ سکتے تھے۔ ان خوابوں کی تعبیر پانا ہمارے لئے ناممکن تھا۔ میں بہن بھائیوں میں بڑی تھی اس لئے میں اپنے گھر کی حالت کو دیکھ کر بہت ہی کڑھتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی ملازمت کروں اور ابا جان کا ہاتھ بٹاؤں۔ ان کا بیٹا بنوں کیونکہ میں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ مگر ابا جان مجھے ملازمت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ خود دن رات کام کر کے ہمارے ضروریات پوری کرتے تھے۔ وہ بظاہر ہنستے مسکراتے تھے لیکن میں اور امی جانتی تھیں کہ بیماری ان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ کام کی زیادتی اور بہتر غذا نہ ملنے کی وجہ سے ان کی صحت روز بروز گرنی جا رہی تھی۔

ان دنوں مجھ سے چھوٹی بہن مریم میٹرک کر چکی تھی جب کہ بیٹائی انور آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میں گھر پر ہی رہتی تھی۔ امی اور ابا کو میری شادی کی فکر تھی اور وہ میرے لئے کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھے کہ سب کچھ دھڑے کا دھرا رہ گیا۔ ابا جان زندگی سے نانا توڑ گئے۔ ہم یتیم اور بے آسرا ہو گئے۔ آپس اور انسو ہمارا مقدر بن گئے۔ امی کے عزیزوں نے زبانی طور پر تو ہماری خوب دلجوئی کی لیکن کسی نے عملی طور پر ہماری مدد نہ کی۔ ہر ایک نے آنکھیں

میری امی کے کئی عزیز پاکستان میں تھے۔ میں، ابا جان اور امی جان دونوں کی زبانی اپنے پاکستانی رشتے داروں کے تذکرے سنی رہتی تھی۔ خطوط بھی پڑھتی تھی اور تصویریں بھی دیکھتی تھی اس لئے میرا بھی جی بہت چاہتا تھا کہ میں بھی پاکستان جاؤں، اس پاک سرزمین کو دیکھوں اور اپنے رشتے داروں سے بھی ملوں لیکن میری خواہش پوری ہونے



بھیر لیں۔ امی بہت پریشان رہنے لگیں کہ اب زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی؟ ان کے پاکستان میں رہنے والے عزیزوں کو پتا چلا تو سب نے تعزیت کے خط لکھے اور یہ پیشکش کی کہ ہم پاکستان آجائیں تو وہ ہمیں سہارا بھی دیں گے اور ہمارے دکھ درد بھی بانٹ لیں گے۔ ابا کے رشتے داروں نے بھی ایسے ہی خطوط لکھے تو میرا دل پاکستان جانے کو بے چین ہو گیا مگر نہ جانے کو میں امی جان نے پاکستان جانے کی بجائے میرے ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ہم لوگ میرٹھ لوٹ آئے۔

میرٹھ میں امی کے منع کرنے کے باوجود میں نے سروس کی تلاش شروع کر دی کیونکہ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ دو چار ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ بھی معقول تھی اس لئے گزر بسر بہتر انداز میں ہونے لگی۔ امی کو اب میری شادی

کی فکر تھی مگر میں نے عہد کر لیا تھا کہ پہلے مریم اور انور کی شادی کروں گی۔ بعد میں اپنی شادی کا سوچوں گی۔ قدرت نے مجھے اتنا حسین تو نہ بنایا تھا پھر بھی میرے حسن میں ایک کشش اور رعنائی تھی۔ اس کا احساس مجھے سروس کرنے کے دوران میں ہوا تھا۔ میرے کئی چاہنے والے پیدا ہو گئے تھے جن میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ وہ میرے حسن کے قیدے کہتے تھے۔ میری شکل ایک بھارتی اداکارہ سے کافی حد تک ملتی تھی اس لئے لوگ میرے اصلی نام کی بجائے مجھے اسی اداکارہ کے نام سے پکارنے لگے تھے مگر مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ میں محبت کو ایک فضول شے سمجھتی تھی اور صرف یہ جانتی تھی کہ روٹی ہی محبت ہے۔ بھوک مٹ جائے تو ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے۔ مجھے تو صرف ماں، بہن اور بھائی سے محبت تھی اس لئے میرے ذہن میں کوئی آئیڈیل نہیں تھا۔

میں تو ماں اور بہن بھائی کے لئے زندہ تھی۔

تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے میں، میں نے مریم کا جہیز تیار کر لیا اور پھر وہ جہیز جو امی نے میرے لئے بنایا ہوا تھا، وہ بھی مریم کو دے دیا اور جلد ہی اس کی شادی کر دی۔ مریم اپنے گھر بہت خوش تھی اور یہی میری خوشی تھی۔ انور نے بھی الف اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے مگر اسے میری فکر کھائے جا رہی تھی کیونکہ وہ بھائی تھا۔ بھائی جو بہنوں کا ماں اور ایسے سائبان ہوتے ہیں جہاں سرد اور گرم ہواؤں کا گزر نہیں ہوتا، جہاں موسم نہیں بدلتے، جہاں سدا ایک ہی موسم رہتا ہے۔ چاہت کا موسم، محبت کا موسم.....

انور بھی ایسا ہی بھائی تھا۔ وہ سروس کی تلاش میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے سروس مل جائے تو وہ میری نوکری چھڑوا دے۔ انہی دنوں میں پاکستان کے شہر راولپنڈی سے میری امی کی ایک خالہ زاد کا بیٹا شیراز ہمارے پاں آ گیا۔ شیراز کی ماں اکثر میری امی کو خط لکھا کرتی رہتی تھی۔ ان میں شیراز اور اس کے دیگر بہن بھائیوں کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ شیراز کی تصویر بھی میں نے دیکھ رکھی تھی۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور خاصا وجیہ جوان تھا مگر میں نے اس کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا اور نہ ہی اس کی کبھی ضرورت محسوس کی تھی۔ شیراز بغیر اطلاع کے آ گیا تھا۔ میں اسکول سے واپس گھر میں داخل ہوئی تو انوار نے مسرت بھرے لہجے میں بتایا۔ ”باجی! پاکستان سے مہمان آئے ہیں۔“ میں دھک سے رہ گئی اور دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”کون؟ کون آیا ہے؟“

”خالہ زبیدہ کا لڑکا شیراز آیا ہے۔ وہ آپ کا باجی مریم کا بھی پوچھ رہے تھے۔“

شیراز کا نام سن کر نہ جانے کیوں مجھے شرم ہی آگئی پھر بھی میں ہمت کر کے اسے سلام کرنے اس کمرے میں چلی گئی جہاں وہ امی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا تو امی نے میرا اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”شیراز! یہ میری بڑی بیٹی سلی ہے اور سلی یہ شیراز ہے۔ زبیدہ کا بیٹا! راولپنڈی پاکستان سے آیا ہے۔“

”آپ کا سفر کیسا گزرا۔“ میں نے سوال کیا۔

”بہت اچھا۔ دراصل میرا آپ لوگوں سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ دوسرے میں بھارت کی سیر بھی کرنا چاہتا تھا اس لئے چلا آیا ہوں۔ آپ لوگوں کو زحمت ہوگی۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کیا؟

”نہیں شیراز بھائی! زحمت کیسی؟ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ آپ جتنے دن چاہیں، یہاں رہیں۔ انوار آپ کو سیر بھی کرائے گا۔“

میرے بھائی کہنے پر وہ چونک سا گیا۔ میں نے جلدی ہی محسوس کر لیا کہ شیراز بھی ان عام لڑکوں جیسا ہے جو لڑکی کو دیکھتے ہی لٹو ہو جاتے ہیں۔ اس کی نگاہیں مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھیں پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے خالہ اور دیگر عزیزوں کی خیریت دریافت کی اور پھر باتوں باتوں میں جب میں نے اسے یہ بتایا کہ پاکستان جانے اور اس پاک سرزمین کو دیکھنے کی مجھے بہت خواہش ہے تو وہ کہنے لگا۔ ”تمہاری خواہش ضروری پوری ہوگی سلی! آپ سب لوگ میرے ساتھ پاکستان چلیں۔ وہاں ہمارا بہت بڑا گھر ہے۔ اسلام آباد بھی نزدیک ہی ہے۔ میں آپ کو وہاں کی بی بھر کے سیر کراؤں گا۔“

میں نے یہ اندازہ لگالیا کہ شیراز باتیں بہت زیادہ کرتا ہے اور باتوں سے ہی دوسروں کا دل جیتنا بھی جانتا ہے۔ اس کی باتیں سننے کو جی چاہتا تھا مگر مجھے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اس کی باتیں سنوں یا اس کے ساتھ کہیں گھومنے جاؤں۔ اگلے روز میں نے اسکول جانے سے قبل کچھ رقم انوار کو دی اور اسے تاکیدی کہ شیراز کا خیال رکھے۔ وہ ہمارا مہمان ہے۔ مہمانداری میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ اگر وہ کوئی اور شہر بھی دیکھنا چاہے تو ضرور دکھائے۔ اس روز میں اسکول سے واپس آئی تو انوار نے بتایا کہ وہ شیراز کو سیر کرانے لگیا تھا مگر ابھی ایک دو گھنٹیں ہی دیکھی ہیں۔ شیراز بھائی کا ایک ماہ تک رہنے کا ارادہ ہے۔ وہ مجھے کہتے ہیں کہ میرے ساتھ پاکستان چلو مگر میں نے انکار کر دیا ہے کہ جب تک میں اپنے ہاتھوں سے نہ کمانے لگوں، پاکستان نہیں جاؤں گا۔ انوار نے شیراز کی بہت تعریفیں کیں کہ شیراز کہتا ہے کہ وہ کسی انڈین مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا تاکہ انڈیا آنا جانا لگا رہے اور سیر بھی ہوتی رہے۔

دیکھنے کی آرزو ہے۔ تم ماں، بہن اور بھائی سے دور ہو جاؤ گی لیکن پاکستان دور نہیں۔ جیب میں پیسے ہونے چاہئیں۔ پیسے فاصلوں کو ختم کر دیتے ہیں۔“

میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے کیا جواب دیتی؟ اگر ماں راضی تھی تو میں بھلا کیسے انکار کرتی۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ”شیراز! ایک بار پھر سوچ لو۔ بعد میں تمہیں پچھتانا نہ پڑے۔“

”میں نے بہت غور کے بعد فیصلہ کیا ہے سہلی!“

شیراز نے مجھے قائل کر لیا۔ میں جو محبت کو فضول سمجھتی تھی اب شیراز کی محبت یا کر ہواؤں میں اڑنے لگی۔ میں نے اسکول سے چند دنوں کی چھٹی لی اور شیراز کو قدرت کی طرف سے ایک انعام سمجھ کر قبول کر لیا۔

☆☆☆

شیراز نے امی سے بات کی تو وہ کہنے لگیں۔ ”شیراز! ایسی باتیں تو والدین کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے زبیدہ اگر نہیں آتی تو اسے کم از کم خط تو لکھ دینا چاہئے تھا۔ اگر پہلے پتا ہوتا تو میں کچھ تیاری کر لیتی۔ میں سہلی کو خالی ہاتھ کیسے رخصت کروں گی؟“

”خالہ جان! آپ کسی باتیں کرتی ہیں؟ میں امی سے اجازت لے کر آیا تھا اور پھر یہ تو گھر کا معاملہ ہے۔ آپ کی دعاؤں سے میں خاصا کما تا ہوں۔ زبور بھی خود بخوالوں گا۔ باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں، صرف سہلی چاہئے مجھے۔ سہلی ہی میرا سب کچھ ہے۔ بس آپ بسم اللہ کریں کیونکہ مجھے دس دن بعد واپس جانا ہے۔ میری چھٹی اتنی ہی ہے۔“

”امی نے شیراز کی بات مان لی اور پھر ایک شام میں سہلی سے سہلی شیراز بن گئی۔ شادی نہایت سادگی سے ہوئی جس میں ہماری برادری کے لوگ شامل تھے۔ پہلی رات، ہم نے ڈھیروں باتیں کیں۔ مستقبل کے حسین خواب سجائے۔ شیراز کی محبت بھری باتیں سن کر یوں لگا جیسے میں نے چاند پر قدم رکھ دئے ہیں۔“

شیراز کی چھٹی ختم ہوئی تو وہ پاکستان چلا گیا اور میں اس کے انتظار کی آگ میں جلنے لگی۔ میں شیراز کے ساتھ نہیں جاسکتی تھی کیونکہ قانونی کارروائی اتنی جلدی مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ شیراز میرا کیس تیار کر کے جمع کر گیا تھا۔ اس نے پاکستان پہنچنے ہی مجھے خط لکھا۔ ”سہلی! تمہارے بغیر میری

میں نے انوار اور شیراز کی ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ میں تو یہ جانتی تھی کہ مہمان کی جی بھر کر خدمت کی جائے تاکہ وہ اچھی یادیں اور اچھا تاثر لے کر پاکستان جائے۔ اسے اچھیت کا احساس نہ ہو، میں نے اسکول کے لکچیز سے کچھ رقم ایڈوانس لے لی تھی تاکہ شیراز کی مہمان نوازی پر خرچ کر سکوں۔ امی بھی اس کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ وہ انہی کے ساتھ زیادہ کپ شب لگاتا تھا۔ میں شروع ہیں سے ریزرو ہی رہتی تھی۔ آٹھ دس دن گزر گئے تھے، میں نے کبھی بھی شیراز سے بے تکلف بات چیت نہ کی تھی جب کہ شیراز مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ وہ جب بھی مجھے اسکول میں ملے گا تو اپنی جاہت کا اظہار کرے گا پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک روز میں اسکول سے چھٹی کر کے نکل ہی رہی تھی کہ شیراز کو اسکول کے گیٹ کے قریب کھڑے پایا۔

”شیراز! آپ یہاں، کیسے آتا ہوا؟“

”آج میرا سیر کرنے کو جی چاہ رہا تھا کیونکہ موسم بہت اچھا ہے۔“

”تو انوار کے ساتھ چلے جاتے۔“ میں نے جان بوجھ کر کہا۔

میں روز روز انوار کے ساتھ جا کر بور ہو گیا ہوں۔ آج میں آپ کے ہمراہ سیر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ نے تو ایک روز بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔“

میں انکار نہ کر سکی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم ایک کینے میں آ گئے۔ میں نے کھانے پینے کا آرڈر دے دیا۔ میں کھانے پینے کے بعد جا راز جلد گھر آنا چاہتی تھی مگر شیراز جان بوجھ کر وقت کو طول دے رہا تھا اور پھر شیراز نے وہ بات کہہ دی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی محبت کے بڑے بڑے دعوے کئے اور پھر کہنے لگا۔

”سہلی! تم اجازت دو تو میں خالہ سے بات کروں۔ ویسے تمہاری اجازت کے بغیر ہی ان سے اشارہ کنائے میں بات کر چکا ہوں۔ وہ راضی ہیں لیکن تمہاری رضامندی کی ضرورت ہے۔ دیکھو سہلی! انکار نہ کرنا ورنہ میں تمام عمر شادی نہ کروں گا۔ اب تمہیں میری بیوی بن کر میرے ساتھ پاکستان چلنا ہوگا۔ ویسے بھی تمہیں مسلمانوں کا پاک وطن

زندگی سونی سونی لگتی ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اس لئے تم جلدی سے آ جاؤ۔“

میں نے کوشش کی اور جلدی ہی میرے دیزے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں نے پاکستان جانے کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ میری دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ میں نے پاکستان جانے کا جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر مجھے مل رہی تھی۔ اب تو وہاں میرا مجازی خدا بھی تھا جس کے سنگ مجھے تمام عمر گزارنا تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر امی، مریم اور انوار کے علاوہ کچھ اور رشتہ دار بھی آئے ہوئے تھے۔ مریم، بہنی سے مجھے ملنے آئی تھی۔ انوار کو بھی سر سول مل گئی تھی اس لئے میں مطمئن تھی کہ گھر میں مالی پریشانی نہیں ہوگی مگر اپنے پیاروں سے جدائی کا احساس میرا دل چہرے جا رہا تھا۔ میں امی کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اپنوں سے جدائی نے میری آنکھیں ساون بھادوں بنا ڈالیں۔ ٹرین چل پڑی تو آہستہ آہستہ سب کے چہرے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سسکتے لگی۔

☆☆☆☆

لاہور ریلوے اسٹیشن پر شیراز مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ اس نے راولپنڈی جانے والی ریل کار کی سیٹیں بک کر ارکھی تھیں۔ راستے میں شیراز نے مجھے جو کچھ بتایا وہ سن کر میں پریشان ہو گئی۔ وہ کہنے لگا۔

”سلمیٰ! میں نے ابھی تک اپنے گھر والوں کو اپنی اور تمہاری شادی کا نہیں بتایا ہے اس لئے کہ میری امی میری شادی کسی اور جگہ کرنا چاہتی ہیں مگر میں ان کو نالتا آرہا ہوں۔ مجھے تمہارا انتظار تھا کہ تم آ جاؤ تو پھر میں اپنی تمام کہانیاں بتاؤں گا۔ میں تم سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے تمہیں حقیقت نہ بتائی مگر تم فکرو نہ کرو۔ میری امی جب تمہیں بہو کے روپ میں دیکھیں گی تو سب کچھ بھول کر تمہیں گلے لگائیں گی۔ انہیں تمہاری آمد کا معلوم ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتیں کہ تم میری بیوی ہو۔“

اس لمحے پہلی بار مجھے شیراز پر غصہ بھی آیا اور نفرت بھی محسوس ہوئی کیونکہ میں خود جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ میں بہت پریشان ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”شیراز! تم نے بہت ہی غلط کیا کہ اپنے والدین کو نہیں بتایا۔ ہم نے شادی کی ہے کوئی

گناہ نہیں کیا۔ اگر تمہارے گھر والوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا؟“

”کچھ نہیں ہو گا سلمیٰ! میں جو ہوں تمہارے ساتھ پھر تم کیوں فکر کرتی ہو؟“

شیراز تمام راستے مجھے تسلیاں اور دلا سے دیتا رہا۔ یہاں تک کہ گاڑی راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ وہاں کوئی اور مجھے لینے نہیں آیا تھا۔ وہاں سے شیراز مجھے لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا گھر ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی ایک محلے موہن پورہ میں تھا اس لئے مجھے پیدل ہی تنگ اور تاریک سی گلیوں میں لے گیا۔ اس کا مکان پرانی طرز کا تھا۔ بوسیدہ بھی تھا۔ شیراز کے بہن بھائیوں سے بھی تعارف ہوا۔ خالہ امی اور دیگر رشتے داروں کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں انہیں ہر ایک کے بارے میں بتاتی رہی۔ جلد ہی مجھے احساس بھی ہو گیا کہ ان میں سے کسی کو بھی میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔ گھر میں غربت اور جہالت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ شیراز نے یہ بھی اعتراف کر لیا تھا کہ اس کی آمدن معمولی سے ہے۔ وہ کسی درکشاب میں کام کرتا تھا جہاں سے اسے پچاس روپے روزانہ مل جاتے تھے۔ شیراز کے دیگر بہن بھائی بھی ان پڑھ ہی تھے اور ادھر ادھر مزدوری کر کے گزارہ کر رہے تھے۔ شیراز کے والد بھی کپڑے کے ایک مل میں معمولی ملازم تھے۔ یہ باتیں اب اس گھر میں آ کر مجھے معلوم ہوئی تھیں۔

☆☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شیراز کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ وہ میرا شوہر تھا اور ہم کئی ماہ بعد ملے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ رات ہم ایک ہی کمرے میں میاں بیوی کی طرح گزاریں۔ خود میں بھی یہی چاہتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خالد اور خالو کو بتایا جائے کہ ہم میاں بیوی ہیں اور ہماری شادی ہو چکی ہے لیکن شیراز میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی جبکہ میں پہلے ہی شیراز کو بتا چکی تھی کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے اور میں پہل نہیں کروں گی۔

رات جب سب سونے کی تیاریاں کرنے لگے تو شیراز نے ماں باپ کو حقیقت بتادی جس کی تصدیق میں نے بھی

اور شیراز ان کے لئے بوجھ بن گئے تھے۔ شیراز نے اسی محلے میں ایک چھوٹا سا مکان لے لیا اور ہم دونوں وہاں رہنے لگے۔ نئے مکان میں آکر خالہ کے ظلم و ستم اور طعنوں سے تو نجات مل گئی مگر شیراز کی عادات خراب تر ہوتی چلی گئیں۔ میں نے اس پر بھرپور توجہ دی کہ وہ منہجصل جائے مگر اس پر میری کسی بات اور نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ آمدن کم اور خرچ بڑھنے لگا تو گھر کی حالت بھی خراب ہونے لگی اس لئے میں نے سروس کی تلاش شروع کر دی۔ شیراز بھی اس کے حق میں تھا میں سروس کر لوں۔ شیراز کے تمام وعدے اور قسمیں دم توڑ گئیں۔ میں جو یہ سمجھتی تھی کہ میں نے آسمان پر قدم رکھ دیئے ہیں، زمین کی خاک ہو کر رہ گئی۔ میرے تمام سندس پسنے ٹوٹ گئے۔ بہاروں نے خزاؤں کا روپ دھار لیا۔

جلد ہی مجھے ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت مل گئی۔ یوں زندگی کی گاڑی کچھ بہتر انداز میں چلنے لگی لیکن شیراز نے اس آمدنی کا غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس نے کام پر جانا ہی چھوڑ دیا اور روزانہ مجھ سے نشے کے لئے رقم طلب کرنے لگا۔ شروع شروع میں تو میں اسے کچھ رقم دے دیتی تھی مگر پھر میں نے ہاتھ روک لیا کیونکہ اس طرح تو میں اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے جہنم بنا رہی تھی۔ میں نے شیراز کو علاج کرانے کا مشورہ دیا مگر وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کو راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ اسے روزانہ پچاس روپے کی ضرورت پڑتی تھی۔ جب میں نے رقم دینے سے انکار کیا تو وہ گالم گلوچ پر اتر آیا اور پھر ایک دن تو اس نے انتہا کر دی۔ اس نے محبت کا وہ بت اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا جس کو اس نے خود ہی تراشا تھا۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھا یا اور مجھے بری طرح پیٹ ڈالا۔ اور میری انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتار کر لے گیا اور فروخت کر ڈالی۔ اس روز میں بہت روٹی مجھے تسلی دینے اور میرے آسوپو چھنے والا بھی لگتی نہ تھا۔ زندگی میرے لئے یوں عذاب بن جائے گی، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

جس روز شیراز کو نشہ نہ ملتا، رقم نہ ملتی تو وہ گھر کے برتن اٹھا کر لے جاتا اور فروخت کر ڈالتا۔ میں اندر ہی اندر کڑھنے لگتی۔ میں نماز پڑھتی اور رو رو کر پروردگار سے دعائیں مانگتی۔ ”اے پروردگار! اپنے پیارے حبیب ﷺ

کر دی۔ اچانک یہ خبر سن کر خالو تو کچھ نہ بولے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے کمرے میں چلے گئے مگر خالہ نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ انہوں نے صرف شیراز کو بلکہ مجھے بھی کھری کھری سنا ڈالیں۔ انہوں نے میری ماں کو بھی معاف نہ کیا۔ شیراز نے ان کی منتیں کیں۔ میں نے بھی بہو کی حیثیت سے ان کا دل جیتنا چاہا مگر ان کا پارہ نہ اتر ا۔ وہ دیر تک مجھے اور میری ماں کو برا بھلا کہتی رہیں۔ انہوں نے مجھ پر آوارہ اور بدچلن ہونے کے الزامات بھی لگا ڈالے۔ وہ بوٹی رہیں اور شیراز مجھے کمرے میں لے گیا پھر اندر سے کنڈی لگا دی۔ میری آنکھیں برسنے لگیں۔ شیراز نے مجھے تسلیاں دیں اور دلا سے دیتا رہا کہ وہ میرا ساتھ بھی نہیں چھوڑے گا مگر مجھ لگ رہا تھا کہ میں نے شیراز کے ساتھ شادی کر کے اور پاکستان آکر غلطی کی ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی شیراز کے نام کر دی تھی۔ اب میرا رنا اور جینا اسی کے ساتھ تھا۔

میں نے لاکھ کوشش کی کہ خالہ کی غلط فہمی دور کر سکوں مگر انہوں نے شیراز کی غلطی کو میری غلطی جان کر معاف نہ کیا۔ جلد ہی محلے والوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ میں شیراز کی بیوی ہوں۔ محلے کی عورتیں میری تعریف کرتیں تو خالہ میری برائیاں کرنے لگتیں۔ بھی سیدھے منہ مجھ سے بات نہ کرتیں۔ میری ہر بات اور ہر کام میں وہ نقص نکالنے لگتی تھیں۔ وہ اکثر کہتی تھیں کہ میں سسکی کو اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی اور شیراز کی دوسری شادی اپنی مرضی سے کروں گی۔ اس جہنم میں جلتے ہوئے چار ماہ بیت گئے تھے کہ ماں کی موت کی خبر نے میرے زخموں کو ہرا کر دیا۔ اس روز میں بہت روٹی تھی کہ میں کتنی بد نصیب ہوں کہ اپنی ماں کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکی۔ میں نے تو سکھ پانے کی خاطر ان سے جدا ہونا گوارہ کیا تھا وہ خود بھی مجھے ٹھکسی دیکھنا چاہتی تھیں مگر تقدیر نے مجھے دکھوں کے سمندر میں پھینک دیا۔

اوپر سے ماں کی موت نے مجھے اور نڈھال کر ڈالا۔ ابھی میں اس صدمے سے سنبھل نہ پائی تھی کہ تقدیر نے مجھے ایک اور گھاؤ لگایا۔ شیراز نشے کی لت میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے کام پر جانا کم کر دیا اور آوارہ دوستوں کے ساتھ مل کر اپنے جیون کو دھوئیں کی نذر کرنے لگا۔ ساتھ ہی خالہ نے شیراز کو اور مجھے گھر چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ میں

کے صدمے! شیراز کو راہ راست پر لے آؤ وہ نہ شرک کر دے۔“ مگر میری دعاؤں میں شاید اثر ہی نہ تھا کہ کوئی بھی دعا قبول نہیں ہو رہی تھی اور میں بد نصیبی کی چادر میں لپٹی جا رہی تھی۔

ایک روز شیراز باہر سے آیا تو وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ آتے ہی کہنے لگا۔ ”مسلمی! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ایک دوست کے ہاں جانا ہے۔“

”کون سا دوست ہے اور کیوں جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ میرا پرانا دوست اور کلاس فیلو ہے۔ وہ سعودی عرب میں ہوتا تھا۔ اب چھٹی گزارنے آیا ہوا ہے۔ عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ تمہیں بھی ساتھ لاؤں۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ مجھے سعودی عرب لے جائے گا۔“

میں نے شیراز کی باتوں کا یقین کر لیا۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور خوش خوشی شیراز کے ہمراہ چل پڑی۔ اتنے عرصے بعد میں شیراز کے ہمراہ پہلے بار کسی کے گھر جا رہی تھی۔ ساتھ ہی دعا میں بھی مانتی تھی کہ خدا کرے شیراز اسی طرح خوش و خرم رہے اور نشے سے نجات پالے۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا علاقہ تھا۔ آدھے گھنٹے سفر کے بعد ٹیکسی ایک بڑے سے مکان کے آگے رکھ گئی۔ مکان کے گیٹ پر ایک آدمی پہرہ دے رہا تھا۔ شیراز نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا کہ اسے گلستان سے ملنا ہے۔ اس نے ہمیں اندر جانا کی اجازت دے دی۔ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ میں یہ بھی کہ شیراز کا دوست سعودی عرب سے آیا ہے اور بہت امیر ہے اسی لئے اتنی بڑی کوٹھی بخوار بھی ہے چنانچہ میرے من میں کسی شک نے سر نہ اٹھایا۔ شیراز کے ہمراہ میں ایک کمرے میں داخل ہوئی تو دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ شکل ہی سے خطرناک لگ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میرے اندر شک نے جنم لے لیا۔

”خان! میں آگیا ہوں۔ معاف کرنا تھوڑی دیر ہو گئی۔“

شیراز نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ دیر تو کر دی ہے تم نے مگر مال اچھا لائے ہو۔“ وہ شخص اسے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔ اس کی نگاہیں میرے سر اُپے کا جائز

ہلے رہی تھیں۔

”جو کچھ تم نے بتایا تھا شیراز! یہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔“ دوسرا شخص بولا۔

”سودا تو پانچ ہزار میں طے ہوا تھا مگر میں تمہیں آٹھ ہزار دوں گا۔“ خان بولا اور پھر دوسرے شخص نے شیراز کے ہاتھوں میں نوٹ تھا دیے۔ شیراز نے نوٹ جیب میں ڈالے اور کمرے سے نکل گیا۔ شیراز ایسا بھی ہو سکتا ہے، شوہر اپنی بیوی کا سودا بھی کر سکتا ہے، میں نے تو بھی ایسا سوچا بھی نہ تھا مگر اب حقیقت آنکھیں کھولے سامنے کھڑی تھی۔ مجھ پر سکتہ سا طاری تھا۔ میں چاہہاں کچھ نہ کر سکی۔

میرے وہ خواب چمکانا چور ہو گئے جو میں نے اس پاک دھڑلی میں رہنے کے لئے دیکھے تھے۔ میں انہوں ہی کے ہاتھوں پر باد ہو گئی۔ شیراز نے میرا سودا کر ڈالا۔ کتنا ظالم اور بے درود تھا وہ شخص کہ شخص نشہ کرنے کی خاطر اس نے اپنی بیوی کو بی داد پر لگا دیا۔ میں ایک جال میں پھنس گئی جس میں صرف پھڑ پھڑایا جاسکتا تھا۔ رہائی نہیں مل سکتی تھی۔

شیراز کے جانے کے بعد میں بہت چینی چلائی۔ ہاتھ پاؤں مارے لیکن میں اپنے آپ کو ان درندوں سے نہ بچا سکی۔ میں ایک ہفتہ اسی کوٹھی میں ان کے رحم و کرم پر رہی پھر ایک شخص آیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ وہ میرے باپ سے بھی زیادہ عمر کا تھا اور میرا خیریدار بن کر آیا تھا۔ دولت اس کے گھر کی باندھی تھی۔ اس سے میرا فرضی نکاح پڑھایا گیا اور وہ مجھے وہاں سے لے کر ایک دوسرے شہر آ گیا۔ نکاح کے وقت میں نے پھر شور مچایا تھا کہ یہ نکاح نہیں ہو سکتا کیونکہ میں شیراز کی بیوی ہوں۔

”وہ تمہیں طلاق دے چکا ہے۔“ گلستان خان نے طلاق نامہ میرے سامنے کر دیا۔

شیراز نے واقعی مجھے طلاق دے دی تھی۔ نقدیر مجھے زخم پر زخم لگائے جا رہی تھی۔ وہ شخص جس کا نام فیروز تھا، مجھے اپنے ہمراہ لے کر لاہور آ گیا۔ اس نے دودن اپنی پیاس بجھائی اور پھر کہنے لگا۔ ”مسلمی! ماضی کو بھول جاؤ اور حال میں کم ہو جاؤ۔ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر رہا ہوں مگر پھر بھی تمہیں میرے ماتحت ہی رہنا ہو گا اور وہی کام کرنا ہو گا جو میرے کارندے تمہیں کہیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ یہاں تمہیں بے آبرو نہیں ہونا پڑے گا۔ میں نے جس کام کے

آنچل کی چاب سے لیک امانچل

ماہنامہ حجاب کرچی

شائع ہو گئے ہیں

ملک کی مشہور معروف فنکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ”حجاب“ آج ہی ہا کر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرائیں۔

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com

info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی
صورت میں

021-35620771/2

0300-8264242

لے کر خرید رہا ہے، وہ تمہیں میرے آدمی بتائیں گے مگر یاد رکھو، اگر مجھ گئے اور چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو پھر بہت برا ہو گا۔“

اور پھر اس شخص سے مجھے ایک شخص فضلو کے حوالے کر دیا۔ فضلو کا حلیہ فقیروں جیسا تھا اس کے ماتحت کچھ عورتیں اور بچے ہیک ماٹکنے کا کام کرتے تھے۔ فضلو نے تین ماہ تک مجھے تربیت دی۔ فضلو اصولی آدمی تھا۔ زبان کا پکا اور سچا تھا۔ وہ بری نگاہ سے کسی بھی عورت کو نہیں دیکھتا تھا۔ میرے ساتھ مجھی بیبی ہوا۔ میں ڈرتی تھی کہ کہیں فضلو مجھے کھلونا نہ سمجھ لے مگر اس نے میری طرف بری نیت سے نہ دیکھا لیکن اسے مجھ پر بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی کیونکہ میری حسین صورت کو بد صورت بنانا مشکل تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ جب میں دھندا کرنے نکلوں گی تو لوگ مجھے ہوس بھری نگاہوں سے دیکھیں گے مگر فضلو کہنے لگا۔ ”عزت بچانا چاہتی ہو تو ان عورتوں کی طرح ہو جا۔ میں عورت کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیتا کہ کوئی اس پر بری نگاہ ڈالے۔ میں تمہیں بھی ایسا بنا دوں گا کہ لوگ تم سے ہمدردی کریں گے۔“

فضلو نے میرا چہرہ بگاڑ ڈالا اور مجھے لنگڑا بھی کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے میری آواز بھی بدل ڈالی۔ اب اگر شیراز بھی میرے سامنے آجاتا تو شاید مجھے نہ پہچانتا۔ میرے پاؤں پر ایک مصنوعی زخم تھا جس کے باعث میں لنگڑا کر چلتی تھی مگر اس میں درد نہ ہوتا تھا۔

میرے علاوہ دیگر تین عورتیں اپنے کام میں ماہر تھیں۔ وہ بھی حالات کی ماری ہوئی تھیں۔ تقدیر انہیں فیروز اور فضلو تک لے آئی تھی۔ اب وہ ماضی کو بھول کر حال میں گم تھیں۔ ہیک ماٹکنے ہی ان کی زندگی تھی۔ سارا دن وہ بیبی دھندا کرتی تھیں۔ نوری ان سب میں سے تیز تھی اس لئے فضلو نے مجھے اس کے حوالے کر دیا کہ میں چند دن نوری کے ساتھ رہوں اور دیکھوں کہ وہ لوگوں کی جیبوں سے نوٹ کیسے نکھڑاتی ہے۔ نوری بہت ہی بد زبان اور بے ڈھنگی سی عورت تھی۔ بات کرے تو ایسا لگتا تھا جیسے اس نے لاشی باری ہو۔ اس کے ساتھ دن بھر سڑکوں پر لوگوں کو پکڑ پکڑ کر انہیں خیرات دینے پر مجبور کرنا نہایت ہی ذلت آمیز کام تھا مگر مجبور تھی۔ نوری دونوں ہاتھ جوڑتی اور زور زور سے

پیٹ پر ہاتھ مارتی اور لرزتی آواز میں بار بار ”اے باؤ! خیرات دے۔ بڑی زوروں کی بھول لگی ہے۔“ کہتی۔ کبھی سانسے والے کا ہاتھ پکڑتی کبھی پاؤں میں بیٹھ جاتی اور دونوں پاؤں پکڑ لیتی۔ لوگ اسے دھکارتے، انکی سیدھی باتیں کرتے، گالیاں بکتے لیکن نوری اس وقت تک اپنے شکار کا چھانچھوڑتی جب تک کہ وہ اس کی جیب سے کچھ نکلوانہ لیتی۔ میں دن بھر نوری کو یہی کرتے دیکھتی رہتی۔

.....☆☆☆.....

وہ میرا پہلا دن تھا۔ فضلہ نے ہدایت کی تھی کہ میں نوری کی حرکتوں کو سمجھوں اور سیکھوں مگر مجھے یوں لگا کہ میں یہ کام تمام عمر نہ کر پاؤں گی اس لئے میرا ذہن کسی اور طرف دوڑ رہا تھا۔ میں ان لوگوں سے نجات اور فرار کا منصوبہ بنا رہی تھی ورنہ اس زندگی سے تو بہتر تھا کہ میں خودکشی کر لوں۔ اس رات میں فرار ہونے کے منصوبے ہی بنائی رہی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان لوگوں سے کیسے نجات حاصل کروں اور اگر فرار ہو بھی جاؤں تو کہاں جاؤں؟ مجھے کون سہارا دے گا؟ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں کہ میں واپس میرٹھ چلی جاؤں۔

رات سوچوں میں گزر گئی۔ اگلی صبح میں پھر نوری کے ہمراہ دھندرا کرنے چل پڑی۔ ایک بھرے بازار میں نوری نے ایک شخص کا بازو تھام کر اسے روک لیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ ”بھوک لگی ہے تیرے بچے سلامت رہیں تیری جوڑی سلامت رہے۔“

”ہٹ سامنے سے۔“ اس شخص نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ مگر نوری اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ نوری کی تمام تر توجہ اس شخص پر تھی اس کا رخ بھی میری طرف نہیں تھا۔ میں نے موقع مناسب دیکھا اور فوراً ہی ہجوم میں گم ہو گئی۔ جلدی ہی میں دوسرے بازار میں پہنچ گئی۔ میں جلاری میں تھی۔ ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں سوار ہو گئی۔

”کہاں جاؤ گی؟“ ڈرائیور بولا۔

”بس! جلدی چلو اور چلے رہو۔“ میں نے کہا۔

اس نے ٹیکسی چلا دی مگر بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اس لئے پھر بولا۔ ”کہاں جاؤ گی تم؟“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

”کیا تم بھکارن ہو؟“

”ہاں میں بھکارن ہوں مگر مجھے زبردستی بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مجھ پر بہت ظلم ہو رہے ہیں۔ میں ایسی نہیں ہوں جیسا مجھے بنایا گیا ہے۔“ میں نہ چاہنے کے باوجود بھی اسے اپنی حقیقت بتائی۔

”اب کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے تمہیں؟“

”میری کوئی منزل اور ٹھکانا نہیں ہے۔ کہیں دور جا کر مجھے اتار دو تا کہ میں دوبارہ ان کے ہاتھ نہ آسکوں۔“

”لو کر دی؟“

”کر دوں گی مگر جہاں عزت اور احترام ہو۔“ ایسا کہتے ہوئے میری آنکھیں چھلک اٹھیں اور میری سسکیاں ٹیکسی کے اندر گونجنے لگیں۔

اس نے مجھے تسلی دی۔ ”آج کل کسی پر بھروسہ کرنا گناہ ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ تم دھوکا نہیں کرو گی۔ میں تمہیں اپنے گھر لے چتا ہوں جہاں صرف میرے پیار ماں ہے۔ تم اس کی خدمت کرو بدلے میں، میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔“

نہ جانے کیوں مجھے اس شخص کی باتوں سے سچائی کی خوشبو آئی کہ میں اس پر لوگوں میں اعتماد کر بیٹھی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اسے میں نے آپ بیتی سنا دی تو اس کی ماں اور وہ دونوں ہی دھبی ہو گئے۔ میں نے اس کی ماں کی خدمت کی تو ان کی صحت بہتر ہونے لگی اور پھر اس کے اصرار پر ہی میں نے ان کے بیٹے اکرم علی سے شادی کر لی۔

اکرم کا تعلق ایک کھاتے بیٹے خاندان سے تھا۔ گھرانہ کا اپنا تھا۔ اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ گاؤں میں کچھ زمینیں تھیں جن سے آمدنی ہوتی تھی۔ اکرم خود ایک سرکاری ادارے میں کام بھی کرتا تھا اور ٹیکسی بھی چلاتا تھا۔ ٹیکسی اس کی ذاتی تھی۔ اکرم نے اس سے قبل بھی شادی کی تھی۔ وہ بیوی بہت ہی بد زبان، جھگڑا لوار بد چلن بھی تھی۔ وہ اس کی برادری کی بھی مگر اس نے اس کے گھر کو جہنم بنا ڈالا تھا۔ مجبوراً اسے طلاق دینی پڑی تھی۔ اس وجہ سے ان کی برادری میں ناراضگی چل رہی تھی۔ اس کے سرال والوں نے کوئی دعویٰ بھی کر رکھا تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا تھا

اسی لئے اکرم کی ماں بیمار ہو کر چار پانی سے لگ گئی تھیں۔ انہیں اپنی سابقہ بھوسے بہت پیار تھا اور وہ اسے بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھیں مگر اس عورت نے اس گھر کو جہنم بنا ڈالا تھا۔ اکرم نے جب اپنی داستان سنا تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ ہم دونوں ہی دہمی تھے اس لئے ہمیں ایک دوسرے کا احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بہت ہی خوش تھے۔ اکرم کی ماں بھی مجھ سے بہت ہی خوش تھیں۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ مجھے اپنی ماں یاد آ جاتی۔ میں نے اس سے قہقہے دیکھ اٹھائے تھے، اب اتنے ہی سکھل رہے تھے۔ اکرم نے مجھے ڈیڑھ روپ چاہت اور پیار دیا کہ میری خزاں رسیدہ زندگی میں بہارا آگئی۔ اس عالم میں مجھے انہی بہن اور بھائی یاد آئے۔ میں نے ان کو دو تین خطوط لکھے مگر نہ جانے کیوں دونوں میں سے کسی کا بھی جواب نہ آیا تو میں پریشان ہو گئی مگر اکرم نے مجھے سلی دی اور کہنے لگا۔

”دوسلی! تم فکر نہ کرو میں تمہیں ان سے ملانے کے لئے میرٹھ لے چلوں گا اور کوشش کروں گا کہ ان لوگوں کو بھی یہاں ہی بلوالوں۔“

اکرم کی پہلی بیوی نورین اسی محلے میں رہتی تھی اور اب اس کی شادی ایک اور خاندان میں ہو گئی تھی۔ وہ لوگ ان کی برادری کے نہیں تھے۔ نورین کے شوہر کا خاندان کسی حد تک سیاست سے وابستہ تھا۔ اس کا ایک دیور کوئٹہ تھا اس لئے نورین اور اس کے گھر والوں کے فخرے زیادہ تھے۔ وہ ہر معاملے میں اکرم کی مخالفت کرتے تھے مگر اکرم کو کسی کی پروا نہ تھی کیونکہ اس کا دل صاف تھا۔ محلے کے لوگ اس کی بہت ہی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ محلے کے لوگوں کے کام آتا تھا۔ دو سال بعد ہم ایک بچی عذرا کے والدین بن گئے۔ اس روز بہت خوش تھی کہ میری متا کی تکمیل ہو گئی تھی۔ عذرا ابھی ایک سال کی ہی تھی کہ امی یعنی اکرم کی ماں چل بسیں۔ اس روز میں دھڑائیں مار مار کر روئی تھی۔ لگتا تھا آج میری ماں دوبارہ فوت ہو گئی ہے۔

عذرا کے بعد ہمارے آنگن میں دو پھول اور کھلے تو ہمارا گھر اتنا مکمل ہو گیا۔ عذرا کے بعد جمال اور پھر عالیہ پھولوں کی طرح ہمارے آنگن کو مہکانے لگے۔ میں بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں مصروف ہو کر ماضی کے

تمام دکھ بھول گئی۔ مالی لحاظ سے بھی ہم مضبوط ہو گئے تھے۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

ان دنوں عذرا میٹرک اور جمال آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ عالیہ ساتویں کلاس میں تھی کہ ایک قیامت سی آئی اور میرا سب کچھ لوٹ لے گئی۔ میرے سر کا تاج اکرم ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ میں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ تقدیر نے ایک ہی وار میں میرا بھرا برا گھر برباد کر دیا۔ دن اور رات روتے تڑپتے گزرتے مگر کرب تک۔ آہستہ آہستہ صبر اور قرار آنے لگا۔ میں نے بھی اپنے اندر ہمت پیدا کی اور یہ عہد کیا کہ بچوں کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گی۔ میں ان کی ماں ہی نہیں، باپ بھی بنوں گی۔

.....☆☆.....

عذرا میٹرک کا امتحان پاس کر کے گھر میں بیٹھ گئی۔ جمال نے پڑھائی جاری رکھی۔ جمال پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ اس کے علاوہ وہ نہایت ہی غیرت مند اور بہادر تھا۔ اپنے باپ کی کمی کا شدت سے احساس تھا۔ وہ جلد از جلد کسی مقام پر پہنچنا چاہتا تھا تا کہ گھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لے۔ عذرا تو چاہتی تھی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے مگر جمال نے اسے منع کر دیا کیونکہ وہ زمانے کے چلن سے واقف تھا۔ جمال نے ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد کسی سرکاری ادارے میں ملازمت کر لی تو ہمارے مالی حالات ٹھیک ہونے لگے۔ گھر میں پھر سے مسکرائیں بکھرے لگیں۔ جمال اب عذرا کے لئے ہر ماہ کوئی نہ کوئی چیز خرید لیتا تھا تا کہ جب اس کی شادی ہو تو رخصتی کے وقت جہیز دینا آسان ہو۔ عذرا کے لئے میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اس کی شادی کہاں کروں گی؟ ایک دو جگہ سے اس کے رشتے آئے تھے مگر میں نے ابھی تک حتیٰ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ عذرا نے رنگ روپ خوب نکالا تھا مگر کچھ دنوں سے عذرا کی طبیعت بوچھل سی رہنے لگی تھی۔ لگتا تھا، اس کی ساری شوخی ختم ہو گئی ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

”عذرا! کیا بات ہے؟ تم کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔“

”وہم ہے آپ کو امی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں“ عذرا

رس چوس ہی لیا۔ وہ ابھی عذرا سے محبت کرنے کا دعویدار تھا۔

عذرا اپنی بھول پر پچھتا رہی تھی مگر میں تو زمین کے اندر دھنستی جا رہی تھی کہ اب میں زمانے کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ روزِ محشر اکرم کے سامنے کیسے جاؤں گی؟ میں کیسی ماں ہوں کہ اپنی اولاد کی حفاظت بھی نہ کر سکی۔ دکھ درد اور ندامت سے میری آنکھیں برسے لگیں۔ عذرا نے ایک استحسان ڈال دیا تھا۔

میں جمال سے یہ بات چھپانا چاہتی تھی کیونکہ میں اس کی غیرت اور غصے سے واقف تھی۔ اسے معلوم ہو جاتا تو قیامت آجاتی۔ میں ماں تھی اس لئے میں نے بیٹی کے کرتوتوں پر بردہ ڈالنے کی کوشش کی مگر یہ گناہ ہی ایسا تھا جسے چھپانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ آخر کار جمال کو حقیقت معلوم ہو ہی گئی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خدا اور رسول کے واسطے دے کر اسے خاموش کیا تو اس نے صرف ایک ہی بات کہی کہ آپ کے عابد کے گھر جائیں۔ اس کے ماں باپ کو حقیقت بتائیں اور ان سے کہیں کہ وہ عابد اور عذرا کی شادی کر دیں۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو میں دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

عذرا بھی کہنے لگی۔ ”امی! عابد مجھے اب بھی چاہتا ہے۔ آپ اس کے گھر جائیں تو کسی، وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے گا۔“

اپنی اولاد کے مستقبل کی خاطر والدین اپنی عزت کا بھی خیال نہیں کرتے اس لئے میں ایک روز عابد کے گھر چلی گئی۔ یہ دروازہ عابد ہی نے کھولا تھا۔ اس کی ماں گھر ہی میں تھی۔ میں نے اس کی ماں کو تمام بات بتائی اور ساتھ ہی اپنے آنے کا مقصد بھی بتایا تو عابد کی ماں بھڑک اٹھی۔ اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اس کا بیٹا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھی مگر میں نے اس کی باتوں پر یقین نہ کیا اور کہا۔

”عابد ہی نے عذرا کو اجاڑ ہے اس لئے اب اسے اس کے ساتھ شادی کرنا ہوگی ورنہ میں قانون کی مدد لوں گی۔“ میرے یہ الفاظ سن کر وہ آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور دروازہ تک لے آئی اور چیخے ہوئے کہنے لگی۔ ”کل جا! میرے گھر سے منحوس بے غیرت بڑھیا۔ بے

نے آنکھیں جراتے ہوئے کہا۔

نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ گیا۔ میں نے اس عالم میں کہا ”بکواس مت کرو تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا ہے اور تم کہتی ہو میں ٹھیک ہوں، شام کو میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا۔ پیاری بڑھ گئی تو زیادہ پریشانی ہوگی۔“

عذرا نے خاموشی اختیار کر لی۔ شام کو میں نے زبردستی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ لیڈی ڈاکٹر کا کلینک گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس نے عذرا کا چیک اپ کیا اور پھر غذا کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے بولی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، پہلی بار ایسا ہوتا ہے۔“

”کیا..... پہلی بار..... کیا کہہ رہی ہو آپ!“ میں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”میں کہہ رہی ہوں کہ اپنی بہو کا خیال رکھیں۔ یہ ماں بننے والی ہیں۔ میں یہ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں۔ بازار سے لے لیتا۔“

میں نے غیر یقینی انداز میں ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اس سے پرچی لی اور عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔

گھر آ کر میں نے عذرا سے کہا۔ ”حرا حرا دی! مجھے بتا تو نے کیا کیا کھلا دیا ہے۔“

عذرا جواب دینے کی بجائے روئے لگی تو مجھے اور زیادہ غصہ آ گیا۔ ”بول ناں کیسی!“ میں نے آگ بگولا ہو کر جوتی اٹھالی اور اسے پینٹا شروع کر دیا۔ اس نے کچھ دیر مار کھائی اور پھر زبان کھولی تو مجھے زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میرے شوہر کی سابقہ بیوی کے موجودہ سرسرا والوں کے کسی عزیز کا گھر ہمارے گھر کے نزدیک ہی تھا۔ ان کا ایک جوان لڑکا تھا۔ محلے میں کسی شادی کے موقع پر عابد اور عذرا کی آنکھ لڑ گئی۔ عابد کی بہن فرح نے ان دونوں کو قریب لانا میں دلال کا کردار ادا کیا۔ فرح کبھی کبھی ہمارے گھر آتی تھی۔ وہ عذرا کی کلاس فیلو بھی تھی اور دوست بھی۔ عذرا نا سمجھ تھی۔ وہ عابد کی باتوں میں آگئی۔ فرح نے بھی اسے سبز باغ دکھائے۔ وہ راتوں کو چوری چھپے عابد سے ملتی رہی اور اپنا گوہر عصمت گنوا بیٹھی۔ عابد نے اسے جھوٹے وعدے کئے۔ وہ تو بھجور تھا جو اس کو کلی سمجھ کر اس کا رس چوسنا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے اس کا

میانوالی جیل میں بھیج دیا۔ جمال اب نیو سینٹرل جیل ملتان میں ہے اور سزا بھگت رہا ہے۔ کاش! جمال اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتا تو ممکن ہے میری زندگی میں کچھ سکون رہتا۔ جمال کے کئے کی سزا اب میں بھی بھگت رہی ہوں مگر اس میں بھلا جمال کا کیا قصور؟ غیرت مند بھائی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کی غیرت کا تقاضا یہ تھا۔ عابد اور عذرا دونوں سنگسار کئے جانے کے قابل تھے۔ محلے کے لوگ اب جمال کی تعریفیں کرتے ہیں۔ اس کی غیرت کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں مگر کیا فائدہ؟ میرا فیشن تو اڑ چکا۔ اب ہر طرف سوکھے پتے ہیں جو ادھر ادھر اڑتے رہتے ہیں۔

گھر میں جو کچھ تھا، اس میں سے کچھ تو جمال کے مقدمے میں خرچ ہو گیا تھا۔ جب تک مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوا تھا، میں اور عالیہ جمال سے ملنے جیل جاتی رہتی تھیں مگر جب جمال کو سزا ہوئی ہے اور وہ ملتان کی جیل میں گیا ہے، اس نے مجھے اور عالیہ کو وہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ جمال کو اس کے کئے کی بھی سزا مل گئی۔ کاش! یہ سب کچھ یہاں تک رہتا تھا۔ عابد قتل ہوا تھا تو میری بیٹی بھی تو مری تھی۔ مارنے والے کو بھی سزا مل گئی تھی مگر عابد اور اس کے خاندان نے اس پر بھی بس نہ کیا۔ انہوں نے اسے دشمنی کا رنگ دے دیا۔ میں ایک روز ان کے گھر بھی گئی۔ ان سے تعزیت بھی کی اور معافی بھی مانگی۔ بظاہر انہوں نے یہی کہا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اب اس قصے کو بھول جاؤ مگر انہوں نے دل کے اندر سب کچھ دبائے رکھا۔ وہ خود غرض ہو گئے تھے۔ یہ خود غرضی بھی کینسر سے کم نہیں ہوتی۔ اگر ایک بار دل کے نگر میں جگہ بنا لے تو پھر مروت کے سب گل بوئے سوکھ جاتے ہیں۔ ہمدردی اور خلوص کے گھنیرے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ محبت کا آشیانہ نکا نکا ہو کر بکھر جاتا ہے۔ باقی اگر کچھ بچتا ہے تو یہی قاتل جذبہ جو ایک روز پورے وجود پر چھا جاتا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے؟ میری تو تنہائی کے پتے پتے پر اس کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ میں قیامت تک نہیں بھلا سکوں گی۔

☆☆☆.....

عالیہ اب جوان ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کا شہر بھی عذرا جیسا ہو، میں جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتی

تھی۔ تجھے اپنی آوارہ بیٹی کے لئے کوئی اور رشتہ نہیں ملا تھا جو میرے گھر میں آگ لگانے آئی ہو، اب ادھر کا رخ کیا تو تیری ٹائیں توڑ دوں گی۔“

میں پتھر کا بت بنی گئی میں کھڑی تھی۔ زندگی بھر میں میری ایسی بے عزتی کسی نے نہیں کی تھی۔ اتنے میں عابد آگیا اور کہنے لگا ”بڑی بی! راستہ لو اپنا۔ یہ شریفوں کا گھر ہے۔ یہاں تمہاری وال نہیں گلے گی۔ کسی اور کے سر منڈھ دو اس اولاد کو۔ میرا اس سے بھلا کیا اہل حق؟“

عابد کے الفاظ پچھلے ہوئے سیسے کی طرح میری سماعت میں اترتے چلے گئے۔ مجھے نہیں یاد کہ جمال اس وقت کہاں سے نمودار ہوا تھا۔ شاید وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ تیری کی طرح عابد جانب سے لپکا۔ اس کے ہاتھ میں تیز چھری تھی۔ گلی کے لوگ اپنے اپنے دروازوں میں کھڑے میرے رسوائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ عابد اس بھی مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ ایک پڑوسن نے ان سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے عابد بیٹے؟“

”بات کیا ہوئی ہے؟“

معلوم نہیں، کہاں سے پتھر لوگ ہم شریفوں کے محلے میں آگئے ہیں۔ اس بڑھیا کی بیٹی بھی آوارہ ہے اور یہ بڑھیا.....“

عابد یہاں تک ہی کہہ پایا تھا کہ جمال نے اسے جالیا اور چھری اس کے سینے اتار دی پھر اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے عابد کے جسم میں کئی سوراخ کر ڈالے۔ عابد تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اب جمال کا رخ گھر کی طرف تھا۔ وہ ہاتھ میں چھری لہراتا بھاگ کر گھر گیا جہاں عذرا منتظر تھی کہ الٹی میں واپس آکر اسے یہ خوشخبری سناؤں گی کہ عابد کے ماں باپ راضی ہو گئے ہیں مگر اسے میرا جواب سینے کی مہلت ہی نہ ملی۔ جمال نے اسی چھری سے عذرا کو بھی قتل کر ڈالا اور خود قتلے میں جا کر اقرار جرم کر لیا۔ اگلے روز اخبارات میں یہ خبر نمایاں سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

میں ایک بار پھر بھری دنیا میں تمہارہ گئی۔ رسوائی کے ساتھ ساتھ میں بیٹی اور بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ جمال کا چالان مکمل کر کے اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا تو اس نے عدالت میں بھی اقرار جرم کر لیا۔ عدالت نے جمال کو پھانسی کی سزا تو نہ سنائی۔ البتہ اسے عمر قید سنا کر

تھی۔ محلے کے کئی لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ پردہ نوریں کے سرال والوں کے خوف سے کھلم کھلا میری حمایت نہیں کرتے تھے۔ اسلام غنی کا گھرانہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ نمازی، پرہیز گار اور شریف لوگ تھے۔ تمام محلہ ان کی تحریف کرتا تھا۔ ان کے گھر کے تمام افراد بھی اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ اسلام غنی صاحب کو مجھ سے ہمدردی تھی۔ وہ میری ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ ان کا ایک جوان بیٹا تھا۔ انہوں نے اس کے لئے مجھ سے عالیہ کا رشتہ مانگا تو میں نے فوراً ہاں کر دی۔ انہوں نے معافی کی رسم ادا کی تو بات محلے میں پھیل گئی۔

اسی شام عابد کی ماں اور اس کا ایک ماموں میرے گھر آ گئے۔ وہ عالیہ کے لئے عابد کے ماموں زاد نواز کا رشتہ لائے تھے۔ نواز کے بارے میں میں نے پہلے ہی سن رکھا تھا کہ وہ آوارہ ہے۔ لڑکیوں کو تنگ کرتا ہے۔ عالیہ کو بھی اس نے ایک بار راستے میں چھیڑا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ اب چونکہ عالیہ کی معافی ہو چکی ہے اس لئے میں نواز کے ساتھ اس کا رشتہ طے نہیں کر سکتی۔

میرا انکار سن کر ان لوگوں کے چہروں پر غصے کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میں عالیہ کی معافی توڑ دوں اور اس کی شادی نواز سے کر دوں تاکہ ہمارے خاندانوں کے درمیان جو دشمنی پھیل ہوئی ہے، وہ دھوئی اور رشتے داری میں بدل جائے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بات بڑھانے آئے ہیں حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ عالیہ کی معافی ہو گئی ہے جب میں نے کسی طرح بھی ان کی بات نہ مانی تو نواز کا باپ دھمکیوں پر اتر آیا اور کہنے لگا۔ ”مسلمی! تمہیں یہ انکار مہنگا پڑے گا۔ تم ہمارا دوستی کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک رہی ہو۔“

وہ لوگ چلے گئے تو میں فوراً اسلام غنی صاحب کے پاس گئی۔ میں نے انہیں تمام بات بتائی اور ساتھ ہی التجا کی وہ عالیہ کو اپنے گھر لے جائیں۔ بے شک خاموشی سے نکاح کر لیں مگر انہوں نے اپنی کچھ مجبوریاں بتا کر دو ماہ کی مہلت مانگی۔ مجبوراً مجھے خاموش ہونا پڑا۔ وہ دو ماہ میرے لئے عذاب بن گئے۔

☆☆☆

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ رات کو بہت گرمی تھی اس

لئے ہم دونوں ماں بنی محن میں سوئے ہوئے تھے۔ صبح میں اٹھی تو کھر کا دروازہ چوٹ کھٹا تھا اور عالیہ کا بستر خالی تھا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ یقیناً اسے اٹھالیا گیا تھا۔ میرے وجود میں انگارے سلنے لگے۔ نواز کے باپ کی دھمکیاں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے جو کہا تھا کر دکھایا تھا۔ میں ننگے پاؤں، اسلام صاحب کے گھر دوڑی گئی۔ جب میں انہیں بتایا کہ عالیہ گھر میں موجود نہیں ہے تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ میں ان کے ہمراہ نواز کے گھر روانہ ہو گئی۔

جب میں نے نواز کے باپ کو بتایا کہ میری بیٹی عالیہ کے اغوا میں اس کا ہاتھ ہے تو وہ کہنے لگا۔

”تم بغیر ثبوت کے اتنا بڑا الزام لگا رہی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو!“

”خبردار جو تم نے میری بیٹی کے بارے میں ایسی بات کی۔ وہ بہت نیک لڑکی ہے۔ عالیہ کو میرے حوالے کر دو۔ ورنہ میں تمہارے میں پرٹ لکھواؤں گی۔“

”سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا کہیں یہ اقدام تجھے مہنگا ہی نہ پڑ جائے!!“ اس نے تسخرانہ انداز میں کہا۔

وہاں سے میں اسلام صاحب کے ہمراہ تھانے چلی آئی کیونکہ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ رہا تھا۔ عالیہ کو اغوا کرنے میں نواز، اس کے باپ اور عابد کی ماں کا ہاتھ تھا۔

تھانے پہنچ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں سمجھی تھی کہ تھانے میں فوراً میری مدد کی جائے گی مگر وہاں تو منظر ہی نرالا تھا۔ محرم نے ہمیں لکڑی کی ایک شیخ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر شاید وہ ہمیں بھول گیا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھی اور اس کی میز کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا بات ہے مانی؟ تجھے ایک بار کہا نہیں کہ بیٹھ جا۔ ابھی تیری کہانی سن رہی ہیں۔“ وہ بولا۔

”صاحب! بڑی دیر سے بیٹھی ہوں۔ میری پرٹ لکھ لیں۔“ میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”کیا ہمیں تمہانے کوئی اور کام نہیں ہے جو پہلے تیری پرٹ لکھیں۔ باری آنے پر لکھیں گے۔“

”صاحب! میری بیٹی اغوا ہو گئی ہے۔ لڑکی ذات کا معاملہ ہے صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”کسی پر شک ہے تمہیں؟“ اس نے پوچھا۔

AANCHALPK.COM

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں



ملک کی مشہور معروف فلم کاروں کے سلسلے وار ناول
ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ
گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے
جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور
صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

میں نے اپنی ساری زندگی

جہالت و محنت کے مرنے والی ایسی دلکش تحریر
جو آپ کی دل کی دہائیں بل بل کر دے

میں نے اپنی ساری زندگی

معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا ناخوشگوار
جو آپ پر بہت سی خوشنویسی آشکار کر دے گا

میں نے اپنی ساری زندگی

فاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا افسانہ
بہترین ناول جو آپ کی سونے کی ایک غبار عمارت کر دے

AANCHALNOVEL.COM

پیشہ کرنے کی صورت میں رجسٹرڈ فون (021-35620771/2)

”ہاں شک نہیں یقین ہے صاحب! میری بیٹی کو نواز
اور اس کے باپ دونوں نے مل کر اغوا کیا ہے۔“
”پھر اس نے میرا مکمل بیان لیا۔ گواہ کے طور پر اسلام
غنی کا نام لکھا۔ اور ایف۔ آئی۔ آر کاٹ دی۔

تھانے سے واپسی پر میں پر امید تھی کہ پولیس عالیہ کو
برآمد کر لے گی مگر دنوں کا سفر ہفتوں بلکہ مہینے تک پہنچ گیا
اور عالیہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ میں جسمانی طور پر آدمی رہ گئی
تھی۔ لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے بھی تنگ
آگئی۔ روز نکلنے والا سورج ایک یکسانیت بھرا معمول لاتا
تھا۔ پولیس والوں کی جھڑکیوں کے باوجود میں تقریباً
روزانہ ہی تھانے جاتی اور ایک سا جواب لے کر لوٹ آتی۔
پھر ڈیڑھ ماہ بعد تھانے سے ایک سپاہی مجھے بلانے
آ گیا۔

”خیر تو ہے نا!“ میں نے اس سے پوچھا۔
”خیر ہے۔ تمہاری لڑکی اغوا ہوئی تھی۔ آج چھاپے
میں ایک لڑکی ملی ہے۔ جا کر پہچانو۔ کہیں وہ تمہاری لڑکی تو
نہیں ہے۔“

”خدا کرے، وہ میری عالیہ ہو۔ رسول کریم ﷺ کے
صدقے، میری بیٹی مل گئی ہو۔“ میں نے سارے راستے
دیوانوں کی طرح دعائیں مانگ رہی تھی۔

وہ واقعی میری بیٹی عالیہ ہی تھی۔ اس کی حالت بہت
بری تھی۔ میں اس سے دیوانوں کی مانند لپٹ گئی۔ اس کے
آنسو بارش کی طرح بہہ رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا
تھا جیسے وہ آنسو نہیں شعلے ہوں جو میرے دل کو صدمہ کر رہے
ہوں۔

”تم کہاں تھیں عالیہ! میری بیٹی تجھے میں نے کہاں
کہاں نہیں ڈھونڈا۔ کہاں تھی تو؟ کون لے گیا تھا تجھے؟“
میں رو رہی تھی اور اس سے پوچھتے جا رہی تھی۔

پھر محرم رنے ہمیں علیحدہ ہونے کو کہا اور عالیہ کا بیان
قلمبند کرنے لگا۔ عالیہ بتانے لگی۔ ”مجھے نواز نے اغوا کیا
تھا۔ اس نے مجھے پر بہت ظلم کیا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں اور
منہ باندھ کے مارتا تھا اور بار بار کہتا تھا۔ ”بڑا ناز ہے تجھے
خود پر۔ اب دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔“ مجھے تو یہ بھی
معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں؟ وہ باہر جاتے ہوئے میرے
پر منہ پر سختی سے کپڑا باندھ جاتا تھا۔ تین روز سے مجھے بخار

تھا۔ منہ باندھنے سے میں بے ہوش جاتی تھی اس لئے کل وہ کپڑا باندھ کر نہیں گیا تھا۔ میں نے پیچ پیچ کر آوازیں دیں تو کچھ دیر بعد دروازہ پٹنا جانے لگا اور پھر پولیس آگئی!!“ عالیہ ہلک ہلک کر رو رہی تھی۔

میں عالیہ کو لے کر گھر آگئی۔ اب میں چاہتی تھی کہ اسلام صاحب کو عالیہ کو بھونکا کر لے جائیں مگر بے بسی کے اس عالم میں انہوں نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ عالیہ کو اس حالت میں قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ میں اپنی بد نصیبی کا ماتم کر رہی تھی کہ ایک روز رحیم داد میرے گھر آیا۔ میں نے اسے دیکھا تو میرے تیور بگڑ گئے۔ ”اب کیا لینے آئے ہو؟“

”صلح کی بات کرنے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”صلح اور تم سے..... شاید بھول گئے ہو کہ کل میں آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لئے تمہارے دروازے پر آئی تھی پر تم نے میرے آنسو نہ پونچھے اور پوچھتے بھی کیسے۔ آخر وہ آنسو تمہارا ہی دیا ہوا تھا۔“ میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

”چل! جو ہوا سو ہوا۔ بھول جاؤ۔ گزرا وقت واپس نہیں آسکتا۔ ہاں، اس کی تلافی تو ہو سکتی ہے۔“

”اب صلح سے بات اوپر چلی گئی ہے اس لئے لوٹ جاؤ۔“

”جار ہا ہوں۔ پولیس میرا پاناؤ کا کیا بگاڑ لے گی؟ میں دولت سے ان کو خرید لوں گا مگر تیرا فیصلہ تجھے بہت بھاری پڑے گا۔ ابھی میں تیرے در پر آیا ہوں۔ صلح کی بات ہو سکتی ہے۔“ وہ بگڑ کر بولا۔

”مجھے تجھ سے نہ آج صلح کرنی ہے، نہ کل۔ یہ طے ہے۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔“ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”میں اس توہین کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ یہ سب کچھ تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ میں تیرے خاندان کو برباد کر دوں گا۔“ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا کیونکہ نواز کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس کا باپ اسی وجہ سے صلح کرنا چاہتا تھا۔

یوں ہی چند دن گزر گئے۔ عالیہ اب خاموش خاموش

سی رہنے لگی تھی۔ اس روز صبح ہی سے میرا دل گھبرا ہوا تھا۔ عجیب سی دشت ہو رہی تھی۔ کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا مگر پھر میں نے اسے رحیم داد کی باتوں کا اثر جان کر مال گئی۔ شام ڈھلے پولیس نے میرے اور اسلام غنی کے گھر پر چھاپہ مارا۔ مجھے عالیہ اور اسلام غنی کو پکڑ کر کھانے لے گئی۔ ہمارے خلاف رحیم داد نے ریپٹ لکھوائی تھی کہ ہم تینوں نے مل کر اس کی بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔“

رحیم داد کی چال میری سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنی بیوی کہیں چھپا دی تھی اور اس کے اغوا کا پرچہ ہم پر بنوا دیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس نے اس کام میں مال بھی خرچ کیا تھا تبھی تو پولیس نے اتنی ”جافٹاشی“ سے کارروائی کی تھی۔

ایف آئی آر بھی پکی کائی گئی تھی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ یہ مجھ پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ قانون کے رکھوالوں نے میرے اور میری بیٹی کے ساتھ وہ کیا جو قدیم زمانے میں خونخوارڈاکو کو بھی نہ کرتے ہوں گے۔

اسلام غنی کے رشتے داروں نے بڑی مشکل سے ہماری ضمانتیں کرائیں اور ہم کھانے سے گھر آ گئے۔ میرا آشیانہ تنکا تنکا ہو کے بکھر گیا پھر بھی میرے اندر نفرت کالا دوا بل رہا تھا۔ فرزا اور اس کے باپ رحیم داد نے میرے گلشن کو آگ لگائی تھی۔ میں انہیں زندہ نہ چھوڑوں گی۔ ہاں، میں ان دونوں کو مار ڈالوں گی۔ وہی میری زندگی کے دکھوں کا ذمے دار ہے۔ میرے خاندان کی بربادی کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ یہ اس کا پیسا ہی تو تھا جو تحفظ دینے والے ہاتھوں کو موت کے سائے بنا کر ہمیں جینے نہیں دے رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ میں دندناتی ہوئی اس کے گھر میں گھس گئی۔

”میں تیری موت بن کر آئی ہوں رحیم دادا میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تو نے میری زندگی برباد کی ہے۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔“ میں جیختی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ میں اسے گردن سے پکڑ لیا تھا پھر میرے ناخن اس کے چہرے پر نقش و نگار بنانے لگے تو کسی نے مجھے پیچھے

عالیہ مرچکی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ ایک پرچے میں اس نے لکھا تھا:-

”امی! مجھے معاف کر دینا۔ کاش! میں نے اس دنیا میں جنم ہی نہ لیا ہوتا۔ میں اس گھر کا سکون برباد کرنے کی ذمہ دار ہوں۔ میں نے اس گھر کو، اس کی خوشیوں کو دس لیا ہے اس لئے میں اس دنیا سے جارہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اگر میں زندہ رہی تو آپ کے لئے عذاب ہی بنی رہوں گی۔ مجھ سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔ آپ میرا بوجھ کب تک اٹھائیں گی؟ یہاں تو قدم قدم پر نواز اور رحیم داد موجود ہیں۔ میں کن کن سے اپنا دامن بچاؤں گی؟ مجھے معاف کر دینا امی جان! مجھے معاف کر دینا!!“

عالیہ نے مجھے بھری دنیا میں تنہا کر دیا۔ میں اس کی لاش سے لپٹ کر حاضیں مار مار کر روئی اور ابھی تک رورہی ہوں۔

.....☆☆☆.....

زندگی آج بھی اسی طرح گزر رہی ہے۔ میری زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں آج بھی قانون کے دروازے پر انصاف کی امید میں ننگے پاؤں کھڑی ہوں۔ کاش! میرا جمال ہی مجھے مل جائے تو میری زندگی میں بہار آجائے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کی بہن عالیہ مرچکی ہے۔ میرے اور عالیہ کے ساتھ کیا کیا ظلم ہوئے ہیں، وہ یہ بھی نہیں جانتا۔ اگر اسے معلوم ہو جائے تو ممکن ہے، وہ جیل تو ڈر بھاگ آئے۔ میں سوچتی ہوں، میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے ذمے داروں کو جب تک سزا نہیں ملے گی۔ میرے دل میں جلتے والا لاد ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ نہ جانے مجھے انصاف کب ملے گا؟ ملے گا بھی یا نہیں؟ یہ میں نہیں جانتی مگر ایک سوال ضرور میرے وجود کا حصہ بن گیا ہے یا میں خود ہی سوال بن گئی ہوں کہ انصاف کہیں ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کب، کن ہاتھوں کے ذریعے اور کہاں حقیقت کا سورج بن کر دکھے گا اور اس کی روشنی، ہم جیسے تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کے بھوکے دھبوں تک پہنچنے کی بھی یا نہیں۔



سے پکڑ لیا۔ میں بری طرح چل رہی تھی۔ جج رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی اور اسے دھمکیاں دے رہی تھی مگر کئی ہاتھوں نے مجھے بے بس کر ڈالا۔ رحیم داد نے میرے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا اور کہا ہے لگا۔

”لگتا ہے، تو پاگل ہو گئی ہے۔ تو مجھے قتل کرے گی تو سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟ بہت مہنگا پڑے گا تجھے یہ پاگل پن۔“

واقعی یہ پاگل پن مجھے مہنگا پڑا۔ رحیم داد نے پولیس بلوائی اور میرے خلاف اس کے گھر میں چوری کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کا پرچہ درج ہو گیا۔ پولیس مجھے پکڑ کر تھانے لے گئی۔

جیل کیا ہوتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا مگر تھانہ کسی عذاب کا نام ہے، یہ میں نے ان دنوں اچھی طرح جان لیا تھا۔ میں نے ایک ایک کونپنی بے گناہی کی داستان سنائی مگر کسی نے میری بات پر یقین نہ کیا۔ میرے پاس فی زمانہ سچائی کی کجی یعنی سکھ رائج الوقت تو تھا نہیں جس کے بل بوتے پر جیت میری ہو سکتی لہذا تھانہ میرے لئے جہنم بن گیا۔ سب لوگ ساتھ چھوڑ گئے۔ میں تو منہ حار میں چھنسی ہوئی کشتی تھی۔ میرے ساتھ ڈوبنا کون پسند کرتا؟ لہذا مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ عالیہ اب گھر میں اکیلی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ زندگی کے دن کیسے گزار رہی ہے؟ اب تو میری ضمانت کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں وکیل بھی نہ کر سکتی تھی لہذا جب مجھے عدالت میں پیش کیا گیا تو میں نے جج صاحبہ کو زندگی کی مختصر کہانی سنا دی۔ مجھے عدالت سے انصاف ملنے کی امید نہ تھی مگر اس روز مجھے احساس ہوا کہ بہر حال کم سہی مگر دنیا میں درد مند لوگ موجود ہیں۔ جج صاحبہ کی ذاتی دلچسپی نے میری زندگی کی تاریک راہ کو روشن کر دیا۔ انہوں نے مجھے چوری کے الزام سے بری کر دیا۔ ”میں فوراً گھر پہنچی مگر عالیہ گھر میں نظر نہ آئی۔ میں اسے آوازیں دے رہی تھی مگر وہ بول نہ رہی تھی۔ میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گئی تو کمرے کا منظر دیکھ کر میرا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔

پراسرار جنگل

ریاض بٹ

انسپکٹر خالد کی تفتیشی کہانیاں آپ پڑھتے ہیں اور انہیں پسند بھی کرتے ہیں یہ کہانیاں ماضی قریب کی ہیں اس وقت جو سہولتیں پولیس کو حاصل تھیں انہی کے دائرے میں رہ کر کہانی کے تانے بانے بنے جاتے ہیں یہی تفتیشی کہانیوں کا حسن ہے اس میں دلچسپی کا سامان ہے اور قارئین کی افتاد و طبع کے لیے سسپنس کا عنصر ہے اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ چند قارئین یہ چاہتے ہیں کہ اس میں جدت لائی جائے یہ ممکن نہیں ہے عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہے۔

انسپکٹر خالد صاحب کی ڈائری سے ایک ناقابل فراموش تفتیشی کہانی

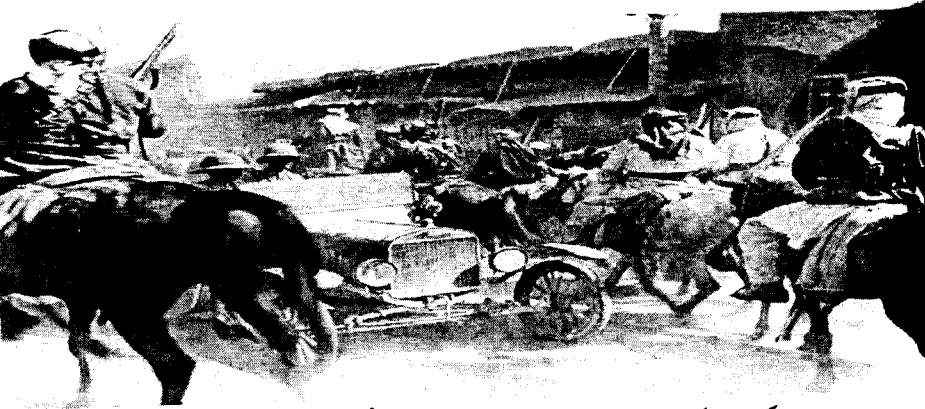
کہتے ہیں وقت گزر جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے یادیں واقعات اور ناقابل فراموش کہانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ میری پولیس کی سروس ایسی بے شمار کہانیوں سے بھری پڑی ہے اور میں ایسی بلکہ ہر تفتیشی کہانی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھتا رہا ہوں اپنی ڈائری میں بہر حال اس بار ایسی ہی ایک ناقابل فراموش کہانی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ وہ ساون کا ایک جس زدہ دن تھا۔ رات ساون برساتا تھا لیکن اس وقت جس کا یہ عالم تھا کہ چھت پر لگے ٹیکھے کی ہوا بھی پسینے کی راہ میں رکاوٹ بننے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ موسم جیسا بھی ہو..... کام تو چلتے رہتے ہیں خاص کر پولیس کے کام۔

دن کے تقریباً بارہ بجے دو بندے میرے پاس آئے وہ شکل سے دیہاتی لگتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے۔ میں نے بغور ان کی طرف دیکھا۔ دونوں اپنی زندگی کی کم از کم پچاس بہاریں دیکھ چکے تھے۔ بعد میں میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ ایک کی عمر پچاس سال اور

دوسرے کی عمر تقریباً باون سال تھی۔ دونوں سالا بہنوئی تھے۔ دونوں کے نام بالترتیب کرامت علی اور سلامت علی تھے۔ ویسے ناموں میں کیا رکھا ہے نہ ہی کرامت علی کے پاس کوئی کرامت تھی اور نہ ہی سلامت علی اب سلامت رہا تھا۔ کیونکہ اس کا جوان جہان بیٹا گم ہو گیا تھا۔ شجاعت علی۔

یہاں بھی بات وہی تھی کہ وہ کم از کم ایک رات اور آدھا دن گزار کر بلکہ ہماری زبان میں ضائع کر گئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ شجاعت علی کل صبح دس بجے گھر سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ شام تک آ جائے گا۔ میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب شجاعت علی شام گھر نہیں آیا تھا تو آپ کو میرے پاس آ جانا چاہیے تھا۔“

”بس تمھانے دار صاحب ہم نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہیں دور نکل گیا ہو صبح آ جائے گا“ صبح سے اب تک ہم اس کے دوستوں وغیرہ سے پتا کرتے رہے ہیں۔ ہر طرف سے



مایوس و نامراد ہو کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ اب اوپر آسپان پر خدا اور نیچے آپ ہی ہمارا سہارا ہیں۔ کرامت علی نے تم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیکھو..... کرامت علی مایوسی گناہ ہے، ہمت سے کام لو اور ذہن کو حاضر رکھ کر میرے سوالوں کے جواب دو۔ یہی بات سلامت علی تمہارے لیے بھی ہے۔“

”ہم حاضر ہیں.....“ تھانے دار صاحب۔ آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں، دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”شجاعت علی کیا بتا کر گیا تھا..... کہ کہاں جا رہا ہے؟“

”تھانے دار صاحب وہ سیلانی آدمی ہے اسے قدرت کے حسین نظاروں سے عشق ہے..... وہ جب بھی چھٹی پر آتا تھا، کیمرو لے کر نکل جاتا تھا، اس کے اہم میں مرئی اسکرڈ ایبٹ آباد، کاغان، تاران کے دلفریب، ہوشربا اور حسین نظاروں کی تصویریں بھری پڑی ہیں اور فریبی گاؤں دیہاتوں کے نظاروں کی تصویریں بھی ہیں۔ اسے یہی ایک شوق تھا۔ نہ کوئی نشر کرتا تھا، اور نہ دوستوں یا روں میں زیادہ وقت گزارتا تھا۔“

”یعنی..... وہ زیادہ تر اکیلا ہی جاتا تھا..... میں نے سلامت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بالکل..... جناب، نہ دیکھی جگہوں پر وہ اکیلا ہی جاتا تھا جبکہ جس دور دراز جگہوں کا ذکر آیا ہے وہاں دوستوں کے ساتھ گیا تھا۔“

”خیر..... سلامت علی میں شام کو تمہارے گھر آؤں گا، تم لوگ اس کے کم از کم دو قریبی دوستوں کو اپنے گھر لایا۔“

”اس نے بھی اشارت میں سر ہلاتے ہوئے گویا اپنے بہنوئی کی بات کی تائیدی۔

”سلامت علی پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا بیٹا شجاعت علی کام کہاں کرتا ہے؟“

”وہ عکھے بنانے والی ایک فیکٹری میں فز کا کام کرتا ہے۔“

گا۔ پھر محبت لفظوں کی محتاط نہیں ہوتی۔ اس کی خوشبو بتا دیتی ہے کہ اس میں شدت اور گہرائی کتنی ہے؟“

”تھانیدار صاحب! خدا آپ کا بھلا کرے۔“ یہ کرامت علی کی آواز تھی۔

”ایک بات کا سوچ سمجھ کر جواب دینا، بات گھر کی تھی پھر نکاح پہلے کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ میں نے سلامت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب! ابھی میں یہ بات آپ کو بتانے ہی لگا تھا، شکر ہے آپ نے خود ہی پوچھ لیا۔ دراصل ہمارے پڑوسی قاسم خان کا بیٹا حاکم خان کافی عرصے سے گلزار کے پیچھے پڑا ہوا ہے دو دفعہ حاکم خان کی ماں رشتہ لے کر آئی تھی..... یہاں پہنچ کر سلامت علی چند لمحے کے لیے رکھا تھوک لگا، پھر گویا ہوا۔ میں نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی تھی۔“

”پھر.....!“

اس کا رد عمل کیا تھا؟“

”دونوں دفعہ چلی گئی تھی۔ صرف اتنا کہا تھا میں اپنے دیوانے بیٹے کو کیسے سمجھاؤں؟“

”اور اس کا دیوانہ بیٹا کیا کہتا تھا؟“

”میرے یا کرامت علی کے سامنے تو اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ البتہ ایک دو بندوں کے سامنے اس نے بھڑک ماری تھی کہ..... میں دیکھوں گا۔“

”اچھا..... میں نے کہا تھا کہ دوستوں کو بلایا ہے۔“

”کامران تو آیا بیٹھا ہے لیکن..... امجد اپنے گھر میں نہیں ملا۔“

”اس کے والدین کیا کہتے ہیں کہ کہاں گیا ہے؟“

”اپنی خالہ کے گھر وڑ برآ یاد کیا ہے۔“

”چلوئی الحال کامران کو بھیج دو۔“

چند لمحوں بعد جو جوان میرے سامنے آیا وہ چوبیس بچیس سالہ ایک گھبرو جوان تھا، درمیانی موٹھیں اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہی تھیں۔

اس نے مجھے سلام کیا اور میرے سامنے پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ مجھے میرے کہنے پر سلامت علی نے برآمدے میں بٹھایا تھا، میرے لیے اس نے کرسی کا بندوبست کیا تھا۔ اور اس کے سامنے

”وہ ہر ایک اینڈ پر چھٹی پڑا تھا؟“

”نہیں تھانیدار صاحب! وہ وہاں اتوار کو بھی کام کرتا تھا کچھ ایکسٹرا ڈیوٹی بھی کرتا تھا، مہینے کے اینڈ پر چھ دن چھٹی آتا تھا۔“

”کسی لڑکی وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے۔ وہاں یا یہاں؟“

اس سوال کے جواب کے لیے سلامت علی نے کرامت علی کی طرف یوں دیکھا جیسے چاہتا ہو کہ اس سوال کا جواب وہ دے۔

کرامت علی نے ٹھنکھار کر گلہ صاف کیا، پھر بولا۔

”تھانیدار صاحب! ہم نے بچپن میں ہی اس کی گفتگو کر دی تھی۔ دو مہینے پہلے نکاح بھی کر دیا ہے، اب اگلے مہینے رخصتی کرنی تھی۔“ آخر میں اس کی آواز رندہ گئی تھی۔ اس کے لہجے سے میں سب کچھ سمجھ گیا تھا، پھر بھی اس کے منہ سے سننے کی خاطر بولا۔

”کس لڑکی کے ساتھ، میرا مطلب ہے، کس کی بیٹی ہے؟“

”میری بیٹی ہے، تھانیدار صاحب! گلزار..... میں آپ کو کیا بتاؤں! اس نے تو رو رو کر برا حال کر لیا ہے، اب بھی اندیشہ بھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی ہے۔“ کرامت علی نے ایک آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

ابھی میں اگلا سوال کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ سلامت علی بول پڑا۔

”جناب میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، خدارا! جلدی میرے بیٹے کو ڈھونڈیں ورنہ ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے، گلزار کہتی ہے میں مر جاؤں گی میں آپ کو کن لفظوں میں بتاؤں کہ دونوں میں اتنی محبت ہے کہ لوگ ہیرا پنجاہ سکی پنوں اور شیریں فرہادی مثالیں دیتے ہیں۔“

ایسے لمحے میرے لیے بہت صبر آزما اور کٹھن ہوتے تھے، بعض اوقات انسان ہونے کے ناتے میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا تھا..... میں خود بھی جذباتی ہو جاتا تھا۔

میں نے سلامت علی کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔

”سلامت علی! خدا کے حضور گڑ گڑا کر دعا کرو، مجھ سے جہاں تک ہو سکا تمہارے بیٹے کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں

گیا، گورا چٹا رنگ..... پتے پتے نین نقش، کتابی چہرہ، بس اسے حسن کی دیوی کہنا مناسب ہوگا۔ وہ دو جوانوں کو کیا، بلکہ پورے گاؤں کو دیوانہ بنا سکتی تھی۔ اس وقت اس کی موٹی موٹی آنکھیں رورو رو سو جھگٹی تھیں۔

”بی بی ہمت سے کام لو۔ خدا بہتر کرے گا۔“ میں نے اس کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔

”تھانیدار صاحب، میرا اشاعت چوبیس دن کام پر رہتا تھا تو میں ایک ایک دن کن کن کر گزارتی تھی، ہماری محبت بچپن سے تھی جس وقت ہمیں محبت کے متعلق زیادہ علم نہیں تھا بس دل چاہتا تھا کہ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ ریت یا مٹی کے گھر وندے بناتے تھے جو دوسرے دن ٹوٹے ہوتے تھے ہم اگلے دن پھر بنالیتے تھے۔“

”بی بی مجھے تم دونوں کی محبت کا علم ہو چکا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ مجھے چند سوالوں کے جواب چاہیے۔“

”پوچھیں تھانیدار صاحب۔“

”میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ قاسم خان کا بیٹا تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“

”تھانیدار صاحب ایک بات تو بتائیں، اگر عورت خوبصورت ہو تو مرد رال کیوں پٹکانے لگ جاتے ہیں؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کرویا۔

”دیکھو بی بی یہ تو ایک فطری بات ہے ہر خوبصورت چیز اچھی لگتی ہے۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس چیز کو غلط طریقے سے حاصل کرنا جرم ہے۔“

”خیر اس بحث کو چھوڑیں، حاکم خان بس دو درود سے مجھے دیکھتا تھا اگر قریب آتا تو میں اس کی آنکھیں نکال لیتی۔“

”تمہارے خیال میں حاکم خان کس طرح شجاعت علی کے معاملے میں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”مجھے تو اس پر کا شک ہے تھانیدار صاحب، آپ اس کو پکڑ کر بھیجی شیٹی لگائیں تو وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ ہو سکتا ہے۔“

”تم بالکل فکر نہ کرو میں اس سلسلے میں اس کا انگ انگ علیحدہ کر دوں گا، تم بس دعا کرو۔“

دو چار پائیاں بچادی تھیں۔ جن پر اجلی چادریں بکھی تھیں۔ سبھی عظمت باہر گاڑی کے پاس تھا۔ اس وقت میں اور کامران اکیلے تھے۔

”کامران، میاں کیا حال چال ہیں؟“ میں نے نارل لہجے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے تھانیدار صاحب۔“

”تمہارا دوست شجاعت علی تم ہو گیا ہے تمہارے خیال میں وہ کہاں جا سکتا ہے؟“

”ویسے تو تھانیدار صاحب..... وہ ایک سیلانی آدمی ہے، کہیں بھی جا سکتا ہے جہاں اسے قدرتی مناظر ملیں..... لیکن اس بار جس طرح وہ غائب یا کم ہوا ہے قابلِ عذر اور تشویش کی بات ہے۔“

”کیا اسے پتہ تھا کہ حاکم خان اس کی گمنام کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“

”اسے پتہ تھا وہ کہتا تھا جب بھی سامنے آیا تو اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لوں گا۔“

”اوہ..... خاصا سیریس مسئلہ ہے۔“

”تھانیدار صاحب ویسے ایک بات ہے اس نے گمنام کو کبھی تنگ نہیں کیا تھا..... صرف اپنی ماں کو دو دفعہ منت ساجت کر کے رشتے کے لیے بھیجا تھا۔“

”سنا ہے اس نے کسی کے سامنے بھڑک ماری تھی کہ میں دیکھ لوں گا۔“

”میں نے تو یہ بات نہیں سنی۔“

”خیر..... اس بات کو میں دیکھ لوں گا، ویسے تمہارے خیال میں تمہارے دوست شجاعت کو کم کرنے میں حاکم خان کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”اس سلسلے میں میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔“ کامران نے اپنی طرف سے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جوان تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا، جو بھی کوئی بات تمہیں پتہ چلے میرے پاس آنے میں دیر نہ کرنا..... تم جا کر سلامت علی کو بھیج دو۔“

سلامت علی آیا تو میں نے اسے کہا کہ اپنی بہو کو بھیج دو۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

گمنام جب میرے سامنے آئی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ

خود کیا تھا۔ دراصل مجھے اپنے اہلکاروں کو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔
میں نے اسے شاباش دی، اور قاسم خان کو بلالیا۔ قاسم خان ایک اونچا سا صحت مند اور گوری رنگت کا بندہ تھا۔ شکل سے بھلا مانس لگتا تھا۔

اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ پریشان ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”خان صاحب..... میں نے تو آپ کے بیٹے کو بلایا تھا۔“

”آپ بادشاہ آدی ہیں جسے چاہے بلا سکتے ہیں..... اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ مجھے غصا گیا۔
اور..... میں تجھے ہونے لہجے میں کہا آپ کا مطلب ہے کہ میں خواخواہ لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے بلاتا رہتا ہوں۔“
”میں نے یہ تو نہیں کہا.....!“ اچانک وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”خیر..... آپ کا بیٹا کدھر ہے؟“
”وہ تو جناب بدھ سے غائب ہے۔“
”بدھ سے غائب ہے..... میں نے زیر لب دہرایا پھر اپنے ذہن میں حساب کتاب لگایا تو یہ وہی دن بنا تھا جس دن شجاعت علی غائب ہوا تھا۔

”اگر آپ کا بیٹا بدھ سے غائب ہے تو آپ کو میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“ میں نے اسے ٹھیکسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ڈر رہا تھا، کہیں آپ مجھے ہی حوالات میں نہ بند کر دیں۔“

”وہ تو میں اب بھی کر سکتا ہوں..... ویسے بائی داوے یہ خیال آپ کے ذہن میں کیوں آیا تھا؟“

”دیکھیں جی میں صاف بات کروں گا، اپنے بیٹے کے کرتوتوں پر مصلحت کی چادر نہیں ڈالوں گا۔ وہ سلامت علی کی بیٹی گھنار کا دیوانہ ہوا پھرتا تھا، میں نے اس کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی گھر والی کو دو دفعہ ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجا تھا لیکن انہوں نے جواب دے دیا تھا۔“

”انہوں نے جواب دینے کی وجہ بھی بتائی ہوگی اور کیا وہ وجہ پہلے آپ کے علم میں نہیں تھی؟“

”تھانیدار صاحب میں تو ہر وقت ہاتھ پھیلائے دعا مانگتی رہتی ہوں یا روتی رہتی ہوں میں ایک بات ابھی آپ کو بتائے دیتی ہوں، کہ اگر شجاعت مجھے نہ ملا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔“
اس کے بعد میں نے اسے تسلی دلا سہ دے کر رخصت کر دیا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ اگر میں سارے سوال و جواب لکھنے لگ جاؤں تو کہانی بہت لمبی اور طویل ہو جائے اس لیے چیدہ چیدہ سوال و جواب لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس کے بعد میں نے سلامت علی اور کرامت علی کو چند ہدایات دیں، جن میں یہ ہدایات بھی شامل تھیں کہ جونہی امجد آئے اسے تھانے بھیج دوں اور اگر انہیں کوئی نئی بات، کوئی سرانچ پتہ چلے، بدوق سے نکلی گولی کی طرح میرے پاس آئیں۔
اور پھر.....!

ہم سرکار کی دی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر واپس تھانے میں آ گئے تھے۔ تھانے میں پہنچتے پہنچتے رات کے نو بج گئے تھے۔ میں نے تھانے کا انتظام و انصرام شبینہ ڈیوٹی والے سیکرٹری اہلکار کے سپرد کیا اور خود آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

انجلی صبح میں چھتری کی چھاؤں میں تھانے میں پہنچا۔ کیونکہ سوان ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ یہاں آپ کی دلچسپی کی خاطر یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ وہ چھتری اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ یہ بات بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں چیزیں بہت پائیدار ہوتی تھیں۔ اب تو قیمتیں آسمان پر پہنچ گئی ہیں اور چیزوں کا معیار زمین کے نیچے نیچے ہی کہیں جا رہا ہے۔

میں نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حاکم خان کو لانے کے لیے سپاہی شہباز کو بھیج دیا۔
اس پر صرف شک ظاہر کیا گیا تھا اگر کوئی ٹھوس ثبوت یا اشارہ ملتا تو رات کو ہی اسے بلو الیتا۔

دو گھنٹے بعد سپاہی شہباز نے آ کر بتایا کہ وہ گھر میں نہیں ہے، وہ اس کے والد قاسم خان کو ساتھ لے آیا تھا۔
یہ اچھا اور موقع کی مناسبت سے کام سپاہی شہباز نے

کے ساتھ کوئی گڑبڑ کردی ہو دے میں نے اچھی طرح قاسم خان کو ٹول لیا ہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے سر کہ حاکم واردات کر کے خود ہی روپوش ہو گیا ہو۔ قاسم خان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔“

”دیکھیں..... فقیر کے جھوٹے کیا برآمد ہوتا ہے؟ تم ایسا کر دو قریبی تھانوں میں شجاعت علی کی تصویریں بچھ دو۔ اور ساتھ ہی خبروں کو بھی متحرک کر دو۔“

”ٹھیک ہے سر..... میں یہ کام ابھی سے شروع کر دیتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں تھانے کے دوسرے کاموں میں الجھ گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ میں نے سلامت علی کے گھر سے واپس آتے ہوئے شجاعت کی تصویر اس سے لے لی تھی۔ اچانک میرے کمرے کے دروازے پر سپاہی انور کی شکل نظر آئی۔ وہ اندر آئے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

”آ جاؤ ابھی..... میں نے کاغذوں پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر..... اچھا گیا ہے۔“ اس نے اطلاع دی۔

”جلدی بھیج دو۔“

”تھانے دار صاحب، اصل بات یہ ہے کہ میرا ارادہ ابھی چار پانچ دن اور نہیں آنے کا تھا۔ یہ بات تو آپ کے علم میں آ چکی ہوگی کہ میں اپنی خالہ سے ملنے گیا تھا، میرے گھر والوں نے بذریعہ ٹیلیفون مجھے شجاعت کے متعلق بتایا تو میں آ گیا ہوں۔“

”چلو تم نے یہ تو اچھا کیا..... شجاعت علی نے یہ تو بتایا ہوگا کہ اس کا ارادہ جنگل میں جانے کا کیوں ہے؟“

”تھانیدار صاحب، وہ ہر جگہ پھرتا رہتا ہے، گمراہ اس کے پاس تھا۔ اس لیے میں نے زیادہ کیریدنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”تمہارے پاس گھڑی ہے؟“

”وہ تو علم میں تھی لیکن حاکم کو مطمئن کرنے کے لیے یہ کام کیا تھا تا کہ اسے یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ہم رشتے کے لیے نہیں گئے تھے۔“

”دیکھیں خان صاحب کسی کو پسند کرنا یا چاہنا بری بات نہیں ہے لیکن جو چیز دسترس میں نہ ہو اسے غلط طریقے سے حاصل کرنا نہ تو شرعی طور پر جائز ہے اور نہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ رشتے سے انکار پر آپ کے بیٹے کو آرام سے بیٹھ جانا چاہیے تھا، لیکن.....! میں نے چند لمبے توقف کیا پھر خشک لہجے میں کہا۔ ”آپ کا بیٹا تو ادھر ادھر کہتا پھر تھا کہ میں دیکھ لوں گا۔“

”تھانیدار صاحب..... اس لیے تو میں اس کے گم ہونے پر سینے پر صبر کی سل رکھ کر بیٹھ گیا ہوں نہ کسی سے ذکر کیا ہے اور نہ آپ کے پاس آیا تھا۔“

وہ مجھے ایک مجبور باپ لگا جسے بیٹے کی ہٹ دھرمی نے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔

”دیکھیں..... خان صاحب کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوا کرتے..... میں آپ کو جانے کی اجازت دے رہا ہوں..... آپ اسے ڈھونڈیں..... اور تھانے میں حاضر کریں ورنہ مجبوراً مجھے تھانیداروں والا حربہ استعمال کرنا پڑے گا، یعنی آپ کو تھانے میں بٹھانا پڑے گا.....!“ میں نے اس کی آنکھوں سے غفلت کی پٹی اتارنے کے لیے تلخ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے..... تھانیدار صاحب، میں کوشش کرتا ہوں۔“

اس کے جاتے ہی اے ایس آئی آفاق میرے کمرے میں داخل ہوا۔

”آؤ ابھی آفاق پکھری کے معاملات ٹھیک چل رہے ہیں نہ۔“

”بالکل سر..... ابھی ادھر سے ہی آ رہا ہوں..... میں تو مصروف رہا ہوں۔ شجاعت علی والے کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے۔“

”میں نے سارے حالات اس کے گوش گزار کر دیے۔“

”معاملہ الجھ گیا ہے..... سر کہیں ایسا تو نہیں، کہ قاسم خان نے خود ہی اپنے بیٹے کو کہیں چھپا دیا ہو۔“

”یہ اس صورت میں ممکن ہے جب اس نے شجاعت علی

”بالکل ہے تھانیدار صاحب۔ اس نے اپنی کلائی پر بندی گھڑی میرے سامنے کر دی۔“
”جب..... شجاعت علی تمہیں ملاتا تھا اس وقت کتنے بجے تھے؟“

”اس وقت دو بجے ہوں گے۔“

”تم نے گھڑی دیکھی تھی یا یونہی اندازے سے بتا رہے ہو۔“

”میں ڈیڑھ بجے گھر سے نکلا تھا‘ میں نے اس وقت گھڑی تو نہیں دیکھی تھی..... لیکن.....“

”ٹھیک ہے..... میں سمجھ گیا ہوں اب ایک سوال کا جواب ذرا سوچ سمجھ کر دینا.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پوچھیں تھانے دار صاحب۔“
”تمہارا دوست شجاعت علی کردار اور مزاج کا کیسا تھا؟“

”کردار کا تو بہت مضبوط تھا‘ صرف اپنی پھوپھی زاد گنار کا دیوانہ تھا۔ اور یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ گنار کے ساتھ اس کا نکاح بھی ہو گیا ہے..... رہی بات مزاج کی تو وہ ویسے تو انتہائی دھیمے اور ٹھنڈے مزاج کا ہے لیکن کچھ عرصے سے برف میں آگ لگنے والا معاملہ ہو گیا ہے۔“

”اور یہ اس وقت سے ہے جب سے اسے حاکم خان کے متعلق پتہ چلا ہے۔“

”بالکل تھانے دار صاحب..... یہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ..... امجد نے اگرچہ فقرہ مکمل نہیں کیا تھا لیکن اس نے مجھے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھا دیا تھا۔“

پھر میں نے اسے رخصت کر دیا تھا..... اور ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو بلا کر کہا تھا کہ وہ جابر کو جا کر بلالائے۔

جی ہاں..... یہ اسی جنگل کا ذکر ہے جس کا مالک جابر تھا‘ اور جس کے متعلق آپ پچھلی کہانی میں پڑھ چکے ہیں۔

جابر کے آنے سے پہلے پہلے میں نے جنگل میں جانے کی مکمل تیاری کر دالی تھی۔ جابر اپنی جیب لے کر آیا تھا۔

پھر جابر نے مجھے اپنی جیب میں بٹھالیا تھا‘ اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر..... اور چھ چاک وچو بند اور جنگل میں ہر کسی

قسم کی کارروائی کرنے کے ماہر پولیس اہلکار تھانے کی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

راستے میں میں نے جنگل میں جانے کے مقصد سے اسے اپنے تئیں الفاظ میں آگاہ کر دیا۔ میری باتیں سن کر چند لمحے وہ سوچ کی گہرائی میں چلا گیا۔

پھر‘ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ تھانیدار صاحب‘ آپ کا مشورہ جو آپ نے مجھے اپنے پچھلے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں دیا تھا مقبول ہے‘ اب میں بہت جلد اس جنگل کا بندوبست کروں گا۔“ میں خاموش رہا۔

جب ہم جنگل میں پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ یہ جنگل تو اس سے بھی بڑا اور گنہا ہے جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا‘ اور یہاں پہنچ کر مجھے پراسراریت کا احساس ہوا‘ میں نے دائیں طرف سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا‘ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان سپاہی شہباز اور سپاہی توقیر کو بائیں طرف سے آگے بڑھنے کا حکم دیا‘ سپاہی کبیر اور سپاہی فیروز ایک گزرارے لائق شکاری بھی تھے۔ ان کے پاس شکاری بندوقیں بھی تھیں..... جابر میرے ساتھ تھا۔

سب سے پہلی ایک گہری کھائی نے ہمارا استقبال کیا..... یہ کھائی کوئی پانچ فٹ چوڑی اور تقریباً اتنی ہی گہری ہوئی۔ اس سے آگے جھاڑیوں کا ایک جھنڈ تھا‘ جن میں کہیں کہیں خار نظر آرہے تھے آگے چڑھ کے درختوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا..... ہم ان درختوں کے اندر چلنے لگے..... تھوڑی دور آگے ہمیں دھڑکوش نظر آئے جو گھاس برمنہ مار رہے تھے یہاں ہر طرف گھاس تھی۔ ساون کے متعلق ویسے بھی آپ نے سن رکھا ہوگا کہ یہ پھروں میں بھی گھاس اگا دیتا ہے‘ خرگوش ہمارے قدموں کی آہٹ پا کر کسی سمت بھاگ گئے..... ہم بھی آگے بڑھتے رہے..... میں نے دائیں طرف دیکھا‘ وہاں ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔

”جابر صاحب..... کیوں نہ اس غار کی طرف جایا جائے.....“ میں نے جابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج تو ہماری مہار آپ کے ہاتھ میں ہے‘ جس طرف کہیں گے چل پڑیں گے۔“

”آپ نے اس جنگل کو لاوارث چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی ہوئی ہے۔“ میں نے جابر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب‘ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔“
”کیسی وجہ.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تو آپ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔“
 ”دراصل اتنے عرصے بعد یعنی ایک سال پہلے اس
 کا ایک اور دعوے دار نکل آیا تھا اور عدالت کی طرف سے
 اس نے اسے آرڈر لیا ہوا تھا اب فیصلہ ہمارے حق میں
 ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس موضوع پر مزید بات
 جیت کو فضول سمجھتے ہوئے کہا۔

”جونہی ہم غار کے قریب پہنچے اندر سے غراہٹ سنائی
 دی۔ اور یہ غراہٹ کسی بھیڑیے کی کٹی تھی سپاہی کبیر نے اپنی
 بندوق سیدھی کر لی اور ہر دم کے خطرے سے منسنے کے لیے
 تیار ہو گیا۔ اچانک غار کے اندر سے بھیڑیا ہماری طرف آیا
 اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کرتا..... سپاہی کی بندوق سے نکل
 ہوئی گولی اس کی کھوپڑی میں اتر گئی..... وہ دو دفاتر اوپر اچھلا
 اور پھر دھب سے زمین پر گر کر ترپے لگا چند لمحوں بعد ہی وہ
 ٹھنڈا ہو گیا ہم نے قریب جا کر دیکھا کہ اس کی گردن
 پر کھڑائی کے دو زخم تھے جو خراب ہونے لگ گئے تھے۔

یہ تو بالکل اصل بھیڑیا لگتا تھا بس انیس بیس کا فرق تھا۔
 اگر اس کی گردن پر زخم نہ ہوتے تو ہم سمجھتے کہ یہ کوئی اور
 بھیڑیا ہے لیکن اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ
 گدڑیے پر اور بکریوں پر حملہ کرنے والا یہی بھیڑیا تھا۔
 کھڑائی کے زخم کھا کر یہ مختل ہو گیا ہو گا اور گدڑیے پر حملہ
 آور ہو گیا ہو گا..... خیر یہ تو آپ پچھلی کہانی میں پڑھ چکے
 ہیں۔“

”خس کم جہاں پاک.....“ جابر صاحب نے دیر سے
 سے کہا۔

”لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسے چھکڑی لگا کر
 عدالت میں پیش نہیں کر سکوں گا۔ میں نے مزاح کے رنگ
 میں کہا۔

اس پر جابر صاحب کا قہقہہ جنگل کی فضا میں گونج کر رہ
 گیا تھا۔ ہم آگے چل پڑے۔

”سر..... وہ دیکھیں کوئی انسان لمبا لمبا لیٹا ہوا ہے۔
 اچانک مجھے سپاہی شہباز کی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا..... وہ ایک کھائی
 کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ کھائی کے بالکل قریب کھڑا تھا
 میں نے کھائی کے اندر جھانکا تو مجھے وہاں ایک جوان لیٹا ہوا

نظر آیا جب ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی شہباز نے اسے
 باہر نکالا تو یہ آشکاف ہوا کہ وہ تو مرا ہوا ہے اور سارے آثار
 سانپ کے ڈسنے کے ہیں۔
 لیکن.....!

یہ شجاعت علی نہیں تھا کیونکہ اس کی تصویر میں دیکھ
 چکا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا مجھے شک
 سا ہوا کہ یہ حاکم خان نہ ہو۔
 لاش پرانی لگتی تھی۔

اس کے بعد ہم نے شجاعت علی کے لیے جنگل کا چپہ چپہ
 چھان مارا لیکن نہ وہ مردہ حالت میں ملا اور نہ زندہ حالت
 میں۔ بہر حال ہم لاش کے رکتانے میں آ گئے۔

پھر لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے سے پہلے ہم نے
 قاسم خان کو بلا کر لاش کی شناخت کروائی تھی۔

یہ حاکم خان ہی تھا۔ لاش دیکھ کر قاسم خان کی جو حالت
 ہوئی تھی اس کو لفظوں کی زبان دینا ناممکن ہے وہ جیسا بھی تھا
 آخراں کا لخت جگر تھا اس کا رد عمل فطری تھا۔

قاسم خان تھانے سے جا ہی نہیں رہا تھا اس کی حالت
 پاگلوں کی سی ہو گئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے کئی دلا سے
 دے کر اسے دو سپاہیوں کی نگرانی میں گھر بھیج دیا تھا۔

شجاعت علی کے متعلق پتہ چلا تھا کہ وہ جنگل میں گیا تھا
 اس لیے ہم نے جنگل کی خاک چھانی تھی مگر اس کا کوئی
 سراغ نہیں ملا تھا..... اسے آسان کھا گیا تھا یا زمین نکل گئی
 تھی۔

بہر حال حاکم خان کا اس حال میں ملنا بھی کسی معنی سے
 کم نہیں تھا۔ وہ وہاں کیوں گیا تھا؟

دوسرے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی ساتھ لاش
 بھی تھی۔ کافی دیر سے حاکم خان کے رشتے دار آئے بیٹھے
 تھے..... وہ لاش کے کرچلے گئے قاسم خان کے متعلق یہ پتہ
 چلا کہ وہ گھر میں ہے کیونکہ اس کی طبیعت خراب تھی۔

اب میں قارئین آپ کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے
 متعلق بتاتا ہوں حاکم خان کی موت سانپ کے ڈسنے سے
 ہی ہوئی تھی..... موت کا دن وہی تھا..... جس دن دونوں

غائب ہوئے تھے..... یہ میں نے اندازہ لگایا تھا رپورٹ
 میں یہ لکھا تھا لاش اتنے دن پرانی ہے..... لاش کے دائیں
 پاؤں کے اوپر سانپ کے ڈسنے کا نشان تھا۔ اس کیس میں

مجھے واقعی دانتوں پسینہ آ گیا تھا..... یہ میرا اس وقت پہلا
کیس تھا جب مجھے اس پراسرار جنگل کی خاک چھانی پڑی
تھی۔ ابھی میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھ کر فارغ ہی
ہوا تھا کہ اے ایس آئی آفاق میرے کمرے میں آ گیا۔
شاید اس نے چائے کے لیے پہلے ہی کہا ہوا تھا۔
اس کے بیٹھے ہی چائے آ گئی..... چائے پینے کے
دوران ہماری اس کیس کے سلسلے میں بات چیت ہونے
لگی۔

”سر..... کچھ سمجھ نہیں آ رہا..... آخر شجاعت علی کدھر
گیا..... اور اس نے چائے کی چمکی لی پھر گویا ہوا۔
”یہ حاکم خان ادھر جنگل میں میں کیا کر رہا تھا؟
دیکھو..... آفاق میں نے گرم چائے کا گھونٹ معدے
میں اتارتے ہوئے کہا۔
”مجھے تو لگتا ہے کہ جنگل میں کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے.....
جس تک ابھی ہماری نظروں نے رسائی حاصل نہیں کی۔“
”بات تو سر کچھ ایسی ہی لگتی ہے دیسے نئے آرڈر کی کیا
کہانی ہے؟

میں نے جابر سے حاصل ہونے والی معلومات اس
کے سامنے رکھ دیں۔ سر میں نے کل کچھری جاتا ہے وہاں
کوئی کھراکھون لگانے کی کوشش کرتا ہوں، اچانک اے ایس
آئی چونک کر بولا۔
”سر کہیں ایسا تو نہیں کہ شجاعت اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا ہو؟
”اس لائن بر میں نے بھی سوچا ہے لیکن بات دل کر
نہیں لگ رہی، تم کچھری سے معلومات حاصل کرو کہ جابر
نے کونسا مقدمہ جیتا ہے۔“

”ٹھیک سے سر میں زمین کی تہہ سے بھی راز نکلوانے
کی سعی کروں گا۔“ پھر وہ چلا گیا۔ وہ مجھے خبروں کی رپورٹیں
دے گیا تھا۔ جو معلومات شجاعت اور حاکم خان کے متعلق
ہم تک پہنچ چکی تھیں۔ خبروں نے ان کی تصدیق کر دی تھی۔
ابھی میں نے میز پر رکھے کاغذوں کی طرف توجہ دی ہی
تھی کہ سپاہی انور نے اطلاع دی۔

”سر..... کوئی راجہ فیاض صاحب آپ سے ملنا چاہتے
ہیں ان کے ساتھ ایک اور بندہ بھی ہے۔“
”بیج دو..... کبھی ہم تو عوام کی خدمت کے لیے ہی
ادھر بیٹھے ہیں۔ کچھ لمحوں کے بعد دونوں میرے سامنے

بیٹھے ہوئے تھے۔

راجہ فیاض کو میں جانتا تھا، یہ شہر میں واقع ایک اسکول
کے ہیڈ ماسٹر تھے، سانولا رنگ تھا لیکن نین نقش خوبصورت
تھے۔ تھوڑے موٹاپے کی طرف مائل تھے۔
دوسرے صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مقناطیسی شخصیت
کے مالک لگتے تھے۔ انہوں نے مہنگی اور نفیس پینٹ شرٹ
زیب تن کی ہوئی تھی۔

راجہ صاحب نے کھٹکھار کر گلہ صاف کیا پھر بولے۔
”تمہانیدار صاحب یہ عبدالرزاق صاحب ہیں.....
حبیب کاشن مل میں جزل فیجر ہیں، یہ کافی عرصے سے
پریشان ہیں آج انہوں نے اپنی رام کہانی مجھے سنائی ہے
اور میں ان کو لے کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ آپ کافی
ذہین ہیں۔“ راجہ صاحب ان کا مسئلہ کیا ہے؟

”تمہانیدار صاحب میں آپ کو بتاتا ہوں.....“
عبدالرزاق صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”جی..... فرمائیے۔“ میں ہمتن گوش ہو گیا۔
”ہمارے گھر میں آج کل کچھ پراسرار حالات چل
رہے ہیں۔

”پراسرار حالات.....!“ میں نے زیر لب دہرایا.....
پھر گویا ہوا ذرا تفصیل سے بتائیں۔“

”تقریباً ایک ماہ سے ہمارے گھر سے پیسے غائب
ہونے لگے ہیں۔ کبھی پچاس، کبھی سو غائب ہوتے تھے اور
یہ ہر چوتھے یا پانچویں روز ہوتا تھا اب تو حد ہو گئی پروس سے
میری بیوی کی سونے کی انگوٹھی نہیں مل رہی۔

”واقعی یہ تو تشویش والی بات ہے۔ آپ کے گھر میں
افراد کتنے ہیں؟“ میں نے جزل فیجر صاحب کے چہرے
کو بخور دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک میں ہوں ایک میری بیوی ہے بیٹا عدیل ہے اور
بیٹی فائقہ ہے۔ بیٹے کی عمر تقریباً اٹھارہ سال ہے بیٹی دس
سال کی ہوگی۔“

”کوئی نوکر، نوکرانی؟“
”ایک نوکرانی نجمہ ہے ایک ڈرائیور شربت علی اور
چوکیدار طوفان خان ہے۔“

”ہوں.....!“ میں نے ہنکارا بھرا پھر بولا۔
”کیا آپ نے سروٹ کو اڑھٹا بنائے ہوئے ہیں۔“

نام رکھا ہے؟ میری تو آنکھیں بھی شرمی نہیں ہیں۔“
 ”تم تو زیادہ تر باہری ہوتے ہو، کیونکہ ذرا نیور ہو
 تمہارے صاحب پریشان ہیں انہوں نے ذکر تو کیا ہوگا۔“
 ”جناب عبدالرزاق صاحب بہت ہی وسیع القلب
 اور اچھے ہیں انہوں نے ذکر کیا تھا، سرسری طور پر.....
 تھانیدار صاحب اس نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔

”اس معاملے میں کافی غور و فکر کرنے کے بعد میں کسی
 نتیجے پر پہنچ سکا ہوں، میں اپنی طرف سے آپ کو یقین
 دلاتا ہوں کہ میں کسی ایسی حرکت کے متعلق سوچ بھی نہیں
 سکتا۔

میں نے اس کے چہرے کو بخور دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”تمہارے چہرے پر سچ لکھا ہوا ہے تم نے حالات
 پر نظر رکھنی ہے جو نبی کوئی بات معلوم ہو مجھے مطلع کرنا۔
 ”آپ فکر ہی نہ کریں..... تھانیدار صاحب۔“
 قارئین یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ میں تنہائی
 میں سوال و جواب کرتا تھا۔

میں نے اسے رخصت کر کے نجمہ کو بلا لیا۔
 نجمہ ایک خوبصورت خاتون تھی..... عمر تیس اور بیس
 سال کے درمیان ہوگی۔

”نجمہ تمہارے صاحب کیسے آدی ہیں؟“
 وہ اس غیر متوقع سوال سے ذرا بھی نہ گھبرائی اور پوری
 دلیری سے بولی۔

”تھانیدار صاحب یہاں ایسی کوئی صورت حال نہیں
 ہے، جیسی صورت حال سے آپ کا پلا پڑتا رہا ہے۔“
 ”کیسی صورت حال.....؟ میں نے ایسے لہجے میں کہا
 جیسے مجھے اس کے جواب سے حیرانگی ہوئی ہو۔

دیکھیں..... تھانیدار صاحب، صاحب نے مجھے بہن
 کہا ہوا ہے انہوں نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی.....
 حالانکہ کئی بار ہم اکیلے بھی ہوتے تھے ایسے موقعوں پر
 صاحب مجھے اتنا کہتے تھے کہ نجمہ اپنے کوارٹر میں چلی
 جاؤ..... ضرورت ہوئی تو بلا لوں گا۔“

”دیکھو نجمہ جس طرح پانچوں اگلیاں برابر نہیں ہوتیں
 اس طرح سارے مرد یا عورتیں بری نہیں ہوتیں..... تم مجھے
 یہ بتاؤ کہ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے متعلق تمہاری
 کیا رائے ہے۔ میرا مطلب ہے تمہارا اس بارے میں کیا

”تھانیدار صاحب“ مجھ مل کی طرف سے ایک بنگلہ ملا ہوا
 ہے اس میں دوسروں کو وارڈ ہیں ایک گیٹ کے ساتھ جس
 میں طوفان خان رہتا ہے دوسرا سوئٹ کوارٹر میں نے نجمہ
 کو دیا ہوا ہے جو اپنے پانچ سالہ بیٹے عارف اور پانچ شوہر
 کے ساتھ رہتی ہے۔“
 ”اور ڈرائیور.....“

”ڈرائیور شام کو اپنے گھر چلا جاتا ہے۔“
 ”ویسے..... آپ کو کسی پر شک ہے؟“ میں نے اہم
 سوال کیا۔

”سب بھروسے والے بندے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے..... پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟“
 وہ سوچ میں پڑ گیا..... اس موقع پر راجہ صاحب
 بولے۔

”تھانیدار صاحب ابھی عبدالرزاق صاحب کسی قسم کی
 رپورٹ درج نہیں کروانا چاہتے آپ میری درخواست پر
 ذرا تحقیقات کروادیں۔“

”راجہ صاحب ویسے تو جب تک رپورٹ نہ ہو ہم کچھ
 نہیں کر سکتے لیکن.....!“ میں نے چند لمحے توقف کیا.....
 پھر بولا۔

”میں ذاتی طور پر کچھ کر دوں گا..... جو نبی مجھے فرصت
 ملی۔“
 ”ٹھیک ہے جناب آپ کا بہت بہت شکریہ دونوں نے
 اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا..... اور ان کے جانے
 کے بعد میز پر رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دو دن بعد شام کو میں جنرل میجر صاحب کے بنگلے میں
 بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ میرے ساتھ ہیڈ
 کانسٹیبل اکبر خان بھی تھا اور..... ہم سفید کپڑوں میں تھے۔

اس وقت ڈرائیور بھی وہیں تھا..... وہ چھوٹے قد کا ایک
 قبول صورت بندہ تھا..... اس کے جانے کا تاہم ہو گیا تھا اس
 لیے میں نے سب سے پہلے اسی سے سوال و جواب کا سلسلہ
 شروع کیا..... جنرل میجر صاحب نے سب سے ہمارا
 تعارف کروا دیا تھا۔

”شریت علی تمہارا نام کیسا ہے؟“
 ”جناب پتہ نہیں میرے ماں باپ نے کیا سوچ کر میرا

خیال ہے؟“

اور شوہر پرست۔“

”ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں اللہ بہتر کرے گا۔ ہمیں اس کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“
میں نے اسے رخصت کرنے سے پہلے کہا کہ وہ چوکی ہو کر رہے۔ اپنی چیزیں اور روپیہ پیسہ تالے کے اندر رکھے۔“

اس کے بعد ہم تھانے میں واپس آ گئے تھے۔ چار دن بعد دن کے تقریباً بارہ بجے مجھے بتایا گیا کہ خبر نوید مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات بتا دوں..... کہ..... عبدالرزاق صاحب کی رہائش گاہ سے واپس آنے کے بعد میں نے ایک کام اس کے ذمے لگایا تھا۔

نوید نے مجھے رپورٹ دی کہ آج فلاں بندہ پھر فقیر سے ملا تھا..... آج فقیر نے اسے لفٹ نہیں کروائی تھی۔

وہ بہت غصے میں تھا..... اور فقیر کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے میرا شک صحیح تھا میں نے نوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل سر..... میں ذرا دور تھا اس لیے میں ان کی گفتگو سن نہیں سکا تھا..... لیکن آج میں نے فقیر کی رہائش گاہ معلوم کر لی ہے۔“

”اوہ..... ویل ڈن..... تم نے یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں نے اسے لفظوں سے شاباش کی تھی کہ ہوئے کہا۔ لیکن نوید مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی؟“

”کوئی بات تمہیں ادا صاحب۔“

”آج وہ فقیر اتنی جلدی کیوں چلا گیا؟“
”یہ بات تو حیران کنی والی ہے بس وہ بندے سے کسی نہ کسی طرح پچھا چمڑا کر دواں سے چل پڑا تھا..... ویسے میرا خیال تو یہ ہے کہ دال میں کچھ کاغذ ضرور ہے۔“

میں نے اسے رخصت کرنے کے بعد اے ایس آئی آفاق کو بلانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ خود ہی آ گیا۔

اس کے چہرے سے دبا دبا ہوا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیا خبریں ہیں بھئی؟“

”سر..... آپ جا کر فوراً بلا میں..... اس پر اسرار جنگل کے متعلق کسی مقدمے کا ریکارڈ کچھری سے نہیں ملا۔“

”نجمہ چند لمبے سوچ کی گہرائی میں چلی گئی پھر بولی۔
”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی..... ویسے مجھے دکھ بہت ہے کیونکہ صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں بہت اچھی ہیں اور ایسی حرکتیں کرنے والا کوئی انتہائی کمینہ بندہ ہی ہو سکتا ہے۔“

”خیر..... تم یہ بتاؤ کہ اس گھر میں کون کون آتا ہے؟“
”تمہیں ادا صاحب ایک تو صاحب کا بھائی فرید آتا ہے بیگم صاحبہ کی بہن اور بہنوئی بمعہ بچوں کے آتے ہیں..... اور ابھی ابھی صاحب کا کوئی دوست یا بیگم صاحبہ کی سہیلی آ جاتی ہیں۔“

دونوں میاں بیوی کے تعلقات کیسے ہیں؟“
”ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ اگر صاحب کو آنے میں دیر ہو جائے تو بیگم صاحبہ پارے کی طرح مضطرب ہو جاتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ اور بیگم صاحبہ کو بھیج دو۔“
چند لمحوں کے بعد ایک دراز قامت خاتون میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ خاتون کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ تو چاند سورج کی جوڑی ہے۔ نام اس کا صدف معلوم ہوا۔

”خاتون میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ میں ذاتی طور پر آپ کے معاملے کی تحقیقات کر رہا ہوں اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ بلا خوف و خطر آپ اپنا شک مجھے بتادیں۔“

خاتون نے اپنے سر پر چادر کو ٹھیک طرح سے رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ادا صاحب میں بغیر کسی لپٹی رکھے آپ کو بتاتی ہوں کہ مجھے شک کسی نہیں ہے صرف تشویش ہے اور میں آپ کو یہ بات بھی بتا دوں کہ میرے شوہر صرف میرے کہنے پر آپ کے پاس گئے تھے میں نے بھی انہیں صرف اس لیے کہا تھا کہ کوئی بڑی واردات میرا مطلب ہے چوری نہ ہو جائے۔“

”اچھا..... میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔

آپ اپنی نوکرانی نجمہ کے متعلق بتائیں کہ کیسے کردار کی مالک ہے؟“

”تمہیں ادا صاحب نجمہ میرا ہے میرا ایمان دار جفاکش

”کیا مطلب.....“ میں اچھل پڑا۔

”بالکل سر..... جابر نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔“

میں نے تازہ صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔

”سر..... اب باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ انشاء اللہ شام

سے پہلے پہلے سارے مطلوبہ بندے آپ کے سامنے ہوں گے۔“ اے ایس آئی نے ایک غزم سے کہا۔

اور واقعی شام سے پہلے پہلے سارے بندے تھانے میں تھے۔

ہم نے ان کو علیحدہ علیحدہ رکھا تھا اور ان کو اس طرح لایا گیا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی علم نہیں ہونے دیا تھا کہ اس وقت تھانے میں کون کون ہے؟

سب سے پہلے فقیر کو بلایا..... وہ اس وقت فقیر کے بھیس میں نہیں تھا۔ لیکن کپڑے اس نے سستے سے ہی پہنے ہوئے تھے۔ ایک موٹا تاجہ اور گندمی رنگ کا بندہ تھا۔

آنکھوں سے عیاری چھلکتی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی درویش.....!“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”میں تو ایک غریب بندہ ہوں، تمہاندار صاحب سارا دن کالج کے باہر بھیک مانگتا ہوں اور رات کو روکھی سوکھی کھا کر سو جاتا ہوں۔“

”دیکھو..... درویش یا جو بھی تمہارا نام ہے، تمہیں ہم نے اس لیے نہیں بلایا..... کہ تم یہاں قصہ چہار درویش سناؤ۔“

”پھر کس لیے مجھ غریب کو بلایا ہے؟“ اس کی معصومیت برقرار تھی۔

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ ”یہ بندہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔“

میں نے اپنی اسٹک اٹھائی اور زور سے اس کی شہ رگ میں چھو دی۔

وہ کسی زخمی تیل کی طرح ڈکرایا..... اور میری اسٹک کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اسٹک کا دباؤ مزید بڑھا دیا۔ اس کے گلے سے خرخر کی آوازیں نکلنے لگیں اور اس نے اسٹک سے ہاتھ ہٹا کر میرے سامنے جوڑ دیئے۔

میں نے اسٹک ہٹا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ادھر ادھر ڈول رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بیٹھا۔

”تمہاندار صاحب آپ ویسے ہی مجھ پر ظلم کر رہے ہیں میں نے کچھ نہیں کیا۔“

رسی جل گئی تھی لیکن بل نہیں گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”عدیل کو جانتے ہو؟“

”کون عدیل؟“

میں نے عدیل کو بلا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔

عدیل کو بھی اے ایس آئی نے بلایا تھا، اور وہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا۔

عدیل کو دیکھ کر درویش کا رنگ یوں اڑ گیا جیسے اس نے ملک الموت کو دیکھ لیا ہو۔

اور دوسری طرف عدیل کی آنکھوں سے بھی خوف جھانکنے لگا تھا۔

”اب بات کرو درویش صاحب، سچ بولنا ہے یا اپنی ہڈیوں کا سرمہ بونا ہے۔“

اس نے سر جھکا لیا..... یہ گویا اس کا اعتراف جرم تھا۔ اس کے بیان کا ذکر آگے آئے گا۔ میں نے اسے حالات میں بند کر دیا لیکن.....!

اس کے بیان کی روشنی میں ہم نے جابر کو گھیر لیا۔ مجرم جب تک پولیس کے ہتھے نہیں چڑھتے، چین کی بانسری بجاتے ہیں لیکن جب گرفت میں آتے ہیں تو ان کی چپیں بول جاتی ہیں۔ جابر کے ساتھ جو سوال و جواب ہوئے تھے ان میں چند سنا رہا ہوں۔

”جابر صاحب آپ نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا؟ مخالف پارٹی نے جنگل کاٹنے آرڈر لیا ہوا تھا اور اب آپ نے مقدمہ جیت لیا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس میں جھوٹ نہیں تھا.....!“ اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”اچھا ابھی بتا دیں کہ کس سچ صاحب کے پاس آپ کا مقدمہ تھا.....؟“ وہ آئیں بائیں شاہیں کرنے لگا..... میں نے ہیلکاپٹر شیل اکبر خان کو بلا کر اسے کہا۔

”اکبر خان.....!“

”جی سر..... بندہ حاضر ہے حکم کریں۔“

”اس بندے کو لے جاؤ اور ذرا درویش صاحب کے درشن کروادو..... میں نے جاہری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جب وہ حوالات میں بند درویش کو دیکھ کر آیا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ اور اس نے سب کچھ بتانے میں عافیت بھی۔
تو قارئین کہانی کچھ یوں بنتی ہے۔

درویش جاہر کا بندہ تھا ویسے تو وہ اللہ کا بندہ تھا لیکن کام جاہر کے لیے کرتا تھا جس کا ج میں عدیل پڑھتا تھا اس کے گیٹ کے ساتھ یہ فقیر کے بھیس میں بھیک مانگا کرتا تھا لیکن دراصل ہیر و رن فروخت کرتا تھا۔ جب کالج کے لڑکے اس کے پاس بھیک دینے آتے تھے تو یہ امیر گھرانوں کے لڑکوں کو جن لیتا تھا۔ ان کا ایک نیٹ ورک تھا سب کا ڈیٹا اس نے اپنے بندوں کے ذریعے جمع کیا ہوتا تھا..... یہ دم درود کا بھانسدے کر انہیں ہیر و رن کے سکرپٹ دیتا تھا اور کہتا تھا اس کو پینے سے تمہارے ذہن کوئی تازگی اور ذہانت ملے گی۔ تم جو کچھ پڑھو گے تمہیں یاد ہو جائے گا۔ ساتھ حفظ مافقہم کے طور پر یہ بھی کہتا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ سارا اثر الٹا ہو جائے گا وہ اس میں مصنوعی گلابی رنگ بھی ڈالتا تھا..... اور جب بچے ہیر و رن کے عادی ہو جاتے تھے تو ان سے صرف پیسے لیتا تھا عدیل بھی اس کا فکاہ بن گیا تھا پہلے وہ گھر سے صرف پیسے چراتا تھا پھر ایک دن انگوٹھی چرا کر درویش کو دے دی اور کہا تم مجھے ڈھائی مہینوں کے لیے پڑیاں دے دو آگے کالج میں چھٹیاں آنے والی ہیں۔

درویش نے انگوٹھی لے لی اور اسے ایک دن بتایا کہ وہ آکر اس سے پڑیاں لے لے یہ وہی دن تھا جب عدیل اس سے ملا تھا لیکن درویش نے اسے کہا چلتے پھرتے نظر آؤ..... تم نے مجھے کب انگوٹھی دی تھی اب اس کا ارادہ یہاں سے کہیں اور جانے کا تھا عدیل نے غصے میں آ کر اس کو کچھ لٹی سیدی باتیں کی تھیں آواز دھیمی تھی کیونکہ بقول اس کے وہ وہاں تماشا نہیں لکوانا چاہتا تھا اس کی اسی بجزوری سے فائدہ اٹھا کر درویش وہاں سے رو پھر ہو گیا تھا لیکن اسے یہ پتہ نہ لگ سکا کہ نوید (ہمارا خیر) اس کے تعاقب میں ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ اس نے انگوٹھی پہلے کیوں بھی پھر

بعد میں وہ بھر کیوں گیا تھا؟

دراصل مجھ سے غلطی ہوئی تھی شہر میں جو سینما ہے وہاں ایک فقیر بیٹھتا تھا وہ مجھے اچھی لگتی تھی ہماری کافی کپ شپ تھی۔ میں نے انگوٹھی اسے دے دی تھی۔ اس شرط پر کہ وہ میرے ساتھ میرے گھر میں وقت گزارے گی لیکن تھانے دار صاحب اگلے دن وہ غائب ہو گئی۔

میں نے اسے کہا تھا کہ اسے کہتے ہیں چوروں کو پڑ گئے موزا ب جاہر کی بھی سی لیں..... دراصل جاہر نے جنگل میں واقع ایک تہہ خانے میں غشیات رکھی ہوئی تھی اس کا پائٹر ایک علاقہ غیر کا پشوان فولاد خان تھا۔ ہم نے وہاں چھاپہ مار کر فولاد خان کو اور اس کے کارندوں کو جو تعداد میں دس تھے ان کو بھی گرفتار کر لیا تھا وہاں سے ہیر و رن چرس اور افون بھی ملی تھی اور آپ کے لیے دچکی کی بات یہ ہے کہ وہاں سے شجاعت علی بھی برآمد ہو گیا تھا..... اس کی حالت بہت خراب تھی اس کے جسم پر تشدد کے نشان تھے..... وہ کافی کمزور ہو گیا تھا..... بس اس کی زندگی تھی یا شاید اس باری تعالیٰ نے اسے اپنی محبوبہ جواب اس کی بیوی بھی تھی سے ملانا تھا۔

اب جاتے جاتے شجاعت علی کی کہانی بھی سن لیجیے یہ اسی کی زبانی ہے۔

تھانیدار صاحب جب سے مجھے پتہ چلا تھا کہ حاکم خان گلنار کے پیچھے پڑا ہوا ہے میں اس کو دنیا کے تختے سے اٹھانے کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ ویسے تھانیدار صاحب حاکم اس دنیا میں نہیں ہے لیکن میں اکثر یہی دعا کرتا تھا کہ خدایا اس کو اس دنیا سے اٹھالے..... ورنہ میں پھانسی چڑھ جاؤں گا..... اور گلنار کو کیا ہوگا؟

اب میں بات وہاں سے شروع کرتا ہوں جب میں جنگل میں گیا تھا پتہ نہیں اس دن میرے دماغ میں یہ بات کیسے ساکنی تھی کہ چلو جنگل میں چل کر تصویریں اتارتے ہیں۔

اس جگہ میں نے اس کو ٹوٹے ہوئے کہا۔
”تمہیں جنگل کے متعلق پھیلی ہوئی باتوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔“

”تھانیدار صاحب مجھے کوئی قوت جنگل میں جانے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ میرے ذہن سے ساری سنی سنائی باتیں نکل گئی تھیں۔ دراصل قارئین یہاں قدرت اپنا کام

کہا۔

صرف تصویریں اتارنے کے لیے۔

تم جھوٹ بولتے ہو، میں تمہاری کھال کھنچوا کر اس میں
بھس بھروادوں گا۔ سچ سچ بتادو..... کہ تم کو کس نے بھیجا ہے
؟ اور کیوں؟

میں نے ان کو لاکھ یقین دلایا کہ میں خود آیا ہوں مجھے
کسی نے نہیں بھیجا اور میرے آنے کا مقصد تصویریں
بنانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن پٹھان نے میری ایک نہ
سچی اور اپنے بندوں سے مجھے پٹوایا میں اپنی بات
پراڑا رہا..... انہوں نے مجھے قید کر دیا، ایک روٹی کے اوپر
پیاز رکھ کر دیا اور پانی کا ایک جگہ میرے پاس رکھ دیا۔ انہوں
نے میرا کبیرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔

پھر وہ تقریباً روز میرے اوپر تشدد کرنے لگے، تھانیدار
صاحب میرے پاس اس جواب کے علاوہ کوئی جواب نہیں
تھا۔ جو میں انہیں دے چکا تھا۔

وہ تو پانی کو بلو کر کھمن ٹکانے کے چکر میں تھے..... مجھے
دن میں صرف دو روٹیاں ایک ایک کر کے دیتے تھے کبھی
اچار کی ڈلی ہوتی تھی، کبھی پیاز کی چند قاشیں..... البتہ پانی
کا جگ سارا دن اور رات میرے پاس ہوتا تھا، چوٹیں
گھنٹوں میں چار جگہ مجھے بھر کر دیتے تھے قارئین شجاعت
علی تقریباً ایک ماہ زیر علاج رہا۔

پھر وہ دن آیا جب وہ میرے پاس تھانے میں اپنے
ویسے کا کارڈ دینے آیا اور تاکید کی کہ آپ نے ضرور
آنا ہے۔

اگر گڈریے والا واقعہ نہ ہوتا تو شاید ہم اس پراسرار جنگل
کی طرف متوجہ نہ ہوتے اور نہ فشیات فروشوں تک پہنچ سکتے
تھے۔



دکھا رہی تھی..... اب آگے کی سنے بہر حال جب تک میں
جنگل میں داخل نہیں ہوا مجھے سکون نہیں آیا ابھی میں تھوڑی
دور ہی گیا ہوں گا کہ مجھے محسوس ہوا کوئی میرے تعاقب میں
آ رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حاکم خان کو اپنے
تعاقب میں پایا۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا..... اس وقت
میں بالکل نہتا تھا میں نے اپنے خدا سے دعا مانگی کہ اے
دوڑوں جہاں کے مالک اگر حاکم خان میری جان کا دشمن بن
کر آیا ہے تو میری مدد فرما اتنی دیر میں حاکم خان میرے
قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ پیچھے تھا۔ میں نے کبیرہ
زمین پر رکھ دیا..... اور اپنا دفاع کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔
اچانک مجھے خبر کی چمک نظر آئی..... میں نے پھرتی سے
دار بچایا

وہ خیر تو تھا وہ دوبارہ حملہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کو
حرکت میں لایا..... لیکن.....!
اچانک اس کی چیخ جنگل میں گونج کر رہ گئی..... خبر اس
کے ہاتھ سے گر پڑا..... اور وہ اپنا دایاں پاؤں دبا تے ہوئے
زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کراہنے لگا اور واویلا کرنے لگا۔
ہائے مجھے سانس نے ڈس لیا ہے..... میں نے زمین کی
طرف دیکھا چند گز دور ایک کوبرا سانپ جا رہا تھا وہ دیکھتے
ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔

میں نے اپنا کبیرہ اٹھایا اور وہاں سے آگے کی طرف
روانہ ہو گیا۔ میں حاکم خان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا بلکہ بچی
بات پوچھیں تو میں اس کی کوئی مدد کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ
غلط تھا اور اس نے مجھے چند لمحے پہلے جان سے مارنے کی
کوشش کی تھی ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ مجھے قدموں
کی آہٹ سنائی دی..... اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا مجھے
چار پانچ آدمیوں نے پکڑا بلکہ جکڑ لیا..... ایک نے میرے
منہ پر ہاتھ رکھ کر دبایا میں نے کافی مزاحمت کی کوشش کی
لیکن کامیاب نہ ہو سکا..... انہوں نے مجھے ایک تہ خانے
میں قید کر دیا شام کو ایک کرخت شکل والے پٹھان کے
سامنے مجھے پیش کیا گیا۔

تم کس کے کہنے پر اس جنگل میں کبیرے سمیت آئے
تھے۔ مجھ سے پہلا سوال پٹھان نے یہ کیا۔

میں نے کہا میں خود آیا ہوں۔
لیکن کس لیے.....؟ پٹھان نے مجھے گھورتے ہوئے

حصار

Pakistanipoint

مریم جھانگیر

مریم جھانگیر خواتین رائٹروں میں ایک بڑا نام ہے اس ماہ انہوں نے بطور خاص نئے افق کے لئے قلم اٹھایا ہے وہ نئے افق کے قارئین کو کس حد تک متاثر کرتی ہیں اس کا اندازہ آپ کی آرا سے ہوگا انہوں نے روایات سے ہٹ کر موضوع کا انتخاب کیا ہے ان کی تحریر میں آپ کو اسرار بھی ملے گا اور سسپنس بھی ان کا ناول طویل ہونے کے باعث ہم دو حصوں میں شائع کر رہے ہیں۔

پڑھ کر اپنی رائے دینا نہ بھولیے گا





مجھے آئینہ کہتا ہے

زمیں پر حسن کی زندہ روایت تم سے ملتی ہے

فضا صدیوں سے بوجھل اور شادابی سے عاری تھی

ہوا کے تھہر پر بس اک جس اور لو کی سواری تھی

گھٹن تھی بے قراری تھی

اور ایسے میں تمہاری سانس مہکی اور خوشبو کا جنم ٹھہرا

کسی زرباب جھونکے سے تمہاری زلف لہرائی

تو کہساروں سے جھرنوں اور دریاؤں نے بہنے کا ہنر

سیکا

تمہاری آنکھ سے آنسو ٹپک کر خاک پر گرنے کی دیری

تھی

کے تاحہ نظر بزرے نے آنکھوں کو جلا بخشی اور ہریالی

نے اپنی آنکھ کھولی

تمہارے حسن کے کچھ رنگ فطرت نے چرائے اور یہ

منظر بنائے

تمہارے خال و خد کو سامنے رکھ کر

مصور نے دکان اور شاعر نے رہاں کھولی

تمہارے شوخ لہجے سے

نہ جانے کتنے موسم آکے رعنائی چراتے ہیں

تمہاری نیلگوں آنکھوں سے کتنے ہی سمندر ساحری کا

درس پاتے ہیں

تمہارے مرمر میں ہونٹوں کو چھو کر پھول اپنے حسن

کے خاکے میں اجلے رنگ بھرتے ہیں

تمہیں معلوم ہے تم اس زمیں پر زندگی، خوشبو، محبت

اور رنگوں کی علامت ہو

مگر یہ سب حوالے ایک جانب اور اجالے ایک جانب

اور تمہاری مسکراہٹ ایک جانب

تو پھر اے مسکراہٹ کی حسیں دیوی

یہ لازم ہے کہ تم بس خواب دیکھو، مسکراؤ مسکراتی اچھی

گلتی ہو

مجھے تم مسکراتی اچھی لگتی ہو

وہ اس کی فرمائش پر اس کے شانے پر لیٹی دھمے اور

ٹھہرے لہجے میں نظم سنار ہی تھی

بند آنکھوں پر لہرائی پلکیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ

اس کی نظروں کے ارتکاز سے واقف ہے اس نے پٹ سے

آنکھیں کھولی کمرے میں ہلکی نیلی روشنی کا عکس نیلے نیٹ

کے پردوں پر پڑ رہا تھا جیسے دھیرے دھیرے سے اللہ کی

مہربانیاں ماحول کو معطر کر رہی ہوں گول گول آنکھیں کھلی تو

شرارت سی بھری تھیں مگر سامنے والے کی آنکھوں کا مغنہوم

سمجھ کر شرم و حجاب سے جھک گئی وہ جو اس کی کمر کے گرد بازو

حاصل کیے اس کی پلکوں کی جنبش سے لطف انداز ہو رہا تھا

اس ادا پر ایک مرتبہ پھر نذاہودا وہ بہت دفعہ اس کو کہہ چکا تھا

آپ کتنی بار مجھے قتل کریں گی

اور وہ جواباً مسکرا کر سر جھکا لیتی۔

وہ پھر کہتا ایک دفعہ اور جان لے لی آپ کی مسکراہٹ

نے۔ وہ دائیں ہاتھ سے ہلکے ہلکے اس کے بال اٹھیوں پہ

پیشینہ لگایا اس کی روزانہ کی عادت تھی۔ سونے سے پہلے

اسے دیکھنا اور بہت دیکھنا۔

بس بھی کریں۔ اس نے ناک بھی یہاں سے وہاں گھما

ئی۔ جواباً اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ناک کو ہلکا سا

دبایا اور پوچھا میں نے کیا کیا ہے؟

اودھ میں نے آج ایک سوٹ لیا ہے آپ کو پہن کر

دکھاؤں؟ اس کی عادت تھی وہ بچوں کی سی خوشی سے اپنی

چھوٹی چھوٹی باتیں اس سے فیر کرتی۔ کسی بھی موقع کے

لیے خریدے جانے والے کپڑے موقع آنے سے پہلے

پہن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ اس کے کان کھڑے

ہو جاتے اور محوم محوم کر کپڑے دکھاتی۔ وہ اتنی ہی محصوم لگتی

جیسے بارش

ہاں وہ اسے کہتا تھا کہ آپ بارش کی طرح محصوم ہیں

جس کی اداؤں سے لوگ راستہ بھول جاتے ہیں منزل بدل

جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا اور اوپر نیچے سے لحاف کو اپنے نیچے دے دیا وہ پاس کھڑا مسکراتا رہا جیسے جانتا ہو کہ یہ لڑکی باز آنے والی قوم میں سے ہے ہی نہیں۔

”کبمل نکال لیں الماری سے۔“ لحاف کے اندر سے ٹھنکتی آواز آئی کپکپاہٹ کہیں دور دور تک نہ تھی۔ مجھے کبھی کسی وقت بے وقوف بنا سکتی ہے لوگوں کو بیویوں سے اسی لیے خوف آتا ہے۔ وہ اپنی سوچ پر ہنسا اور اگر یہ میری سوچ پڑھ لے تو میرا اتھوڑ کر دے گی اس نے سوچنا بند کر دیا اور دھیرے سے بولا۔

نہیں مجھے سردی نہیں لگ رہی میں ایسے ہی سو جاؤں گا

اف اچھا آجائیں اسی لحاف میں ٹام کروڑ بننے کی کوشش نہ کیا کریں دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا ہے اور آپ ایسے ہی سو جائیں گے سردی لگ گئی تو سارا موسم آپ کی شوں شوں نہیں بند ہونی پتا بھی ہے نازک مزاج ہیں احتیاط کی ضرورت ہے لیکن سارا دھیان میں ہی رکھوں اپنا خیال خود رکھا کریں بلکہ ساتھ میرا بھی رکھا کریں میں ہمیشہ اس کی کیسٹ پلے ہو گئی تھی مانتے پر دیئے گئے پیار نے اسکی کھج کھج پر فل اشاپ لگایا۔

وہ اس کی شرٹ کو مضبوطی سے تھامے لیٹی رہی اور اس نے دھیرے سے واپس اسے اپنے شانے پر لٹالیا۔ وہ اس وزن کو ساری عمر برداشت کر سکتا تھا بلکہ سو باہر کر جی اٹھتا اور کوئی اس سے اس کی خواہش پوچھتا تو وہ ان ہی لمحوں کا اور اسی وزن کا مطالبہ کرتا۔

چاند نے کھڑکی سے اس حسین منظر کو دیکھا اور نیل محل کی چوکھٹ پر اپنی عقیدت رقم کر دی محبت نے اس دروازے کو ہنس کر قبول کیا تھا اور ان دونوں کی محبت کو بیٹھنے کی دعادی۔

☆☆☆

قطرہ قطرہ رات کی سیاہی شام کے سرمئی سروں کو چوس

لیتے ہیں جان دے دیتے ہیں۔ آپ نہ بھول جانا کبھی راستہ ورنہ گھلا بادوں کی

لیکن یہ شوخ و چنچل روپ تب تک رہتا جب تک دن اپنے عروج پر ہوتا۔ جیسے جیسے شام پڑنے لگتی وہ ڈھیلی پڑ جاتی فرمانبرداری ہو جاتی جس کی فرمانبرداری پر اسے صبح میں شکرانے کے نفل پڑھنے کا دل کرتا

”جی دکھائیں۔“ اب جب تک وہ اپنے نئے کپڑوں میں تعریفیں نہ سن لیتی اسے یقین کہاں آتا تھا لہذا اسے اجازت دینی پڑی۔

وہ اٹھی اور واداش روم میں چلی گئی اندر سے لاک کرنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی وہ ہنسی وہ حیران ہوا اور دروازے کے قریب آگیا

میں کوئی کپڑے نہیں لائی آپ کا ایکسرے سیشن ختم ہونے میں نہیں آتا۔ میرے ضد و خال یاد کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ توبہ کریں اور کہیں اب نہیں دیکھوں گا پھر آؤں گی باہر۔“ وہ اندر سے کہہ رہی تھی باہر سے جواب میں خاموشی ملی۔

”ہیلو۔“ آواز نہ آنے پر وہ پھر بولی۔

”ٹینشنک ون تو تھری۔“ نسوانی آواز میں شرارت کھلی ہوئی تھی باہر کھڑے مرد نے مچلا ب دانتوں تلے دبایا یہ ایسی ہی تھی اس کے ساتھ مستی سے بھری ہوئی اب آواز میں فکر تھی اور پھر جواب میں خاموشی۔۔۔۔

لاک کھناک سے کھلا وہ دروازے کے پیچھے ہو گیا وہ باہر نکلی اور اسے اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ کئی لمبے لمبے گزرے وہ اس کو دیکھ رہا تھا لمبی لمبی مڑی ہوئی پلکیں اور چھوٹی سی ٹھوڑی۔۔۔۔ وہ اسے دیکھتا رہا وہ بھول گئی تھی کہ ایک اسی شخص کو تو قابو کرنا آتا ہے۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“ اب نسوانی آواز میں جونہی وہ پیچھے ہٹا کپکپاہٹ تھی۔ اس نے ایک جست میں اسے اٹھا لیا اور بستر پر لٹالیا۔ وہ سانسوں کو روک کے لیٹی رہی۔

ہوانے بلند کیا اور ساتھ ہی ایک جھٹکے سے زمین پر
گرنے لگی بلندی سے پستی کا سفر اس لمحے لگا کے اتنی

.....☆☆.....

اگستویر ۲۰۱۷ء

ہے ورنہ کنول کے پھول تو کچھڑ میں ہی کھلتے ہیں۔ اگر زمانے یا ارد گرد کی برائی کا اثر ہوتا تو کنول کے پھولوں میں بھی تازگی نہ ہوتی اچھائی اور برائی کا عنصر ہر شخص میں موجود ہے اور اس کی اپنی اپنی لے ہے جس میں وہ قہر کتا ہے جو نبی اس کے اندر کے شریا خیر کو موافق حالات میسر آتے ہیں وہ نشوونما پانے لگتا ہے میری بات واضح ہو جانی چاہیے کہ برانہ زمانہ ہے نہ آپ ہیں بلکہ بری برائی ہے اور برائی ہر وہ چیز ہے جو معاشرے کے مذہب یا سماجی معیار سے گری ہوئی ہے جس طرح ہمیں گرد و پیش میں برائی بڑھتی نظر آ رہی ہے اسی طرح ENTROPY بھی ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔

ساتھ ہی پروفیسر کی نظر گھڑی پر پڑی اور انہوں نے کلاس سے کہا

نماز کا وقت ہو چکا ہے اس فرض کی ادائیگی کے بعد کلاس کو ہمیں سے شروع کریں گے حیدر نے اپنے رجسٹر میں قلم رکھا اور اٹھ کر جانے لگا کیوں کی طرف سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں لیکن ایک آواز کافی نمایاں تھی

”میں جب کہہ رہی ہوں کہ ENTROPY کے ٹاپک کا اینڈ سر کر کے گئے ہیں تو پھر صحیح کہہ رہی ہوں وہ آ کر اگلا ٹاپک ہی پڑھائیں گے۔“

حیدر نے اس پر یقین آوازی کی تلاش میں گردن موڑی لیکن پہچان نہ سکا اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور یونیورسٹی کی مسجد کی طرف چل دیا۔

رفاء انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے سیکٹر 14-1 میں موجود ہے گولڑہ موڑ کے انتہائی پر ہجوم چوک کے بعد اندر جاتے کچے کچے راستے حاجی کیپ کے ساتھ گیٹ پر تھے نظر آتے ہیں۔ نہ زیادہ بڑی نہ زیادہ چھوٹی ہونیورسٹی جس میں بلیاں بھاگتی نظر آتی ہیں اور کبھی کتے بھی بھونکتے ملتے ہیں کیفے کے نام پر چھوٹے چھوٹے دو دکان نما ڈھابے ہیں۔ عملے کی رہائش کے لیے کوارٹر بھی موجود ہیں

فلسفہ میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شعبے میں کیوں نہ ہوں ان کے اندر کا فلسفہ باہر آنے کے لیے کوئی درپچہ کوئی روزن تلاش کر ہی لیتا ہے۔ منطقی مضامین پڑھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں یا تو وہ فلسفہ سن لیتے ہیں یا نہیں سنتے بحیثیت طالب علم اس جماعت میں سب ہی کو بشمول اس چھوٹے سے چوہے کے جو طالب علم نہیں تھا لیکن جو کل رات ہی کمرے میں پڑے بیٹھ میں آن بیٹھا تھا فلسفہ سننا تھا چاہے اسے دوسرے کان سے ساتھ ساتھ کمال ہی کیوں نہ رہے۔

ENTROPY کو اگر عام فہم زبان میں سمجھاؤ تو یہ دراصل نظام میں بگاڑ ہے جب کسی سسٹم میں ڈس آرڈر ہوتا ہے اسے کہتے ہیں اور اگر ہم سائنسی کلیوں کی مدد سے ENTROPY جانیں یا عام زندگی میں دیکھیں تو یہ بگاڑ ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے میرے ایک ٹیچر نے مجھے ENTROPY سمجھانے کے لیے داتا دربار کے باہر سڑک پر کھڑا کیا۔

اندرون لاہور میں ٹریفک کا بے ہنگم شور اور دوسری تیسری قسم کی سواری کا آپس میں ٹکراؤ نظر آ رہا تھا سواریاں تو دور کی بات پیدل چلنے والوں کے لیے بھی راستہ نہیں تھا جو جہاں سے گزرنے کی کوشش کرتا وہی سے مات کھاتا وہاں کھڑے ہو کر مجھے سمجھ میں آیا تھا کہ یہ ہے ENTROPY اب اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہم اگر پورے زمانے کو سسٹم سمجھ لیں تو ہم یہ پڑھنے آئے ہیں کہ ہر گزرنے والا زمانہ آنے والے زمانے کی نسبت اچھا ہے۔ اسلام میں ہمیں زمانے کو برا کہنے کی بھی اجازت نہیں ہے کیونکہ برائی زمانے میں نہیں ہوتی برائی ہمارے اپنے اندر ہوتی ہے۔

جب ہمارے اندر کی برائی اور باہر زمانے کی برائی کی فریکوئنسی کی تال مل جاتی ہے تو برائی کا شور بڑھ جاتا ہے اور برائی ہمیں ہر جگہ نظر آنے لگتی ہے برائی اسی طرح بڑھتی

اور طلبہ طالبات کی رہائش کے لیے ہاسٹل بھی موجود ہے۔
گر بچہ نشین میں اس کے والد کی وفات کے بعد یہ ادارہ
حیدر کی منزل بنا۔ اسے کیا پتا تھا کہ کون سی منزلیں راستے
بہلا دیتی ہیں کون سی عمارتیں اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں اور
کیسے کیسے پکے راستے بھی کبھی قدموں میں ان دیکھی زنجیر
کی طرح بیزی بن جاتے ہیں کن منزلوں کے ساتھی
مسافر ٹھہرتے ہیں پھر جڑ جاتے ہیں اور کن منزلوں کے مسافر
ساتھی بنتے ہیں اور زندگی بھر ساتھ بھاتے ہیں حیدر کو کیا پتہ
تھا یہ کسی منزل ہے؟



ماہ روز زندگی میں پہلی دفعہ لڑکوں کے ساتھ نہیں بڑھ
رہی تھی اس نے تمام تعلیم خطوط اداروں سے ہی حاصل کی تھی
وہ جانتی تھی کہ لڑکوں کو کس طرح حد میں رکھنا ہے کہاں
خاموش ہونا ہے اور کہاں جواب دینا ہے۔ آسانی رنگ کی
لبی قمیض پہنے روز اول سے وہ مکمل کسی نظر کے حصار میں
تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھابت تھکتا تھا کیونکہ ماہ روز جوں ہی
اس کی تلاش میں نظر گھماتی تو کوئی اسے متوجہ نظر نہ آتا
آکھ مچولی کا یہ کیمیل ماہ روز کے لیے ذہنی الجھن کا باعث
بن رہا تھا۔

اس کے دماغ میں راسخ تھا کہ کوئی مجھے کیوں دیکھے گا؟
مکمل نظر میں وہ عام سی لڑکی تھی بہت عام سی ویسی جیسی آس
پاس ہزاروں نظر آتی ہیں جن پر ایک لحظے کو بھی نظر نہیں
ٹھہرتی نہ تو اپسراؤں جیسا حسن تھا نہ حوروں جیسی آنکھیں
بولتی تو لیوں سے کبھی پتھر یاں نہیں جھرتی تھیں لیکن اس کے
خال و خد کو اگر الگ الگ دیکھا جائے تو ایک دقار و شائستگی
اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی ویسی عام سی لڑکیاں
یہاں وہاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں مگر کسی ایک کے لیے
ان کی تمام تر عمومیت خاصیت میں بدل جاتی ہے۔ ایسی
لڑکیوں کو دل میں اترنے کا فن آتا ہے مگر دل سے اترنے کا
فن نہیں آتا۔ جس طرح جتنا گہرا رنگ تادیر لگی مہندی کا آتا

ہے اسی طرح ان عام سی لڑکیوں کے لیے محبت کبھی دل
میں جاگ اٹھے تو وہ دل اپنی دھڑکنوں کو قابو میں رکھنے کی
کوشش میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ ماہ روز کو عام سی لڑکی
ہونے پر فخر تھا وہ دوسروں کو حیرت میں مبتلا کرنے کے لیے
اپنی ڈگر سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کرتی تھی کیونکہ ایسا کام
دوسروں کو حیرت میں مبتلا کرے یا نہ کرے لیکن ان عام سی
لڑکیوں کو عام نہیں رہنے دیتا۔

جیسے درخت پر لگے ناریل سے لے کر کش ہوئے خشک
ناریل تک اس کے مختلف ذائقے چکھنے کو ملتے ہیں وہ بھی
ایسی ہی تھی کبھی سخت کبھی نرم کبھی اداس کبھی خوش کبھی خفا
کبھی مہکتی ہوا ڈوبتے سورج کے سارے رنگ اس کے
اندر تھے کبھی یوں ہوتا کہ پوری کلاس میں صرف وہی بول
رہی ہوتی اور کبھی یوں کہ صرف وہی سن رہی ہوتی۔

ان دو مسلسل تپتی آنکھوں نے ماہ روز کے اضطراب
میں اضافہ کر دیا تھا سب کے لیے نمایاں ہونا اسے پسند تھا
مگر کسی ایک انجان شخص کی نظروں میں رہنا اور نمایاں ہونا
پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا اپنے آپ کو گن اور بے پروا ظاہر
کرنے کے لیے کتاب میں موبائل رکھے سر جھکائے گم
رہتی کہ جو کوئی ہے خود ہی تھک ہار کر دیکھنا چھوڑ دے گا۔



بالوں کے درمیان میں سے مانگ نکال کر دو پونیاں
بتائے سات سال کی بچی کھڑکی سے چپکی کھڑی ہوئی تھی
آنکھوں میں حسرت کی داستان بے بسی سے دانتوں میں
دبے لبوں نے عیاں کر رکھا تھا کھڑکی کے اس پار کے منظر
میں قلفی والا آواز میں لگا تا گزر رہا تھا۔

”ٹھنڈی ٹھنڈی قلفی لے لو بھائی حرے دار قلفی لے
لو۔“ چوک میں لگے ٹل سے محلے کی خواتین پانی بھر رہی
تھیں ان میں پہلے پانی بھرنے کی افراتفری تھی آتا جانا لگا
ہوا تھا اس ساری گہما گہمی میں روزی کی آنکھیں قاسم پر
مرکز تھیں مانو سارا جسم آکھ بنا ہوا تھا وہ آٹھ دس سال کا بچہ

پورے گھر میں صرف دو ہی لوگ رہ گئے تھے ظفر صاحب اور روزی۔

ابا نے ہر دفعہ بتایا ہے آپ کو اردو کا مزہ تب آتا ہے جب اس کی قاشیں چینی میں لت پت کر کے کھائی جائیں ظفر صاحب روزی کو بہلانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
”چلو تم چینی لگا کر کھانا میں کالا نمک لگا کر کھاؤں گا۔“
آخر کو ظفر صاحب نے درمیانی راستہ نکالا۔



وقت کے کا سے میں ماہ و سال گرتے گئے۔ سات برس کی روزی اٹھارہ برس کی ہو گئی۔ دھیرے دھیرے سے گزرنے والی عمر اور ریک ریک کر گزرتا۔ وقت بیٹیوں کے معاملے میں خود کو پر لگا لیتا ہے بیٹیاں بڑی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں ان کی عمر خورد و تیل کی طرح بڑھتی جاتی ہیں بڑھتی عمر میں ذات میں بھی ان دیکھی تبدیلیاں پروان چڑھتی ہیں سوچ کے دائرے وسیع ہوتے ہیں اور جذبول کا عظیم انجمنے بیٹھے میں بھی تبدیلی لے آتا ہے۔
لڑکی نام ہی ہار سکھار اور پیار کا ہے روزی کی ذات میں بھی تبدیلیاں سراٹھار ہی تھیں۔

روزی نے کیلے بالوں سے تولیہ جھٹکے سے اتارا اور دروازے پر سو کھنے کو ڈال دیا بالوں کو سہلاتی آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔

کنکھی کی جانب ہاتھ بڑھایا اسے پکڑا مگر کنکھی ہاتھ نہ آئی اس نے کنکھی کے جس سرے کو ہاتھ میں لیا اسے زور سے کھینچا کیا دیکھتی ہے کہ بد ہیئت اور کالے سر مٹی مائل رنگ کی گندی سی چھپکلی نے دوسرے سرے سے کنکھی کے دندانے منہ میں نہ دبائے ہوئے ہیں۔

اتنی خوفناک چھپکلی کہ وہ غور نہ کر سکی کہ دندانے منہ میں ہیں یا زبان دندانوں کے گرد ہے اس کی جج ہی نکل گئی اتنی چھپیں اگر کسی جانور کے سامنے ماری جائیں تو وہ ڈر کر بھاگ کھڑا ہو مگر چھپکلی عجیب ڈھیت ابن ڈھیت تھی اپنی

اپنی چھوٹی بہن اسری کا ہاتھ تھامے جا رہا تھا سڑک والی طرف وہ خود چل رہا تھا اور مکانون والی طرف چھوٹی کو کر رکھا تھا۔ روزی نے ابا کی محسوس کی تھی ابا کو جوانی میں شوگر نے آن لیا تھا اس کا وجود باہر کے کاموں میں ہی کھپ جاتا اور ماں کی گود کی گرمی روزی نے محسوس ہی کب کی تھی ایک دھندلی سی یاد تھی جو مندر میں کنڈلی مار کر بیٹھی تھی اور ہر سیدی منہ دھوئی عورت میں اس یاد کا عکس حیر نے لگتا قاسم اب بصارت سے دور تھا روزی کی ساری توجہ باہر کے منظر سے ختم ہو گئی وہ پیچھے ہٹی اور بستر پر بیٹھ گئی تب ہی ابا حضور کمرے میں داخل ہوئے۔
”روزی بیٹا کھانا کھا لیا ہے؟“

”جی ابا جی۔“ بنیدہ چہرہ مختصر جواب یہ عمر اس متانت کے ساتھ بھاؤ نہیں کھاتی تھی ابا کا دل لرز اور ننھی سی پری کو سینے سے لگایا۔

”میری گریڈا ادھر اکیلے کیا کر رہی ہو ساتھ ٹمینہ کے گھر چلی جا ویکھل کو دو اور نہ فیضی انکل کی طرف چلی جاؤ۔“
”ابا ٹمینہ گاؤں گئی ہوئی ہے اور فیضی انکل کے گھر اس وقت کون ہو گا میں نے ابھی دیکھا تھا قاسم اور اسری تو ٹیوٹن جا رہے تھے میں وہاں کیا کروں گی۔“ روزی نے آرام سے جواب دیا۔

”قلقی تو نہیں کھانی میری بیٹی نے۔“ ابا جی کی نظر باہر پڑی تو بولے۔

”نہیں ابا جی بہت میٹھی ہوتی ہے۔“ وہ سمجھداری سے بولی۔

”چلو ادھر ہم صحن میں چلتے ہیں میں تمہیں درخت پر چڑھاؤں گا تم اردو توڑ توڑ کر نیچے پھینکنا پھر ہم کالا نمک لگا کر کھائیں گے۔“

ظفر صاحب کی زندگی اسی ننھی پری کے گرد ہوتی تھی اللہ نے جوڑ ملایا تو ایک سیدی سادی بیگم ملی چند سال خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے گزر گئے لیکن اب

تھا وہ کیا باتی؟

”دیکھو میں نے وہاں دروازہ کھولا اور اتنی دور سے آواز سن کر چپکلی بھاگ گئی۔“ تم نے یونہی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا ایتنا دل بڑا کرو اگر آج کسی بے زبان چیز سے اتنا ڈر جاؤ گی تو یہ دنیا جس میں بھانت بھانت کے لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑتا ہے جن کی گز گز بھر لی زبانیں ہیں ان سے جان کیسے چھڑاؤ گی ڈر جانا کسی بھی معاملے یا مسئلے کا حل نہیں ہوتا چیزوں کا سامنا کرنا سیکھو۔“ ظفر صاحب نے نرمی سے روزی کو سمجھایا۔

اس نے بھی سر ہلا دیا۔ اباجی کے جاتے ہی وہ شیشے کے عین سامنے کھڑی ہوئی۔ اس نے بالوں کی دوٹیس تھام کر پیچھے کچر سے باندھی اور ہلکا نیلا شٹھون کا ڈوپٹہ سر پر لٹکایا جو نہ تو نکا اور نہ ہی اترا بیگ کندھے پر پہنا اور دلہیز عبور کر گئی۔

بچیوں کے لیے ماں کا وجود بے حد اہم ہوتا ہے ماں وہ رشتہ ہے جو بڑھتی بچیوں کی عادتوں میں تراش خراش کر کے انہیں دنیا کے سامنے قابل ستائش بنا کر پیش کرتا ہے وہ ٹھنڈی چھاؤں جو اگر دنیا کی ریت سے واقف اور مجبور نہ ہو تو بیٹیوں کو مصدوق میں چھپا کر رکھے اور کسی کو دیکھنے بھی نہ دے مگر یہ بھی سچ ہے جس جان نے دنیا میں آنا ہے چاہے اسے ماں ملے یا نہ ملے باپ ملے یا نہ ملے اس نے پل جانا ہے روزی بھی پل گئی تھی۔

مدیحہ باجی کی دلہیز سے اندر داخل ہوتے روزی نے قاسم کو بیٹھا دیکھ لیا مگر بجویشن میں داخلے کے ساتھ ہی یہ ٹیوشن انگریزی کے خشک مضمون میں مدد کا ذریعہ بنی۔ ساتھ ہی ساتھ بچپن سے قاسم کے ساتھ دوستی کا رشتہ بھی مستقبل کی کہتیں ڈھونڈنے لگا۔

”اسلام علیکم۔“ وہ سلام جھاڑتی وہیں قالین پر دوہم سے بیٹھ گئی

نیالی آنکھیں روزی پر مرکوز کیے نہ تو وہ خود ایک انچ اپنی جگہ سے سر کی رو نہ کھینچی پر اپنی زبان کی گرفت ڈھیلی کی روزی بھی اب سراسیمگی میں جلا ہو گئی اب تو گھر تھے نہیں کہ انہیں بلاتی اس نے دور کھڑے ہو کر شش شش کی آواز نکالی مگر چپکلی میں جنبش نہ ارد اب روزی نے اپنے ارد گرد دیکھا سٹیل کا بیگر جس سے ابھی پکڑے اتارے تھے بستر پر دھرا تھا اس نے بیگر اٹھایا اور اس کی طرف پھینکا بیگر کنگھی سے ٹکرا کر ایسے نیچے گر اچھے عمل کا رد عمل ہوا اور بیگر کی جگہ elastic ہو خوف کی ایک لہر روزی کے جسم میں دوڑی چپکلی کی آنکھیں روزی کے وجود سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

روزی نے اب اس پر نظریں لٹکا کر رکھی تو یوں لگا کہ اس کا کھردرا جسم رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے اس سے پہلے کے ڈری سبھی روزی ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتی دروازے کے کٹناک سے کھٹنے کی آواز آئی۔

روزی اب کو پکارتی کمرے سے باہر نکلی کمرے سے باہر نکلتے وقت وہ دروازے سے بالکل جڑ کر باہر نکلی کیوں کے اسے یہ خوف تھا کہ کہیں چپکلی اس پر چھلانگ ہی نہ لگا دے ظفر صاحب نے شپٹائی گھبرائی روزی کو دیکھا تو پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ جواباً روزی کی کھٹکھی بند گئی۔

”بیٹا گڑبا بولنا کیا ہو گیا؟“

”ابا وہ چپکلی۔“

”کیا ہوا امیر اشیر بیٹا چپکلی سے ڈر گیا کہاں ہے وہ اتنی چھوٹی سی چیز ہے وہ اور آپ اتنی بڑی ہو گئی ہو اسے بھگا دیتیں۔“ ظفر صاحب نے اسے کندھے سے پکڑ کر قریب کرتے ہوئے کہا روزی کے پاس کچھ کہنے کے لیے نہیں تھا اس نے اپنے قدم کمرے کی طرف بڑھائے ظفر صاحب بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے کمرے میں آ گئے۔ روزی نے انگلی کا اشارہ کنگھی کی طرف کیا لیکن اب وہاں کچھ نہیں

لوگ میرا نشانہ بن جاؤ دونوں نے سر جھکا دیئے اور کتابیں کھولنے لگے۔

مدیر باجی محلے بھری استانی تھیں اپنے زمانے میں انگریزی میں ماسٹر کیا اور ساتھ ہی ساتھ مقابلے کے امتحان میں بیٹھی تھیں اس لیے محلے پر ان کی دھماک بیٹھی ہوئی تھی مقامی اسکول میں پڑھا کر گھر آتی اپنے بچوں کو کھانا کھلاتی اور انہیں سنانے کے لیے لٹاتی بچے سوتے یا نہ سوتے یہ خود ضرور سو جاتی ہمسائے قابل اعتماد تھے گھر کا

دروازہ کھلا رہتا سامنے ہی ان کے میاں کا جنرل اسٹور تھا پڑھنے کے لیے آنے والے محن میں بچے قالین پر بیٹھ کر ان کے اٹھنے کا انتظار کرتے اسی انتظار میں روزی اور قاسم کے دل کی بات ان کی زبان پر آنے لگی تھی کچھ رشتے ہماری عمر کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں جتنے مضبوط ہم خود ہوتے ہیں اتنے ہی یہ رشتے بھی ہو جاتے ہیں ان رشتوں سے منسلک خواب ہمیں برا تو ہونے دیتے ہیں مگر بوڑھا نہیں ہونے دیتے انہی خوابوں کا رشتہ روزی اور قاسم کے درمیان اب وعدوں میں ڈھلنے لگ گیا تھا۔

اے عمر رواں ذرا آہستہ چل۔

☆.....☆.....☆

بیچے پلٹ کر دیکھا فقط گردہ رچی

ایسے جیسے کے جینے کی فرصت نہیں ملی

حیدر جلدی گھر سے نکلا تھا کون سا اسے کسی برد کھاوے کے لیے جانا تھا کہ فکر کرتا ہی ٹرٹ اور جینے بچے گھر کے ہی سلیپر پہنے بائیک کو لگ ماری تو سپید حایو نیورٹی کے سامنے جا کر کا آگے کوئی بھی جگہ خالی نہ تھی مجبوراً اسے پیچھے بیٹھنا پڑا لیکن شروع ہو چکا تھا اس لیے کچھ بھی پلے نہ پڑ رہا تھا نظریں آگے پیچھے گھومنے لگ گئیں کلاس میں کسی ایک کو شدید قسم کی بے چینی تھی اس کا ایک ہاتھ بار بار ڈوپٹے پر جاتا اور ڈوپٹے کو سر پر ٹکانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید ریشمی دوپٹہ تھا جس نے نہ نکلنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

جواب دیئے استفسار کیا یہ اس کی ناراضگی کا پہلا اشارہ تھا۔
”وہ میں آنے والی تھی کہ چھپکلی نے سارا وقت ضائع کر دیا۔“ روزی نے مختصر سی وضاحت دی خوف نے ابھی تک اس کے اندر بیٹھنے گاڑے ہوئے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ قاسم قاسم قاسم قاسم قاسم قاسم قاسم قاسم کے گلے پڑی ہوتی کے مجھے دیکھ کر بات کر دیا پھر لمبی سی وضاحت دیتی قاسم سمجھ گیا کہ قلو پھرہ کا مزاج گمراہی برہم ہے۔

”کیا ہو روزی“

”کچھ نہیں۔“ بس اتنا سا جواب آیا اب قاسم باقاعدہ اس لمبے بالوں اور گول گول آنکھوں والی لڑکی کی طرف مز کر بیٹھ گیا۔

”روزی۔“ جواب نہیں آیا وہ ساکن تھی۔

”روزی تمہیں پتا ہے میں تمہیں روزی کیوں کہتا ہوں؟ باقی سب بھی کہتے ہیں لیکن میں جب تمہارا نام لیتا ہوں تو roses اپنی تمام تر خوبصورتی اور نرمی کے ساتھ میرے تصور میں آ جاتے ہیں گلابوں کی شہزادی لگتی ہو مجھے تم جسے اگر اللہ نہ کرے زمانے کی سرد یا تند ہواوں نے چھوا تو مر جھا جائے۔“ قاسم کی آنکھوں میں ستاروں کی روشنی ابھری روزی نے پل بھر کو آنکھیں اٹھائیں اور پھر پلکوں کا چلن گرایا۔

”بس کرو اب میں کسی دن فیضی انکل کو بتا دوں گی کے آپ کا بیٹا مجھ پر لائنیں مارتا ہے۔“

”لائنیں ارے اللہ کی بندی میں تو چھ فٹ کا بندہ اسکیل لے کر کھڑا ہوں تم میری طرف دیکھو تو سہی قاسم کے لہجے میں شرارت تھی

جو اسکیل لے کر کھڑے ہونا اسی اسکیل سے میں تمہیں ماروں گی روزی نے اپنی فطری شرم پر قابو پا لیا۔ اسی اثناء میں آدھی سوئی مدیر باجی کمرے سے نکلے

”ہاں بھی کسی اسکیل کے بارے میں بات کر رہے ہو دونوں یہ نہ ہو ایک دوسرے کی درگت بنانے کے بجائے تم

لیکچر ختم ہوا تو پروفیسر صاحب نے حاضری ٹیٹ نکالی۔

مرفضی زیدی یس سرکنزہ فاطمہ یس سرماہ روز ریشی ڈوپنے والی لڑکی نے باقاعدہ کھڑے ہو کر کہا یس سر پروفیسر صاحب نے عینک ناک پر دھری ہوئی تھی سیدھی کر کے اس کھڑی ہونے والی لڑکی کو دیکھا جواب بیٹھ چکی تھی

”بیٹا آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟“ اس سے پہلے کے وہ لڑکی جواب دیتی لڑکوں کی طرف سے آواز آئی

”سرجب مہینہ روز آئے اسے کہتے ہیں ماہ روز“ اس سے پہلے کے کلاس میں ہلکی سی کھی کھی کی آواز بلند ہئی میں تبدیل ہوتی ماہ روز نے خاصے سر دلچسپیں مڑ کر اس لڑکے کو گھورا۔

محترم آپ سے کسی نے نہیں پوچھا۔“ یعنی مزاج برہم اب آسمان زمین پر بھی آجاتا تو ماہ روز سے اس کے نام کے معنی نہیں پوچھ سکتا تھا۔

پروفیسر صاحب بھی شاید ڈانٹنے کی تبدیلی کے لیے نام کے معنی پوچھ رہے تھے لہذا واپس حاضری کی طرف متوجہ ہو گئے طبعیات کے پروفیسروں کو نفسیات سے کیا لگاؤ؟

اس سارے دور اپنے میں حیدر ماہ روز پر اپنی توجہ مرکوز کر چکا تھا وہ گہری نظروں سے اس لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔

لڑکیوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک خطرے کی گھنٹی رکھی ہوتی ہے جب مسلسل دو آنکھیں تک رہی ہوں تو لڑکی کا سر خود بخود اس سمت گھوم جاتا ہے ماہ روز نے بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن حیدر اپنی نظروں کا زاویہ بدل چکا تھا

آنے والے دنوں میں حیدر کو لگا کہ کشش کی تمام تر قوتیں ماہ روز کے جسم سے پھوٹتی ہیں یہ پہلی نظر کی محبت نہیں تھی لیکن وہ متاثر ہو رہا تھا بری طرح متاثر اس کے چلنے سے اٹھنے سے، بیٹھنے سے بولنے سے، ایک ایسا لڑکا جس

کے پاس والدین جیسی نعمت نہیں تھی اور جو اپنی بڑی اور چھوٹی بہنوں کا باپ بھی تھا اور ماں بھی اسے ان دیکھی قوتیں ایسے بھنور میں لے جا رہی تھیں جہاں ڈوبنے والے کبھی نہیں ابھرتے انہیں کسی دوسری گرد کی ذات کا دائرہ اپنے اندر کبھی ناتبا کرنے کے لیے سمیٹ لیتا ہے۔

آنے والے دنوں میں حیدر کو احساس ہوا کہ جس گھاٹ کا پانی پینے کی پیاس اس کے حلق کو خشک کیے دے رہی ہے وہ گھاٹ بہتی ندی جیسا ہے ٹہرنے کے فن سے آشنای نہیں اور نہ ہی اس پر ایسا کوئی مقام ہے جس پر کچھ دیر بیٹھ کر سستا پایا جائے۔

ماہ روز چلتی پھرتی تصوراتی دنیا تھی جس کے اپنے خیالات تھے اور اپنی دھونس کبھی سب پر حاوی نظر آتی اور کبھی ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آگیا تھا کہ اس سے بات کرنا آہل مجھے مار کے مترادف ہے۔

دلی پتلی کامنی سی لڑکی جس کے کالے کالے بال اور بادامی گول سی آنکھیں کسی ایک جگہ پر نہ ٹھہرتی تھیں

کشش کے سوتے چھوڑتا یہ وجود اپنے گرد repulsion کا ایک حصار لیے چلتا نظر آتا تھا حیدر کو مشکل کام کرنے کا شوق تھا اور شاید اس کی زندگی کا مشکل ترین کام تھا ماہ روز

سے راہ و رسم بڑھانا خود حیدر بھی نہیں جانتا تھا وہ اس میں کامیاب ہو سکے گا یا نہیں یہ تو طے تھا کہ اگر اس نے براہ راست جا کر ماہ روز سے بات کی تو وہ درگت بنے گی کہ

پوری یونیورسٹی متاثر دیکھے گی لیکن دل ہے کہ مانتا ہی نہیں لا حاصل تک رسائی کا بھی کوئی نا کوئی ذریعہ نکال ہی لیتا ہے

کبھی نہ ٹھننے والا حصار بن جاؤں

وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

☆ ☆ ☆

موسم نے انگریزی لی اور کالے کالے بادلوں نے آسمان کو ڈھک لیا روزی نے موسم کے تیور دیکھتے ہوئے بیسن میں آلو پیاز پالک اور مصالے ڈال کر پکڑوں کا آمیزہ

تیار کیا کڑھائی میں جوں ہی تیل گرم ہوا سنہرے سنہرے پکڑے پلیٹ میں سجائے وہ ابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
”ارے میرا بیٹا پکڑے بنا کر لایا ہے۔“ ظفر صاحب کے لہجے میں محبت تھی۔

”جی باباجی میں فریق سے چٹنی نکال کر لاتی ہوں۔“ روزی نے میز پر پکڑے رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹا رات کو جو کھیر بنائی تھی وہ اپنے فیضی انکل کے ہاں بھی دے آؤ ہم دو جی کتنا کھا سکتے ہیں۔“ روزی نے خوشی سے سر اثبات میں بلایا اسے قاسم اور اسری کے گھر جانا پسند تھا سارا بچپن تو یوں ہی گزرا تھا کبھی وہ اس کے گھر میں ہوتے تو کبھی یہ ان کے گھر میں ابا کو چٹنی پکڑا کر ٹھنڈی کھیر کا کچ کی پلیٹ میں ڈالی ڈوپٹہ سر پر لٹکایا اور یہ جاوہ جا۔ تیز ہواؤں سے نہ تو ڈوپٹہ سر پر رہا اور نہ ہی قمیص قابو میں آ رہی تھی چوک کے داہنی طرف قبرستان سے گزرتے ہوئے آواز آئی۔

”ارے سنو لڑکی سنتی جاؤ۔“ روزی نے مڑ کر دیکھا تو سبز اور لال رنگ کا چولا پہنے لکڑی سی داڑھی والے باباجی بیٹھے ہوئے تھے ان کی آنکھیں روزی کو لگا کے یہ آنکھیں اس نے کہیں دیکھ رکھی ہیں وہ ان آنکھوں کو دیکھ کر دل میں آئے جذبات کو بیان نہیں کر پائی اس کے اپنے جذبات اس کے لیے سوالیہ نشان تھے کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر وہ ٹھہر گئی

میٹھی چیز کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں میٹھا کھیں کو یوں بلاتا ہے جیسے ان کا منظر ہو کھیاں بھی ساری ایک جیسی نہیں ہوتی کوئی شہد کی مکھی ہے تو کوئی گندی مکھی شہد کی کھیاں میٹھا چوس کر اسے شہد میں بدل دیتی ہیں لیکن گندی کھیاں اپنے پنکھ بھاڑ کر صاف چیز کو بھی گندا کر دیتی ہیں کچھ گند کبھی صاف نہیں ہوتے نہ وقت کی دھول انہیں لوگوں کی نظروں سے دور کر سکتی ہے اور نہ ہی نئے نویلے جذبات کا دھواں اس گندگی کو دھندلا سکتا ہے میٹھی چیز کو ڈھانپ کر رکھتے

ہیں۔“

ایک پلیٹ نہ ڈھانپنے پر اتنا بڑا لپکھر روزی نے اپنے سر کو جھٹکا اور ادب نہ کہتی آگے بڑھ گئی۔

ایک گلی کے فاصلے پر فیضی انکل کا گھر تھا دروازہ بھیڑا ہوا تھا اس نے ہاتھ سے دھکیلا تو سامنے قاسم اور اسری بیٹھے ہوئے نظر آئے

”اسلام علیکم اسری کی بیٹی تم کام میں گمن ہو اور دیکھو میں اس خالم موسم میں تم لوگوں کے لیے کھیر لاتی ہوں اپنے گھر پکڑے بنائے تھے وہ بھی نہیں کھائے چلو اب مجھے پکڑے بنا کر لا دو۔“ روزی ایک ہی سانس میں بولے جا رہی تھی ساتھ ہی اس نے پلیٹ رکھی اور اپنی قمیص کا دامن پکڑ کر درست کیا اور ہاتھ اسری کی طرف بڑھایا اس کا بڑھا ہوا ہاتھ قاسم نے پکڑ لیا اسری کی روزی کی طرف پشت تھی اور سامنے صفحات کا ڈھیر لگاے بیٹھی تھی روزی کو لگا اتنی لمبی تقریر سن کر اسری مڑی جائے گی لیکن اس نے وہیں منہ کیسے کہا

”رک جاو روزی بیگم میں سخت چٹنی ہوئی ہوں میرے بیا لوجی کے سارے فوس اوپر نیچے ہو گئے ہیں۔“

اب حال یہ تھا کہ قاسم روزی کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اور روزی منگ کھڑی تھی بچپن میں کھیلتے ہوئے کتنی ہی دفعہ روزی نے قاسم کے کندھے اور پشت پر ہاتھ رکھا اس کے بالوں کو خراب کیا اس کی ٹانگوں کو کھینچا مگر لڑکپن میں داخل ہوتے ہی ایک غیر محسوس سا حجاب ان دونوں کے درمیان آ گیا تھا آج کیا ہوا تھا؟ ایک تو آسمان پر کالی گھٹائیں تیز تیز دھڑکتا دل ہاتھوں میں قاسم کے ہاتھ کا جاگتا لمس روزی نے ہاتھ چمڑانے کی کوشش کی مگر قاسم کی گرفت اس سے کئی گنا زیادہ مضبوط تھی قاسم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور مسکراہٹ میں شرارت روزی کا دماغ گرم کر رہی تھی نہ وہ منہ سے کچھ بول سکتی تھی اور نہ ہاتھ چمڑا سکتی تھی شرم بھی آ رہی تھی پلکیں اٹھائی نہ جاسکتی تھیں۔

حیدر نے حیرت سے پروفیسر ابرار کو دیکھا کہ شاید مذاق کر رہے ہیں لیکن ان کے چہرے کی سنجیدگی حیدر کی حواس بانگلی کا مذاق اڑا رہی تھی چارونا چار حیدر اٹھا اور سر سے پوچھا۔

”سر لیکچر دینا ہے یا پھر سوالات بھی کرنے ہیں؟“
حیدر جتنا سمجھا سکتا تھا اس نے سمجھایا بورڈ پر کلیات لکھتے کلاس میں چلتے پھرتے وہ بار بار اپنی سیٹ کو ہاتھ لگا رہا تھا بچپن سے عادت تھی اونچا چوڑا بخیہ سال لڑکا جس کی گہری آنکھوں میں ہزاروں سوال تھے چپ ہوتا تو معمر سا لگتا اور ہنسنے لگتا تو مکمل کتاب لیکن وہ ہنستا کہاں تھا وہ تو صرف مسکراتا تھا اس وہ بھی کبھی کبھی۔

حیدر جب واپس اپنی کرسی پر آکر بیٹھا تو سر ابرار نے اس کی تعریف کی اب سرنے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔
ہاں بھی لڑکیوں میں سے کون اٹھے گا لیکچر دینے کے لیے؟ اس سب لڑکیاں خاموش بیٹھی تھیں جیسے گوٹے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہوں سب؟

چلو شام باش آ جاؤ لیکچر دو۔“ ہر لڑکی کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے بستے کے اندر گھس جائے سر تقریباً گھٹنوں میں دیئے ہوئے تھے۔

”ہاں جی کسی میں ہمت نہیں ہے بیٹا گر بچو نہ کہاں بیٹھ کر کیا ہے؟ کسی کا ج کے پیچھے پنے بچ کر تو نہیں کیا۔ لڑکوں میں ہمتی کی آوازیں جبکہ بنا رہی تھیں بالآخر ماہ روز نے ہاتھ کھڑا کیا۔
”سر میں آؤں۔“

”جی بیٹا جاؤ۔“ وہ اپنے ڈوٹے کو سنبھالے بورڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کا انداز اور لہجہ پر اعتماد تھا اس نے لیکچر دیتے ہوئے اچانک مرتضیٰ زیدی سے سوال کر دیا۔
مرتضیٰ زیدی ڈمگایا اسے سوال کی امید نہیں تھی اس نے یک حرفی جواب دیا۔
”نہیں۔“

روزی نے اب التجا بھری نگاہیں قاسم کی پر شوق نگاہوں سے چار کیس تو اسے اپنا ہاتھ آزاد ہوتا محسوس ہوا کتنے لمبے اس ایک لمبے میں قید تھے کتنا عظام رویوں میں جوش مار رہا تھا یہ کیا محرق تھا کہ جس کے فوسں سے زمین و آسمان یکجا محسوس ہوئے تھے روزی نے دھڑکتے دل کو سنبھالا کرے سے فیضی انکل نکلے نظر آئے اس نے بڑھ کر اپنا سر انکل کے آگے کیا اور دعائیں سمیٹتی پیچھے ہوئی دمیسی آواز میں بولی۔

”موسم بگڑ رہا ہے اگر ابھی جھڑی لگ گئی تو پھر کے گی نہیں میں یہیں پھنسی رہ جاؤں گی۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھی اسری نے نوٹس سے سر اٹھا کر باقاعدہ اسے دیکھا

”کیا ہوا ہے۔“ روزی میں بعد میں کر لوں گی نوٹس کی ترتیب تم کو تو سہی۔ لیکن فیضی انکل کا روکنا بھی ان کے منہ میں رہ گیا اور روزی دروازہ بچتا چھوڑ گئی قاسم کو شدت سے احساس ہوا کہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے بہت غلط۔

پروفیسر ابرار کا پڑھانے کا انداز بہت مختلف تھا محال ہے کوئی کلاس میں سو جائے یا اڈکھ لے وہ پوری کلاس میں گھومتے پھرتے پڑھاتے وقت لہجے کے اتار چڑھاؤ تو الگ بچوں کے بل اونچے بھی ہوتے اور ہاتھوں بازوں کو یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں گھماتے پھراتے لگتا کہ ان کے جسم میں فزکس بھری ہوئی ہے جسے ہر صورت سامنے بیٹھے ہوئے طالب علموں کے دماغوں میں ڈالنا مقصود ہے۔

ان کی کلاس میں اسٹوڈنٹس کو بٹھانے کی ترتیب بھی الگ ہوتی لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے عین سامنے بیٹھے ہوتے کیوں کے رفاه یونیورسٹی میں غیر ضروری لڑکے لڑکیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت ہے لہذا سب کو یوں بیٹھنا بھی خاصا عجیب اور دلچسپ لگتا آج پروفیسر صاحب کے مزاج کچھ اور ہی کہانی سنار ہے تھے

”حیدر درانی آج پرانا لیکچر کلاس میل دہرائیں گے۔“

گرمی جب برہم ہوتے ہیں تو میں خود کو سنبھال نہیں پاتا
تمہاری آنکھیں خالی محسوس ہونے لگتی ہیں اور مجھے تمہاری
خالی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔

حیدر کو احساس ہوا اس کا منی سی لڑکی کا اعتماد اچھے
انہوں کے چمکے چمکے چمکے۔



”مدیر باجی ہو گیا ہے تبادلہ خیال اب میں آپ کو
خلاصہ لکھ کر دکھاؤں۔“ روزی نے تو جیسے قاسم کی بات سنی
ہی نہیں مدیر باجی نے خلاصہ لکھنے کی اجازت دی تو وہ قاسم
کے پاس سے اٹھ گئی یہی تو وہ چاہتی تھی فرار۔

اس دن کی شرارت قاسم کو کافی بھاری پڑی تھی وہ
روزی کو بلاتا تو اسے کوئی جواب نہ ملتا مدیر باجی کے گھر
روز شام کو اکٹھے ہوتے لیکن صدیوں کا فاصلہ درمیان میں
سراٹھائے کھڑا نظر آتا روزی کو عجیب سی کیفیات نے گھیر
لیا خود سے چھپنا اور قاسم سے چھپنا دونوں ہی ناممکنات
لگتے لیکن وہ اپنی حدود کا تعین کر چکی تھی مدیر باجی کے
سامنے نازل رہتی لیکن دیے برف کی طرح ٹھنڈی

چمچوں نے اپنے پر پھیلانے اور نیلگوں خاک پر
چھپاتے اپنے گھروں کی راہ ہوئے شام کے سائے
گہرے ہونے لگے تو مدیر باجی کے گھر سے چھوٹی
جماعتوں والے بچوں نے اپنے بستے سنبھالے اور اپنے
گھروں کی راہ پر ہوئے مدیر باجی کا صحن آدھا کچا تھا اور
آدھا کچا محلے کے بیشتر گھریلے ہی تھے دیوار کے ساتھ
کیاریاں بنی تھیں جن میں پودے کے پتے ہوا کو مہر کاتے
سرخ اینٹوں والا کچا فرش جس پر قالین بچھا کر سارے
طالب علم چوڑی مار کر بیٹھ جاتے کچے فرش والا صحن کا حصہ تو
جیسے شجر ممنوعہ ہو اس طرف کوئی نا جاتا اور اگر جاتا بھی تو
پاؤں کو قالین پر رگڑ کر کیوں کے سفائی کے معاملے میں خطی
باجی کسی کا لحاظ نہ کرتی

”روزی بات سنو۔“ قاسم نے اسے پکارا جب مدیر
باجی نے ان دونوں کو نظم کی جزئیات پر تبادلہ خیال کرنے کو
کہا۔

”ہم۔“ روزی نے ہلکی سی آواز نکالی

”تمہیں اللہ کا واسطہ ہے ناراض نہ ہو مجھ سے پہلے کی
طرح بات کرو۔“ قاسم کے لفظوں میں التجا بولی۔

”کیا بات کروں۔“ روزی نے یوں پوچھا جیسے اس
سے پہلے وہ بہت سوچ سمجھ کر بات کرتے رہے ہوں کہ کیا
بات کرنی ہے ان کی باتیں تو لائینی ہوتی تھیں بچپن کے
ساتھی بچوں کی سی باتیں۔

تم دونوں جب تک سبق دہراتے ہو میں حسام کو
سامنے والے ڈاکٹر شاہد کو دکھاؤں دانت نکال رہا ہے اور
ساری رات سوئے نہیں دیتا مدیر باجی گھرانے کے حوالے
کر کے چادر لپیٹے حسام کو اٹھائے باہر نکل گئی ان کے بڑے
بیٹے عبداللہ اور عبید صحن میں کھیل رہے تھے دونوں بالترتیب
پانچویں اور تیسری جماعت کے طالب علم تھے۔

”کچھ بھی بولو جو دل کرتا ہے کہو لیکن مجھے چپ کی مار نہ
مارو میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن تمہاری خاموشی
مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔“ قاسم نے پھر اس کی گھنٹی غم
دار پلکوں کو دیکھتے ہوئے کہا اس روزی بہت حسین نہیں تھی
لیکن اس کے چہرے پر جذباتیت اور ملاحیت کا ایسا امتزاج
تھا کہ دیکھنے والوں کو اسے کچھ دیر دیکھنے کا دل کیا کرتا

دھم دھم کی آواز پر روزی نے سراٹھا کر سامنے قاسم کی
طرف دیکھا وہ قالین پر کونے میں بیٹھا اینٹوں پر زور زور
سے اپنا ہاتھ مار رہا تھا روزی نے نیچے دیکھا واہ تیر ہو گئی اس
نے پھر سراٹھایا قاسم کی آنکھوں میں ضبط تھا اور ہاتھ میں
جلال

”میری آواز نہیں آرہی تمہیں بول تو رہی ہوں اب
مزید کیسے بولوں؟“ روزی کے لہجے میں درشتی تھی۔

”ایسے مت کرو میری اچھی روزی مجھے جو مرضی سزا
دے دو میں آئندہ ایسا مذاق نہیں کروں گا تمہارے مزاج

”پاکل تو نہیں ہو گئے ہو۔“ قاسم نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں قاسم دماغ تو نہیں خراب تمہارا اینٹوں پر لگ کر قاسم کی سفید پتیلی سرخ ہو چکی تھی۔ اب روزی اس کے پاس اٹھ کر آگئی کھردری اینٹوں سے ہاتھ زخمی بھی ہو سکتا تھا درد کا احساس روزی کو اپنی ہتیلیوں میں محسوس ہونے لگا

”نہیں کر۔“ روزی نے پھر کہا لیکن قاسم کو اثر کہاں تھا وہ صم بکرم کی تعمیر بنا ہوا تھا اس لامحالہ روزی نے اپنا ہاتھ قاسم کے ہاتھ پر رکھ دیا آواز بند ہو گئی۔

کچھ چیزوں کو ختم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور شروع کرنا بہت آسان جس راتے پر روزی کے قدم پڑ رہے تھے وہ آنے والے کو اس طرح گود میں اٹھا لیتا ہے کہ پرندوں کے پردوں کی طرح ہلکا ہلکا ہو کر چلتا ہی جاتا ہے عمریں گزر جائیں تو ہوتا چلتا ہے کہ کتنا بوجھ کندھوں پر آن دھرا ہے کبھی نہ اترنے والا ہڈیوں کو ٹھنڈا کر دیئے والا بوجھ۔



گہری گہری آنکھوں والی
الجھی الجھی پاکل لڑکی
تو یہ کیسی دھن میں آخر، لمبی لمبی پلکوں اوپر
موٹے موٹے آنسو لے کر
سندر کو لمبیروں نیچے چلتی جلتی دھرتی دے کر
قریہ قریہ بھاگ رہی ہے
کس کی خاطر جاگ رہی ہے.....؟
تجھ کو یہ معلوم نہیں کیا تجھ جیسی نا جانے کتنی گہری گہری آنکھوں والی

کیسی کیسی سندر تار کے ڈھیر خزانے لے کر نکلتی
لیکن پھر بھی اس رستے سے منزل تک پہنچانے والا
ہر اک ساتھی جھوٹا نکلا

اک اک آشنا..... دشمن نکلی
اک اک پندار دھوکہ نکلا

سچا ہر اک خدشہ نکلا
دیکھو تم بھی جانے دو اب
نادانی کا جتنا رستہ تم نے اب تک طے کر ڈالا
اس رستے سے گھر کی منزل اب بھی اتنی دور نہیں ہے
اب بھی واپس جا سکتی ہو
سب کچھ واپس جا سکتی ہو
اب بھی مگر تم نادانی کے اس رستے سے گھر نہ پلٹی
تو پھر اک دن ایسا ہوگا

سندر آنکھیں سر جائیں گی
پلکیں خوں سے بھر جائیں گی
کول پاؤں پھٹ جائیں گے
جان لیوں پر آجائے گی
تن کے سارے اچلے پن کو گور مسافت کھا جائے گی
اس دن تم پھر چلاؤ گی
لیکن کچھ نہ حاصل ہوگا
سارے لمس کے بھوکے ساتھی

پتھ لگا کر آجائیں گے
تم رستے میں رہ جاؤ گی
رستہ بھی وہ جس کے پیچھے ڈر کی گہری دلدل ہو گی
آگے غم کا جنگل ہوگا
سر پہ گہرا بادل ہوگا
اس دن کے آنے سے پہلے
اس دن تک جانے سے پہلے
وقت طے تو ڈھلنے والے ہر لمحے کی ذات پہ سوچو
دنیا کی باریک نظر سے دنیا کی ہر بات پر سوچو
جذبوں کی اوقات ہی کیا ہے
جذبوں کی اوقات پہ سوچو
وہ دیکھا

پھراک سائے پہ دیرانے میں بجلی کڑکی
گہری گہری آنکھوں والی ابھی ابھی پاگل لڑکی
قاسم اور روزی کے طور اطوار بدلنے لگے زبان سے
کچھ خاص کہا بھی نہیں لیکن شرارت کے پردے تلے چھپے
سندیے ایک دوسرے میں جان بھر دیتے بے پروائی کی
جگہ سلیقے نے لے لی دونوں نظر آنے کی کوشش کرتے روزی
کے ملبوسات میں کھلتے رنگوں کا اضافہ ہونے اور قاسم کے
بے ترتیب بال سنورنے لگے وقت تھا کہ سر کتابی چلا جا رہا
تھا وقت کو بھی کبھی کوئی روک سکا ہے؟ ہونیاں ہو کر رہتی ہیں
کتنا بھی پانی کیوں نہ ڈالو جو درائیں اس کے نصیب میں
ہے وہ ضرور پڑتی ہے۔

نیوشن سے نکلتے ہوئے قاسم نے بند مٹھی سے روزی کو
کچھ تھمایا

گھر جا کر پڑھنا گھر تک کا راستہ لمبا ہی ہو گیا اپنے
نے تپتے جسم کو بھی پگھلا دیا وہ ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتی
جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو گھر میں جا کر سیدھے اپنے
کمرے میں دم لیا جسم سننا رہا تھا استری والے میز پر
کتنا میں رکھی بے چینی اور تجسس نے جذبات کو سوا کر دیا
انگارے ہاتھوں میں جل اٹھے تھے اور ان میں گیلا گلابی
کاغذ آگ اور دریا کا ملنا ایسا ہی ہوتا ہے اس نے ڈرتے
ڈرتے کاغذ کھولا۔

کیا لکھا ہوگا؟ یہ تجسس سب جذبیوں پر حاوی تھا مویٹے
کے پھول کاغذ سے نکل کر اس کی گود میں آگرے ٹھنڈی
ٹھنڈی خوشبو جیسے قطرہ قطرہ اترتے سانسوں میں گھل رہا
ہو۔

روزی

مجھے تم سے محبت ہے وہ جو ایک ہی پہل میں ہو جاتی ہے
روح میں سرایت کر جاتی ہے انسان خود سے بے گانہ ہو جاتا
ہے اور چھوٹی چھوٹی عمر میں بڑے خواب دیکھنے لگتا ہے
محبت جو ایک کا دل بن کر دوسرے کے سینے میں دھڑکتی ہے

سانسوں کو الفت کی خوشبو دیتی ہے خوابوں میں عمر بسر کرتی
ہے جدائی سے بے حد ڈرتی ہے تمہاری کالی آنکھوں سے
جھلکتی ہے تمہارے لمس سے نشوونما پاتی ہے جگر کی راتوں
میں عذاب بن کر ستاتی ہے دور وصل میں احساسِ تنہائی
دلاتی ہے اندھیری راتوں میں چاندنی کر چمکتی ہے وہ جو
میری زندگی ہے اور تمہاری رگوں میں رواں ہے مجھے اس کا
اعتراف کرنا ہے پھولوں کی ٹھنڈی شبنم جیسی دوستی کی
جڑوں میں سانس لیتی ہے چراغِ راہ بن کر راستہ سمجھاتی
تپتے صحرا میں بارش کی طرح ضروری ہوا بن کا ہر خوشبو
چھونے والی تمہارے قدموں کی دھول چومنے والی خولت
میں مبہم مسکراہٹ جلوت میں دنیا بھلانے والی محبت کا
اعتراف کرتا ہوں مجھے تم سے محبت ہے وہ محبت جو دلوں
میں دھڑک رہی ہے۔

تمہارا قاسم



ماہ روز نے بجلتی میں جوس لیا آخری سب لیا اور اسٹرا
جوس کے ڈبے کے اندر ہی گھسیڑا سانسے ٹھیل پر پڑے
نوش فائل میں ڈالے کندھے پر بید پھینکا اور اٹھ کھڑی
ہوئی سانسے دروازے میں آمنہ اور صبا اس کا انتظار کر
رہی تھی کلاس میں پروفیسر سے چھپ چھپ کر کھانا جتنا
مشکل ہے اتنا ہی دلچسپ بھی جب اسے بھوک لگتی تو باولی
سی ہو جاتی راہ چلتوں کی فکر کرتی جماعت کے کورم کی پروانہ
کرتی بھوک ہی تو تمام فسادات کی جڑ ہے اور وہ اپنے ماضی
کے آسیب سے اتنی خوفزدہ تھی کہ مزید فساد پالنے کا
جھنجھٹ نہیں اٹھا سکتی تھی

آ بھی چکو صبا انتظار سے اکتانگی بڑے گھر کی بڑے
نخرے والی بیٹی ماہ روز کی ذرا غنی مگر فی الحال وہ بی پاس
آ کر بیٹھ جاتی جس کو برداشت کرنا مجبوری بن جاتا لیکن وہ
تہیہ کر چکی تھی کم از کم اتنے نخرے کے ساتھ نباہ کرنا کم از کم
اس کے لیے ممکن نہیں۔

”جی بس آگئی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

جہاں لفظوں کی وقت نہ ہو وہاں انہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے کلاس سے نکل کر بیلاک میں راہ داری پر چلتے چلتے ماہ روز کو شدت سے احساس ہوا وہ کسی کی نظر کے حصار میں ہے اف کیا مصیبت ہے وہ جو کوئی تھا اس کی چال کو دیکھ رہا تھا اب اس کی نظر ڈوپٹے پر تھی اور اب چہرے پر ماہ روز نظروں کی گرمی بری طرح محسوس کر رہی تھی وہ شیشائی نظریں اٹھا کر دیکھا تو راہ داری کا اختتام تھا اور سامنے کلاس فیلوز کھڑے تھے مرتضیٰ زیدی اور حیدر رانا مرنقی کا نام اسے اس لیے یاد تھا کیوں کے حاضری میں سب سے پہلے وہی بولا جاتا اور یہ حیدر وہ لڑکا تھا جسے اس دن سر نے لیچر دینے کے لیے بلایا تھا ان دونوں میں سے کوئی ایک ہے اور یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ بلائیں تو سبھی مجھے پھر میں سیدھا کرتی ہوں نظریں جمانا تو دور، اٹھائیں سکیں گے وہ دل ہی دل میں ان کو سنانے کا عزم کر بیٹھی۔

حیدر کو آنکھیں پڑھنا آتی تھیں اور چہرے بھی وہ اتنی دیر سے اسی کو تو دیکھ رہا تھا کہ وہ کیسے قدم قدم چلتی اس کے پاس آ کر رکی تھی جیسے زندگی سانس لینے کو بے تاب ہو اس نے سوچا تھا کہ آج وہ اسائنمنٹ مانگ کر راہ و رسم بڑھانے کی کوشش تو ضرور کرے گا حیدر کی شخصیت میں کوئی طلسم نہیں تھا لبا لبہ متناسب سراپا، سنجیدہ چہرہ، دھیمالہجہ، ہلکی لیوں کو چھوٹی مونچھیں اور تازہ تازہ آنی داڑھی جو اس کی ٹھوڑی پہ اتنی بھلی لگتی کہ اس کی بہنوں کے بچے ماموں ماموں پکارتے سب سے پہلے اسی کو پکڑتے وہ شہزادہ گلفام نہیں تھا مگر اس کا خوبصورت دل اور لیے دیے رہنے والا انداز اس کی آنکھوں میں روشنیاں بھردیتا تھا۔ کچھ تو تھا اس میں جو اس کے ارد گرد کے لوگوں کو اس کا دیوانہ بنا دیتا اس کے دوست ہمیشہ دوست رہتے کیوں کہ اسے بہتے پانی کو راستہ دینے کی عادت تھی لیکن اس وقت اس کے اپنے ہوش اڑے ہوئے تھے تینیس ڈپارٹمنٹ کے شاہد نے آج

”مجھ سے بات کر رہے ہیں آپ؟ میں ہاتھ میں لیے پھرتی ہوں سفیان ہے سی آراو ماہا ہے جی آران سے جا کر مانگ لیں۔ تو بے لڑکی ہے یا ایتھم بم غصے سے پھٹے ہی چلی جاتی ہے بات کر کے رکی بھی نہیں یہ جاوہ جالینی حیدر کو ایک تنبیہ تو مل گئی تھی کہ اس لڑکی سے بات نہیں کرنی لیکن دل بار بار ضد کر رہا تھا کہ اسی لڑکی سے بات کرنی ہے اس نے آج سوچ لیا تھا کہ ماہ روز کو مخاطب کرے گا لیکن راباداری کے اختتام پر جب ماہ روز کی گول گول آنکھیں واضح ہوئیں تو اس نے اندازہ لگایا کہ موسم میں شدید خشکی ہے تینوں لڑکیاں چلتی ہوئی پاس آئیں حیدر ماہ روز کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے لب ہلے۔“

”بات سنیں۔“ ماہ روز نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اب آیا اونٹ پہار کے بچے اس کی نظروں کا زاویہ میں خود درست کرتی ہوں۔

”جی۔“ وہ بولی لیکن یہ کیا حیدر تو صبا کی طرف متوجہ تھا۔

”مجھے پروفیسر فاروقی کی پہلی اسائنمنٹ چاہیے تھی اگر آپ دے سکیں؟“ اب وہ ماہ روز کو نظر انداز کر رہا تھا جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں ماہ روز کو اپنے اندازے کی غلطی پر سبکی محسوس ہوئی تھی وہ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہوئی تھی زندگی میں دوسری دفعہ یہ شدید سبکی تھی ایک دفعہ جب وہ اسکول میں نعت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم پیش کرنے کے بعد نتیجے کے انتظار میں اس نے ایسی ہی تجلّت دکھائی تھی ٹیچر نے کہا تھا سوئم انعام کی حقدار ہیں ماہ روز اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی حالانکہ لمحے کے دسویں حصے میں ٹیچر نے مکمل نام لیا تھا ماہ روز شوکت اسی کی ہم نام ہال

میں کہا تھا۔

”اُس او کے۔“ ماہ روز نے جواب میں فقط یہی کہا اور نظریں اٹھا کر بھی اس کو نہیں دیکھا تھا آج قسمت واقعی حیدر کا ساتھ دے رہی تھی اس کا لب درک مکمل ہوا اور وہ باہر جانے لگا ماہ روز نے آواز دی۔

”حیدر بات سنیں۔“ اگر ممکن ہوتا تو وہ الٹی چھٹا نکلیں لگاتا لیکن.....

”یہ EXPERIMENT کر دیں۔“ اس نے سارے لڑکوں کو چھوڑ کر اسے بلایا آواز میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔ Apparatus صحیح سے کام نہیں کر رہا ہو تو دل کرتا ہے بندہ لب کو آگ ہی لگا دے۔“ وہ اس کے پاس گیا اس کے ساتھ چند اور لڑکیاں بھی کھڑی تھیں اس نے board bread پر تمام کنکشنز چیک کیے ماہ روز کا پی پاس کھڑی تھی حیدر کا سارا اعتماد ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو بھیکتا محسوس کیا اور اس کی ٹانگیں واقعتاً کانپ رہی تھیں ماہ روز اس کے ساتھ bread board پر جھکی ہوئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ بریڈ بورڈ پر جاتے ہوئے ہاتھ دو دفعہ ایک دوسرے سے ٹکرائے ماہ روز سپاٹ تھی اور حیدر میں شور برپا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا بریڈ بورڈ خود کیا چیز ہے جس سرکٹ کو مکمل کرتا ہے وہ کس چیز کا ہے وہ خود کس مٹی کا بنا ہے یہ حیدر کی سمجھ سے باہر تھا اسے بس یہ پتا تھا کہ ایک خوشبو کا جھونکا ہے جو اس کے ساتھ کھڑا ہے جو اس کی زندگی میں شامل ہو گیا تو زندگی مہکا دے گا ماہ روز بمشکل حیدر کے سینے تک آئی تھی چھوٹی سی چیز کتنا برا فائدہ ہو سکتی ہے حیدر نے آج سمجھا تھا کافی دیر وہ ٹانگ ٹوئیاں مارتا رہا اور جب کچھ نہ ہو سکا تو کہہ دیا۔

آپ کا بریڈ بورڈ خراب ہے ماہ روز نے اس کی شکل غور سے دیکھی اسی بریڈ بورڈ پر وہ ہمیشہ EXPERIMENT کرتی تھی پہلے تو کبھی خراب نہیں

میں موجود تمام لوگ اس کی جلد بازی پر ہنسے تھے بعد میں اس کو اول انعام ملا تھا لیکن پھر بھی وہ سبکی دماغ سے محو نہیں ہو سکی تھی اور آج پھر یہ حیدر روانی کا کارنامہ تھا کہ اس نے کھڑے قدموں لڑکھڑایا تھا صابا اور حیدر میں بات ہو چکی تھی اب وہ چلتے چلتے گیٹ تک آ گئی ماہ روز سوچ میں غلطاں تھی کہ آخر یہ ہوا کیا ہے صابا حیدر کے زنگیں لہجے کی تعریف کر رہی تھی اور حیدر وہیں کھڑا تھا جہاں سے ابھی وہ گئی تھی اور جاتے جاتے ساری روشنیاں گل کر گئی تھی۔

محبت کسی ایک شخص میں اتنی طاقت کیسے بھر دیتی ہے کے ساری روشنیاں اس شخص کے ہونے سے ہوتی ہیں اور نہ ہونے سے گل ہو جاتی ہیں دھیرے سے حیدر پہ اعتراف کا الہام ہوا تھا محبت کا اعتراف محبت دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں آ بیٹھی تھی جو ماہ روز کو دکھ کر لو دیتی تھی محبت اس کے ہاتھوں میں آ گئی تھی جو ماہ روز کے سامنے کا پینے لگ جاتے تھے محبت گیٹ تک تھی محبت آسمان تک تھی محبت مکان سے لامکاں تک تھی۔



اگلے دن یونیورسٹی میں صبا نے بیک کھاگلا تو مطلوبہ اسائنمنٹ نہ ملا وہ گھر بھول آئی تھی چار دن تا چار اسے ماہ روز سے رابطہ کرنا پڑا کیوں کہ وہ ہر وقت ایسی چیزیں ساتھ لیے گھومتی تھی ماہ روز نے بھی بڑے آرام سے اپنا اسائنمنٹ اسے سونپ دیا حیدر کے ہاتھ میں جب فائل پہنچی تو دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی وہ بار بار ماہ روز کے نام پر ہاتھ پھیرتا صفحات کو اس نے چھوا ہو گا اس سوال میں کتنی گدگدی تھی کے اس کی ہنسی ہی نہ کتنی تھی سال ایسے لے کر گھومتا کے جیسے اسائنمنٹ نہ ملا ہو خود ماہ روز ہی مل گئی ہو تقدیر نے اس کا ساتھ دیا جس روز اسائنمنٹ واپس کرنے کا ارادہ کیا صبا موجود نہیں تھی لہذا لب میں وہ اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا۔

”یہ آپ کا اسائنمنٹ، شکریہ۔“ حیدر نے دھیمے لہجے

جیج ماری صفحہ کو اس چھپکلی کی وجہ سے پھڑپھڑانا نہیں چاہیے تھا پھر کیوں؟ کیا یہ کوئی اور مخلوق تو نہیں؟ چھپکلی کا رخ روزی کی طرف تھا وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں چھپکلی کی آنکھوں سے آنکھیں ہٹا نہیں پائی چھپکلی میں جنبش ہوئی اس جنبش نے روزی کا دل گویا دھلا کر رکھ دیا موت کا خوف شاید اس سے کم ہو کہیں لاشعور سے آواز آئی چھپکلی نے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں آگے بڑھائی کرخت سی گندی ٹانگیں روزی کا دل چاہا اپنے حلق میں انگلی ڈال کر معدے میں موجود تمام غذا باہر نکال دے ایسی ناگوار کیفیت کہ جیسے چھپکلی نہ ہو کوئی غلاظت ہو یا مٹی ہو یا ایک چھپکلی کے رینگنے کی رفتار بڑھی روزی پلک پھپکے میں سامنے سے ہٹ گئی روزی نے دور کھڑے ہو کر اپنی سانسون کو درست کرنے کی کوشش کی اس نے واپس سے بکھرے صفحات کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی پیر کے تنے کے قریب جانے کی ہمت کہاں سے لاتی پندرہ فٹ لمبے درخت کے پتوں سے کون سی پوندیں رستے لگیں اور روزی کے سفید کپڑے داغدار ہو گئے صرف ابھی چند ہی قطرے گرے تھے کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی وہ مڑی اور سر پٹ دوڑی اور آنے والے کے سینے سے جا لگی سامنے ابا نہ تھے قاسم تھا وہ حیران ہوا اس نے روزی کی لٹ کو اٹھلیوں پر لپیٹا اور کان کے پیچھے ازسا روزی کو ہوش کہاں تھا وہ جامد بھی کاٹو تو ہونے لہو تو وہاں رس رہا تھا۔

”قاسم وہ خون.....!“

”کہاں ہے خون؟“ قاسم کو لگا اس کے کہیں چوٹ لگی ہے وہ تو خوشبو کو سینے میں سینے شاداں کھڑا تھا اس کی شعوری پکڑ کر نہایت پیار سے استفسار کیا روزی کی نگاہیں اپنے کپڑوں پر الجھ سی گئی سفید کپڑے بے داغ تھے مٹی تک کا کوئی داغ نہ تھا خون تو دور کی بات ہے اسے احساس ہوا وہ کسی کی بانہوں کے حصار میں ہے۔

جب گھر کے دروازے کے کواڑ کھلے رہتے نہوں تو

ہوا اٹھیا تو نہیں گیا یہ لڑکا ناچ نہ جانے آگن میڑھا اسکا EXPERIMENT بھی کسی اور نے کیا ہوگا بدھو نہ ہو تو وہ دل ہی دل میں اس پر غصہ کر رہی تھی اور حیدر کو باہر نکل کر خود پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا ماہ روز نے اسے بلایا تھا اس سے بڑی سرشاری کیا ہو سکتی تھی جھومنے کے لیے محبت انسان کو نقص میں مبتلا کر دیتی ہے اور پھر وہ دن رات کی پراوہ کیے بغیر جھومتا رہتا ہے ہی رقص می رقص۔



روزی کے دن رات بدل گئے ہر وقت سنوری رہتی محبت بے سروں کو بھی گنگنا تا سکھا دیتی ہے ابھی وہ صحن کے ایک طرف لگے درختوں کے نیچے بیٹھی تھی اور سامنے صفحات کا ڈھیر لگا ہوا تھا اسری نہ جانے کیسے پڑھتی ہے کتابوں کو صفحہ صفحہ کر دیتی اور پھر کتابوں کو دوبارہ جلد کروانا پڑ جاتا یہ مسئلہ تب تک چلتا رہتا جب تک کتاب پڑھنے کی ضرورت ختم نہ ہو جاتی آج بھی بیالوجی کی کتاب کا جھگڑا وہ روزی کے سر مار گئی روزی کو اسباق کا اندازہ تو نہیں تھا بہر حال وہ صفحہ نمبر دیکھ کر ترتیب دے رہی تھی۔

جامن کے درخت سے ٹپک لگائے اسے یہ کام کرنا اچھا لگ رہا تھا کیوں کہ اس کام کا چرچا قاسم کے سامنے ہونا ہی تھا اور واسم کی خوشی یا اس کی نظروں میں معتبر ہونا زندگی آج کل اسی کا تو نام تھا صفحہ نمبر 127 اٹھانے کے لیے اس نے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ اس پر چھپکلی بنی ہوئی ہے لیکن یہ کیا بالکل ویسی ہی چھپکلی جیسی اس دن دیکھی تھی روزی نے سوچا کہ اس کو پڑھ کر چھپکلیوں کی اس قسم کے بارے میں جانا جا سکتا ہے صفحہ خود ہی پھڑپھڑا کر روزی کے پاؤں کے قریب آن رکھا شاید ہوا کا زور تھا خود بخود روزی کے ہاتھ بڑھے اس نے چھپکلی کی تصویر کو انگلی سے جھوا وہ تصویر نہیں تھی وہ اصلی تھی اپنی کالی کھردری جلد کے ساتھ اپنی نیلی گندی آنکھوں کے ساتھ اس کی اٹھلیاں گندی ہو چکی تھیں روزی کے رونگٹے ہی کھڑے ہو گئے۔ اس نے

پڑ سکے سفیان سے اس کا نمبر لے لیتی ہوں اس نے سی آر کے متعلق سوچا لیکن وہ تو پہنے میں آتا ہی دو دن ہے۔ لڑکے زیادہ ہیپلیٹک ہوتے ہیں اس کے سابقہ تجربات نے اس کو یہی سبق دیا تھا۔

مرتنسی سید کا نمبر لے لیتی ہوں مگر وہ تو کلاس میں سویا رہتا ہے حیدر درانی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا وہ خاصا ایکٹو نظر آتا ہے وہی بہتر رہے گا اس نے فیس بک پر وجہ کے ساتھ میج کیا آگے سے جواب نہ آیا حیدر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی کی سوچ کا قرضہ اس کے نام کا ہے اس نے میج کے نوٹیفکیشن کو نظر انداز کیا تھا یکے بعد دیگرے ٹک ٹک ٹک تین چار میج آئے اس نے میسجور کھولے تو مسکراہٹ آنکھوں تک پھیل گئی۔

ماہ روز حیدر مجھے آپ کا نمبر چاہیے میرا مطلب ہے فون نمبر اکثر کلاس کے نوٹس اور کوڑ کا بروقت پتا نہیں چلتا۔

ماہ روز: حیدر میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی ماہ روز: میں فضول میج نہیں کرتی۔

ماہ روز: اگر آپ ایڑی نہیں ہیں تو ندیں نمبر۔

ماہ روز بچوں سی حرکتیں کر رہی تھی لیکن آج تک اس نے کسی سے نمبر نہیں مانگا تھا بلکہ غلط اس نے آج تک خود کبھی کسی لڑکے سے نمبر نہیں مانگا تھا اور حیدر کا جواب نہ آنے پر لگا کہ پتا نہیں وہ میرے بارے میں کیا غلط صحیح سوچ رہا ہوگا اس لیے فضول کی وضاحتیں دے بیٹھی۔

حیدر: (حیرت والی سائل) میں کسی اور کے بارے میں ایسا سوچ سکتا ہوں لیکن آپ کے بارے میں نہیں کے آپ مجھے فضول میج کریں گی یا تنگ کریں گی نیچے نمبر لکھا ہوا تھا اور آخر میں پھر سائل۔

حیدر کے دل کی کلی کلی تھی ماہ روز نے شکرے کا میج کر کے نمبر سہو کر لیا تھا ہوائیں رخ بدل رہی تھیں کچھ ایسا ہونے جا رہا تھا جو ان دونوں نے نہیں سوچا تھا۔ بندھن اجنبیت سے کب شناسائی کا سفر طے کرتے ہیں پتا ہی نہیں

چلتا حیدر کی قسمت مہربان تھی اور حیدر تازاں۔

گر بیجوشن کے امتحانات ہو گئے تھے اور وقت پر لگا کر اڑ گیا کچھ پر قاسم کو بھی لگ گئے یونیورسٹی میں داخلے کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمت نے بھی اس کا کالراؤنچا کر دیا محلے کی فسیلوں سے باہر نکل کر اسے پتا چلا کہ اس نے اعتراف کرنے میں جلدی کر دی ہے ایسی تھلیاں تو جا بجا نظر آتی ہیں اور بے حد نظر آتی ہیں صرف کسی ایک کے رنگوں سے انگلیاں رنگ لینا ایسا ہی ہے کہ پورا چشمہ نظر آجائے اور بندہ پیاسا لوٹ جائے یہ پچھتاوا اب اس کے رویے میں نظر آتا وہ بھاگتا پھرتا اور روزی کو لگتا اس کی بھاگ دوڑ قسمت کو رام کر لینے کے لیے ہے لیکن وہ کہاں جانتی تھی قسمت تو دور کی بات اس نے اپنے گھر میں بھی ذکر نہیں کیا کیا ایک گلابی صفحے میں اتنی طاقت ہوتی ہے عقل کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں سب اچھا لگنے لگتا ہے ہم دنیا کو دنیا کی نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کب ہمارے اندر کی امیدیں ہماری خوشیوں کے لیے آسیب بن جاتی ہیں ہم انجان رہتے ہیں اور پھر جب من مندر میں گھمات لگائے بیٹھے شکاری زندگی کو لوٹ لیتے ہیں تو بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی طرح ہم بے آواز ہو جاتے ہیں اور انہی دو رنگوں کی طرح ساکن۔

اس چھپن چھپائی میں جب روزی کو احساس ہوا کہ کہیں کچھ غلط ہے تو دیر ہو چکی تھی بہت دیر۔

☆ ☆ ☆

وہ قاسم کے کمرے میں کھڑی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

ہاں قاسم تم مجھ سے بات نہیں کرتے مجھے دیکھتے بھی نہیں وہ میز کی سطح پر انگلیاں پھیرتی رہی قاسم کا میز پرفیوم کی بند بوتلیں بہت سی ملاقاتوں میں قاسم کے ہمراہ رہی تھی وہ اس سادہ لڑکی پرفنس رہی تھی تجھے کیا لگے یہاں سے نہ آنکھوں میں کامل نہ کالوں میں بالی یہ تو نظریں اٹھا کر ان

کو نہیں دیکھتا جو کاجل اور بالی کے ساتھ سر پر صرف ڈوپٹہ رکھنے کا قصور کر لیتی ہیں۔

”تمہاری غلط فہمی ہے۔“

”کیسی غلط فہمی ابابا کے دوست رشتہ لینے آتا چاہ رہے ہیں تمہیں بتایا تھا۔“ روزی کے لہجے میں بے چارگی سکی وہ ہنسا۔

”اب کسی بوڑھے سے شادی کرو گی تم؟“

”نہیں قاسم اپنے بیٹے کے لیے آرہے ہیں۔“ شاید قاسم سمجھا نہیں تھا۔ ”لیکن نہیں وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

روزی کی شادی حس مزاح اڑن چھو ہو چکی تھی

”اچھی بات ہے ناشادی کر لو لڑکیوں کو صحیح وقت پہ اپنے گھر کا ہو جانا چاہیے۔ قاسم نے سرسری لہجے میں کہا۔ موت کیا ہوتی ہے روزی نے اس لمحے جانا اسے سارا کرہ گھومتا محسوس ہوا۔

”مذاق نہیں کرو قاسم میں پھر آؤں گی ابھی تم پریشان لگ رہے ہو وہ ایک جھٹکے میں سارے دروازے بند نہیں کرنا چاہتی تھی قاسم کے لیے سوچ کے درکھول کر آگئی اور وہ دو چٹائی کہاں چاہتا تھا۔

روزی قاسم کے گرد جتنا اپنا دائرہ تنگ کرنے کی کوشش کرتی رہتی اتنا ہی وہ اس کے دائروں کی حدود سے تجاوز کرتا رہا لگتا رہا لیکن زندگی بھی کہاں رکتی ہے اور معمولات زندگی تو ویسے ہی جاری رہتے ہیں ثمنینہ کے ساتھ گرمیوں کے کپڑے لینے دے موتی بازار تک آئی اس کی واحد تنگسار ثمنینہ تھی وہی واپسی کے سفر میں ثمنینہ سمجھانے کے لیے بولی۔

”روزی تم اسے سیس دوا سے جانے دو وہ کہاں تک بھاگے گا اگر اس نے لوٹ کر آتا ہوا تو تمہارے پاس ہی آئے گا۔“

”اوپس دے دوں اور اگر ہمارے درمیان ہی سیس آگئی تو پھر میں کہاں جاؤں گی۔“ روزی کے لہجے میں ڈر بولا۔

”سارے محلے کو بتا ہے تین مہینے پہلے جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو چچا غفور نے بھی اسے گھر سے نکلنے دیکھا تھا اب مجھے اس کے رویے سے ڈر لگ رہا ہے مجھے وہ اتنا دور کھڑا نظر آتا ہے کہ میں اسے چاہ کر بھی نہیں دیکھ سکتی کسی راہ گیر نے اندرا سی اثاء میں کچھ پھینکا سیدھا روزی کے منہ پر گر لگا یہ وزینگ کارڈز تھے اور پھینکنے والا بھی یقیناً راہ گیر نہیں مزدور ہو گا ثمنینہ نے ایک کارڈ ہاتھ میں پکڑا تو دوسرے کو روزی پکڑ کر نا آواز بلند پڑھنے لگی۔

جو سچے من سے مرشد کی آس لگائے گا وہی وہی من کی مراد پائے گا سو فیصد گارنٹی کاروبار میں بندش، سفر میں تا کا، کا، لے اور سفلی علم کے ماہر، ستاروں کو چلانے والے، امتحان میں کامیابی بے وفا کی بے وفائی کوئی بھی مسئلہ مسئلہ نہیں محبوب قدموں میں میاں بیوی کا غلام بن جائے ساس ماں ہو جائے، رشتوں کی رکاوٹ دور ہو، بدلے کی آگ میں جلنے والے خصوصی طور پر رابطہ کریں بابا پیر جھگی والی سرکار اللہ والی مسجد والی گلی پر انا نا پے محلہ۔

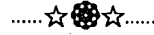
”مجھے لگتا ہے قسمت مجھ پر مہربان ہوئی ہے میری نیت صاف تھی نا اسی لیے مجھے راستہ ملا ہے۔“ روزی خوشی سے بولی۔

”تم پاگل ہو عقل گھاس چرنے لگی ہے؟ پتہ دیکھو یہ قبرستان کے ساتھ والی گلی کسی نے دیکھ لیا تو ظفر انکل کو پتا چل جائے گا پھر آگے کیا ہو گا یہ بھی ذرا سوچ لو تم ثمنینہ کو اس کے خبیلی پن پر غصہ آیا۔

”ہاں ابھی تمہاری اپنی تو منگنی ہوئی ہے تمہارے چچا کا بیٹا تم پر فدا ہے اور تمہیں بھی وہ گفلام کا جانشین لگتا ہے شوخی قسمت گھر والوں نے رشتہ طے کر دیا تم کیا جانو کے جب تک محبت شادی تک کا راستہ طے نہیں کر لیتی تو راتیں کتنی طویل ہو جاتیں ہیں میرا در نہیں سہا تم نے اس لیے میرا علاج بھی تجویز نہ کرو۔“ روزی تنک کر بولی اسے آج کل یوں ہی غصہ آ رہا تھا۔

”ہاں بھی تم نے جیسے بڑا کوئی درد سہہ لیا ہے نا مجھے مت بتاؤ مجھے تو قاسم پر زرا اعتبار نہیں تم ہی باولی ہوئی جا رہی ہو۔“ ثمنینہ نے ناک سے کچی اڑائی۔

قاسم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔ سنا تم نے ایک لفظ بھی نہیں روزی قطیعت سے بولی اب گھر پہنچنے تک خاموشی رہی تھی۔ لیکن یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ثمنینہ روزی کے ساتھ پیر بابا کے ڈیرے پر نہیں جائے گی۔



موبائل واہیرٹ ہوا تھا

حیدر: مجھے سولڈ اسٹیٹ فرکس کے پرانے لیکچر کے نوٹس بھیج دیں۔

ماہ روز چڑی تھی میں نے اس لیے نمبر لیا تھا کہ میں کوئی مدد مانگ سکوں اب اس کی ضرورتیں کون پوری کرے؟

ماہ روز: کیسے بھیج دوں؟ فیس بک پر کوئی اپر آرہا ہے۔ حیدر: آپ کے پاس واٹس ایپ ہے؟ تصویریں بنا کر اس پر کریں اب اگر نہ کیا تو یہ کیا پتا آئندہ مجھے بھی ضرورت میں مدد نہ کرے اس نے تصویریں بنائی اور بھیج دیں۔

حیدر: آپ بہت اچھی ہیں۔

ماہ روز: حیرت والی سائل دماغ ٹھیک ہے آپ کا صرف شکریہ بھی کہہ سکتے تھے حیدر: غصہ نہیں کریں ایک تصویر بھیجوں؟ اپنی دوستوں کو دکھائیے گا

ماہ روز: جس دوست کو دکھانا چاہتے ہیں اسے خود جا کر دکھا دیں اور میری کوئی دوست نہیں ہے اس نے تجسس دبا یا۔

واقعی وہ لڑکیوں کے جھوم سے الگ رہتی تھی۔

حیدر: بھیجنے تو دیں۔

ماہ روز: بھیجیں ماہ روز نے مارے تجسس کے اجازت

دے دی

تصویر میں ایک بندر یا نے خوب سامیک اپ کیا ہوا تھا سرخ لپ اسٹک مسکارنگی آنکھیں ماہ روز مکمل سادہ حلیے میں یونیورسٹی جاتی تھی اس کی ہنسی نکل گئی لیکن ساتھ ہی غصہ آیا کہیں میرے لیے ہی تو نہیں بھیجی اور غصے میں بغیر جواب دیے موبائل رکھ دیا۔

آہستہ آہستہ نوٹس مانگنے سے پہلے سلام دعا ہونے لگ گئی اور آخر میں شکریہ بھیجی کوئی ایک مروت میں آکر کہہ دیتا اس میں شکریہ کی کیا بات ہے اور یہ مروت حیدر کو ہی دکھانا پڑتی تھی ایک دن حیدر کے نمبر سے کچھ سوالات موصول ہوئے۔

حیدر: آپ نے مجھے پہلی بار کب دیکھا۔

میری سب سے اچھی بات

میرا نمبر کس نام سے محفوظ ہے

آپ کا پسندیدہ رنگ

دوستوں میں سب سے قریب کون ہے

ماہ روز کے پیروں کو لگی اور سر کو بھیجی یہ لڑکا خود کو سمجھتا کیا ہے۔

ماہ روز یہ سوالنامہ آپ نے اپنے پورے ہوش و حواس میں مجھے بھیجا ہے؟

حیدر آپ کو موصول ہوا ہے تو آپ کو ہی بھیجا ہوگا

ماہ روز میری آپ سے ایسی کوئی انسیت نہیں کے آپ مجھ سے فضول قسم کے سوال کریں آئندہ نتیجہ مت کریے گا میرے نمبر پر

حیدر ارے مس آپ غلط سمجھ رہی ہیں میں اپنی سب کنٹیکٹ لسٹ کو فارورڈ کرتا ہوں

ماہ روز مر حیدر میں سب میں شامل نہیں ہوتی

حیدر ہنسا تھا ماہ روز کو کیسے پتا چلا کہ وہ سب میں شامل نہیں ہوتی وہ بذات خود سب ہے

حیدر: آپ میری بات پر توجہ فرمائیں

ماہ روز: آپ کو جو کہا ہے وہ کریں اب مجھے صبح نہیں آنا چاہیے آپ کا۔

حیدر کو محسوس ہوا وہ تین دن میں واپس پہلے دن پر چلا گیا ہے جب کچھ بھی شروع نہیں ہوا تھا خود سے صبح کرنے کی ہمت کہاں سے لاتا موبائل کو دیکھتا ماہ روز کے نمبر پر انگلیاں پھیرتا عجب عادت تھی چیزوں کو محسوس کرنے کی۔ ماہ روز کو لگا تھا کہ حیدر کوئی ضد دکھائے گا بات کرنے کی کوشش کرے گا تین دن خاموشی سے گزر گئے وہ جھکی تھی یہ لڑکا عام نہیں تھا اس نے دوبارہ اپنے اور اس کے پیغامات پڑھے لگا کہ زیادتی کر گئی ہے یہاں بچ اسکرین پر انگوٹھے نے حرکت کی وہاں حیدر کو پیغام موصول ہوا۔

ماہ روز کم کے میلے میں تو ملے نہیں مجھے ظاہر ہے پہلی دفعہ یونیورسٹی میں ہی دیکھا تھا۔ مجھے نوٹس بھیج دیتے ہیں۔

حیدر یونیورسٹی کے نام سے؟
آپ نے کیا کرتا ہے جان کر؟ آسانی رنگ نیلا وسعتوں والا کوئی نہیں

آخر میں سوری بھی لکھا تھا حیدر نے تین دن بعد دوبارہ سکھ کا سانس لیا تھا



وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلے جا رہی تھی کہیں سے مٹھی بھر ریت اس کے پاؤں میں آن گری اس نے ارد گرد دیکھا تو وہی بوڑھا بابا برآمد کے بیڑ سے ٹپک لگاے قبرستان میں کھڑا تھا روزی کے دل میں چور تھا اسے پتا تھا کہ وہ ظفر صاحب کو بتائے بغیر یہ کام کر رہی ہے اس لیے ڈو پٹے کو بھی صبح سے اوڑھ رکھا تھا۔

کوئی میرے حصار میں ہے کوئی تیرے حصار میں ہے اور کوئی حصار کے حصار میں ہے ان حصاروں سے کون باہر ہے؟ جو نظر میں ہے وہ ہی نہیں اور جو ہے ہی

نہیں وہ نظر میں ہے سارا دھوکا تو نظروں کا ہے سارا آسیب ستاروں کا ہے ان ستاروں سے قسمت بدلتی ہے اور وہاں سے خبریں آتی ہیں تیری میری خبریں میں تیری خبروں میں ہوں تو میری خبروں میں ہے تو میرے حصار میں ہے میں حصار کے حصار میں ہوں وہ بابا بڑا ہوا تھا لیکن اس کی آنکھیں جامد تھی نیالی آنکھیں ٹھہری ہوئی آنکھیں روزی نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا اور خود کو کوسایہ میں کیوں اس پاگل کی باتوں میں آ جاتی ہوں اور یہاں سننے لگ جاتی ہوں لن ترانیاں اس نے دھیان منزل کی طرف کیا اور اللہ والی مسجد والی گلی کی طرف قدم بڑھا دیئے کالے رنگ کے دروازے پر سبز اور لال رنگ کا پھنسا پردہ لگا دیکھا چوکھٹ پر ہزاروں کیلیں لگی ہوئی تھیں اور کیلیوں پر ڈھیروں دھاگے تھے ہر دھاگے پر سات گرہیں تھی وہ اندر داخل ہوئی دروازے کی چڑھاہٹ میں عجب سا اسرار تھا اندر اندھیرا تھا لیکن کمرے کے چاروں کونوں میں پانچ پانچ موم بتیاں روشن تھیں اس لیے کمرے میں موجود نفوس دیکھے جاسکتے تھے ایک کونے میں کالے رنگ کے کپڑوں میں بابا جی بیٹھے تھے اور سامنے کٹورے میں پانی پڑا تھا ایک پلیٹ میں ہری مرچیں تھیں تین مرغیاں ان کے بائیں جانب ایسی خاموشی سے بیٹھی تھیں کہ لگتا تھا کبھی نہ بولی ہیں اور نہ بولیں گی کمرے کے دائیں طرف دو عورتیں تھی جو اپنی بوسیدہ چادروں میں اپنا اعتقاد چھپائے بیٹھی تھیں بائیں طرف مور کے پنکھ سامنے پھیلا کر ایک مفلوک الحال شخص بیٹھا تھا جس کی لکڑی داڑھی دونوں سے دھلی بھی نہ تھی۔

”ادھر بیٹھ جا۔“ ایک عورت نے روزی کی گھومتی آنکھوں سے تنگ آ کر اسے دعوت دی وہ وہیں دبک گئی۔

”جب بابا سائیں آنکھیں کھولیں تو ان کے پاس جاکر بیٹھ جانا وہ تمہارے دانے گھسنے پر پیر رکھ کر جو سوال پوچھیں جواب دینا ساری مشکلیں حل۔“ اس عورت نے اس کے

نہیں جو تیری مرضی اگر تو چاہے تو ایسا کروں گا ورنہ نہیں تو چاہے تو میں تجھے ابھی یہ مسئلہ حل کر دوں گا ورنہ نہیں۔ بابا جی نے آنکھیں روزی کے شفاف چہرے پر گاڑی ہوئی تھیں روزی کی جان نکلی حصار کی گردان سن کر اس کا سانس خشک ہو چلا۔

”آپ ابھی کر دیں۔“ روزی نے جان چھڑانا چاہی وہ دوبارہ کیسے آتی۔

”بچہ کام تو مشکل نہیں ہے مجھے لالچ نہیں ہے کوئی بڑی بڑی گاڑیوں والے میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں یہ مرغیاں بھی تین موجود ہیں لیکن کام تیرا ہے تو پیسہ بھی تیرا لگنا چاہیے اس طرح کام میں زیادہ برکت ہوتی ہے کام جلدی ہوتا ہے۔“

بابا جی کی بات سن کر اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا کانوں میں ماں کی آخری نشانی سونے کی بالیاں جھجک جھجک کر رہی تھی ہاتھ جب بابا جی کے سامنے گیا تو بالیاں ہتھیلی پر تھیں۔

”تو شاد رہے گی اس درمیان میں بیٹھ جا۔“ بابا جی کے حکم پر روزی کمرے کے پچوں بیچ آ کر بیٹھ گئی مور کے پنکھ والا بوڑھا اٹھا اور کمرے کے کونوں سے موم بتیاں اٹھا کر روزی کے چار سو سجادی بابا جی اب منہ ہی منہ میں کچھ بڑا بڑا رہے تھے مرغیاں ان کے پاس سے انھی جیسے کھ پتلیاں ہوں اور روزی کے گرد چکر لگانے لگ گئیں۔

”مور کھ آنکھیں بند کر لے۔“ بابا جی نے جلال میں روزی کو کہا روزی حکم کی غلام تھی آنکھیں موند لی اسے یوں لگا کہ تیز ہوائیں چلنے لگ گئی ہیں پانی کی چھنٹیں اس کے منہ پر پڑی اور ہاتھوں پر اور پاؤں پر اسے محسوس ہو رہا تھا وہ کسی جمولے میں بیٹھی ہے اور جموتی جا رہی ہے مگھسا سا اندھیرا بند آنکھوں سے نظر آ رہا تھا اور بابا جی کی بو بڑا ہٹ بھی سنائی دے رہی تھی اس کے ہاتھوں کے پاس سے جیسے موتیوں کی لڑی گزری ہو اور ساتھ ہی کسی گرم چیز نے اس

سامنے حجرے کے آداب کی وضاحت کی بابا جی نے جب آنکھیں کھولی تو روزی ڈر گئی ان کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے مرچیں بھری ہوں انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا اور روزی ان کے پاس آگئی چوڑی مار کر ان کے دائیں جانب بیٹھی بابا جی نے بد وضع پاؤں اٹھایا اور اس کے گھٹنے پر رکھ دیا بوجھ سے روزی کا گھٹنا دب ہی گیا لیکن وہ کچھ کہہ بھی نہیں پائی۔

”بول کیا نام ہے اس کا۔“

اس کا نام قاسم ہے پہلے میرے نام کی مالا چٹا تھا اور اب دیکھنے کا بھی روادار نہیں مجھے اس سے شادی کرنی ہے۔“ وہ گھٹکیائی۔

محبت انسان کی عزت نفس کو روند کر رکھ دیتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی کب تھا کہ وہ کبھی ایسے کسی کے سامنے بیٹھ کر نامحرم کی محبت کی بھیک مانگ رہی ہوگی محبت کتنا اندھا کر دیتی ہے نامحرم تو یہ بابا جی بھی تھے اور ان کے ماننے والے بغیر دھلی داڑھی والے آدمی بھی جن کا وضو نہیں اور وضو نہیں تو نماز کیسے؟ اور نماز نہیں تو کیا پیری کیا مریدی؟ کیا دعا کیا وظیفہ کیا بد دعا لیکن وہ ایسی نظروں سے بابا جی کی طرف دیکھ رہی تھی کے وہ سارے دکھوں کو دور کرنے والے ہیں حالانکہ ہر غم کا علاج اللہ کے پاس ہے کسی انسان کی کیا مجال لیکن ایک انسان دوسرے انسان کو سب سے اچھا تھو دعا کا ہی دے سکتا ہے کیا پتا ان کی دعا ہی لگ جائے وہ اپنے حیلے بہانے خود کو دے رہی تھی۔

ستاروں پر خبریں ہیں خبریں میرے شہر آتی ہیں ان خبروں پر لکھا ہے کہ تیرے قاسم پر حصار ہے لیکن قاسم تیرا ہے تیرا ہی رہے گا بس اس حصار کو ختم کرنا ہو گا زعفران سے تیرے گرد حصار بنانا پڑے گا تاکہ اس کیلے کی نظروں یہ بندگی پٹی کو اتارا جاسکے اور وہ تیرے روپ سے اپنی آنکھیں سینک سکے تین مرغیاں حلال ہوں گی اور چاندنی کے ورق چڑھانا پڑیں گے لیکن اس میں کوئی زور زبردستی

کے پیر کو چھوڑا تھا۔

”چنتا بے شک لیکن آنکھیں مت کھولنا۔“ یہ ہدایت بھی ملی وہ بے چاری چیخ بھی نہ کی آدھے گھنٹے بعد اس کے چہرے پر کچھ پھیکا گیا پانی جیسا۔

آنکھیں کھول لڑکی تو منتظر تھی آنکھیں کھولی تو مرغیاں مری پڑی تھیں موم بتیاں ارد گرد ساری کی ساری پکھل چکی تھیں جادوئی آدھ گھنٹہ اختتام کو پہنچا تھا۔

پورے چاند کی رات تک جامن کے درخت تلے ایک ہی وقت اور ایک ہی حالت کو مقرر کر کے یہ آیت الہی پڑھنا قاسم تیرے قدموں میں آکر بیٹھ جائے گا تب تک کچھ چین کا سانس نہیں لے گا جب تک اس کو تو نہیں مل جاتی باباجی نے اپنی عیار آنکھیں بند کرتے ہوئے ہلکی آواز میں کہا جیسے اس عمل نے انہیں تھکا دیا ہوا تھا میں ایک کاغذ تھا جو روزی نے تمام لیا وہ بمشکل انہی بازوؤں پر گہرا کالا نشان اور تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر تھے بہت مشکل سے اپنا وزن اٹھائے وہ گھر آئی اور بستر پر ڈھے گئی بالیاں گئی تو کیا ہوا میری محبت تو مجھے مل جائے گی پاؤں پہ نشان پڑا تو کیا ہوا وقت اس کو مٹا دے گا وہ خود کو تسلیاں دے رہی تھی ہر چیز دھندلی ہو جاتی ہے مگر کرنی ہمیشہ ساتھ رہتی ہے کہیں نا کہیں چھپ کر آپ کو دیکھتی رہتی ہے اور پھر حملہ کر دیتی ہے جب آپ کو احساس ہوتا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا عمل کتنی زیادہ تکلیف اور کتنے زیادہ غیازے کا باعث بن سکتا ہے۔

.....☆❁☆.....

آئے روز کے سیاسی دھروں سے ٹریفک کا بند رہنا عوام کو کوفت میں جٹا کر رہا تھا خاص طور پر ایونٹک پروگرام میں ایم سی ایس کرنے والی بیجاں خاصی مشکلات کا شکار ہوتی ہیں ماہ روز کا گھر یونیورسٹی سے کافی فاصلے پر تھا اس لیے اس نے پرائیویٹ کنویں کو ہار کیا ہوا تھا بس میں جاتے جاتے رات کے بارہ بج جاتے اور یونیورسٹی کی

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرہ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیل یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے نتیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7 فرید جمیروز عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

بیس بھی باقاعدگی سے نہیں چلتی تھیں آج انتہائی تھکاوٹ والا دن تھا کلاس لے کر باہر نکلے تو چوکیدار نے گیٹ پر بتایا کہ گولڑہ موڑ پر بری طرح ٹریفک جام ہے ماہ روز نے ڈرائیور کو کال کی وہ ابھی آئی ہے پی موڑ پر تھا اور وہیں پھنسا ہوا تھا آہستہ آہستہ یونیورسٹی خالی ہونے لگی لڑکوں نے بانیک کو کلک ماری اور چار چار ایک پر سوار ہو کر یہ جاوہ جا لڑکیوں نے بھی قریبی ساتھیوں کو لے لیا جن کو باپ بھائی موٹر سائیکل پر لینے آتے وہ دروازے پر پہنچ چکے تھے باقی وہیں پر بیٹانی سے ٹہل رہی تھیں اب صرف پانچ لڑکیاں منتظر تھیں جن میں سے ایک ماہ روز بھی ماہ روز کو پیاس کا احساس ہوا گھڑی دیکھی 8:30 پر کلاس ختم ہوئی تھی اور اب 10:30 بج رہے تھے سردیوں کی خشک راتیں لیکن خالی معدہ پیاسا بن کر کچھ نہ کچھ چاہیے پانی ہی کیوں نہ ہو اپنے اندر وہ اٹھی اور کہنے کی طرف جانے لگی دو بلاک کراس کیے نگاہیں نیچی تھیں فرش پر چھوٹا سا کرشل کے دو موتیوں کی طرح چمکتا نظر آیا موبائل کی نارنج آن کی یہ چھپکی تھی چمکتی چالاک آنکھوں والی ماہ روز کا پیر بری طرح رہنا چھپکی پر گرنے کا خیال ماضی کی تلخ یادوں کو تازہ کر گیا ماہ روز نے خوف کی شدت سے آنکھیں میچ لی ساتھ ہی کسی نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام یا مضبوط ہاتھ تھے وہ مقابل کے سینے سے ٹکرائی ماہ روز کا بس نہیں چلا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے اسے کمپوز ڈرنے کی عادت تھی یہاں وہاں ڈولنا اس کی سرشت میں شامل کہاں تھا اس کے پاؤں کے انگوٹھے تا حال زمین پر نہیں تھے کیوں کہ چھپکی کا خوف ہر حال پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔

ٹھیک ہیں یہ لہجہ سنا تھا حیدر نے اسے اپنے سینے سے ذرا فاصلے پر رکھا وہ چاہتا تو فریگی لطف اندوز ہو سکتا تھا لیکن ماہ روز دیکھے جانے کے لیے تھی چھوٹے کے لیے نہیں حیدر کو جواب نہ ملا اس کے ہاتھوں میں موجود ذات اب اپنے جسم پر اپنا قابو کھو چکی تھی حیدر نے بازو سے تھام

کر وہیں زمین پر بیٹھا دیا بیک کھولا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکالی۔

پانی مت پھینکیے گا خٹنڈ ہے یعنی وہ ہوش میں تھی حیدر کو ہنسی آئی یہ لڑکی سردیوں میں ایسے ہی پیک ہو کر آتی تھی کہ معلوم ہوتا گھر میں موجود سب چیزیں خود پر پلیٹ آئی۔

آپ چھپکی سے ڈرتی ہیں؟“ حیدر نے اسے ڈرتے دیکھ لیا تھا۔

آپ کو میرا انٹرویو لینے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ ماہ روز نے رکھائی سے کہا وہ ابھی بھی ڈھیلی تھی

آپ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتی؟ حیدر شرارت کرنے لگا۔

”مجھ سے سوال کیوں پوچھتے ہیں۔“ ماہ روز نے منہ پھیر کر کہا۔

گاڑو جلتے جلتے وہاں آیا تو حیدر کو وقت کا احساس ہوا۔

”آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئی؟“

”وہ ڈرائیور ابھی تک آیا نہیں۔“ ماہ روز کو جواب دینا پڑا حیدر کھڑا رہا ماہ روز نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ساری ہمت ختم ہو چکی تھی۔

”آپ برا مت منائیں تو میں آپ کو گھر چھوڑ دوں؟“

گولڑہ موڑ آئی ہے پی سے لیکر مورگاہ تک سبھی راستے بند ہیں۔“ حیدر نے ڈرتے ڈرتے آخر کی ماہ روز نے آستین چھوڑ کر جواب دیا۔

”پھر کیا آپ مجھے اڑا کر لے جائیں گے؟“ اب کے حیدر اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکا۔

”مجھے ڈھوک رتہ سے راستہ معلوم ہے وہاں ہیوی ٹریفک نہیں ہوتی۔“ اس نے وضاحت کی کچھ ہنستے ہوئے دھیرے سے ماہ روز کے دل میں چھٹکا اس نے اثبات میں سر ہلایا حیدر کو گولڑہ ہوا میں اڑ رہا ہے ماہ روز نے فون کر کے گھر اطلاع دی اور ڈرائیور کو بتایا گاڑی کے قریب آکر

کیا جاسکتا یہ خالق کو مخلوق کے ساتھ ملاتی ہے اور تم خالق کا کلام الٹا پھیر رہی ہو کیا غضب کر رہی ہو شمر کو بھی الٹا پھیر دو تو وہ صرف رقت بن جاتی ہے۔

لاش جو زندگی کی ساری شمعیں گل کیے لیٹی ہوتی ہے الٹ جائے تو شال بنتی ہے زندگی کو اوڑھنے والی برہنگی چھپانے والی سیر جس میں حسن ہے تسکین ہے الٹ کر مقابلہ بن جاتی ہے لاج جب انہی حدوں سے نکلتی ہے جال بن جاتی ہے یہ ساری میں کی باتیں تھی لیکن اس کے اندر تو بھی تو تھا جو گلابی کاغذ کو چھوتے ہی اس کے اندر سا گیا تھا آخری فیصلہ تو نے کیا مجھے قاسم چاہیے بس!

رات کے آخری پہر سرد ہوا رقصاں بھی ایک دوسرے سے اٹھیلیاں کر رہے تھے پورے چاند کی روشنی نے صحن کو دھیمادھیماء جلا کر دیا تھا اباجی اگلی بیٹھک میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور پچھلے صحن میں قیامت آنے والی تھی یہ قیامت ہی تو ہے وہ رب جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے اس کے کلام کو اپنی جھوٹی گندی خواہشوں کے لیے الٹا پڑھا جائے روزی جاسن کے بیڑ کے نیچے آن بیٹھی ماحول میں پر اسراریت تھی مگر روزی کو ماحول خوشگوار لگ رہا تھا دل تسلی میں تھا کے ایسا عمل ہونے لگا تھا جس سے قاسم اسے مل جاتا وہ قاسم جو پہلی بوند کی طرح اس کی زمین بھگو چکا تھا اس نے پرچی کھولی اور پڑھنے لگی وہ پڑھتی جا رہی تھی اچانک کہیں زور کی بجلی کڑی دل زور سے دھڑکا لیکن ارادہ اٹل تھا ضرور ستارے میرے حق میں اپنی ستیں موڑ رہے ہیں بادل تو شور ڈالیں گے وہ بے وقوف شاداں زور زور سے پڑھتی رہی چاند کی چاندنی میں زور کی گھل گئی اسے یوں لگا کوئی چیز اس کے سر پر بوجھ بن رہی ہے اس نے سراٹھا کر دیکھا وہ مکروہ چھپکلی شاخ سے چپکی ہوئی تھی لیکن اس کا ساز بڑھ چکا تھا اس کا منہ اتنا زیادہ کھلا کے زبان کی سرخ رگیں اور منہ کی سیاہی دکنے لگی یہ تو روزی

حیدر تیز ہوا اس نے دروازہ کھولا کوئی اور موقع ہوتا تو ماہ روز اسے کہہ دیتی میرے ہاتھ نہیں ٹوٹے ہوئے لیکن خوف بھوک تھکاوٹ اور پریشانی نے مت ماری ہوئی تھی وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

اس نے کب سوچا تھا کبھی ایسا بھی ہوگا؟ بابا نے کبھی اس پر سختی نہیں کی مخلوط تعلیم میں پڑھتے ہوئے اس میں بہت اعتماد آیا تھا لیکن بہت لجاجت بھی وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اپنے کسی کلاس فیلو کے ساتھ کبھی زندگی میں ایک گاڑی میں بیٹھے گی جن مسافروں کو طویل ہونا چاہیے وہ جلدی ختم ہو جاتی ہیں حیدر نے ماہ روز کی ہدایت پر گاڑی چلاتے ہوئے اس کے دروازے کے آگے رکتے ہوئے سوچا

کھٹاک سے دروازہ کھلا چٹری تھا مے ماتھے پر محراب کا نشان لیے وہ ماہ روز کے اباجی تھے حیدر کے شکر گزار ہوئے اور گھر میں لے گئے حیدر کے لیے قسمت نے راستہ آسان کیا تھا اس نے آج خالی پیٹ پہلی دفعہ کافی پی تھی کیوں کہ یہ ماہ روز کے ہاتھوں بنی ہوئی تھی اب وہ کسی اور چیز کا ذائقہ نہیں چکھتا چاہتا تھا یونیورسٹی میں چارجر کارہ جانا کتنا اچھا لگتا ہو سکتا ہے آج پڑھ چلا۔

☆ ☆ ☆

لفظ بارش کو الٹا کر دو شراب بن جاتی ہے بارش جو غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تسکین اور شراب جسے حرام قرار دیا گیا روزی کے دماغ میں ہتھوڑے برس رہے تھے کہیں اندر کوئی کہہ رہا تھا جو کر رہی ہو غلط کر رہی ہو اس راہ پر جانے والے واپسی کا راستہ بھول جاتے ہیں اس کے اندر میں اور تو کی جنگ تھی میں وہ جو وہ خود تھی جہاں ضمیر زندہ تھا اور کل رہا تھا ابھی واپسی کا وقت ہے یہ محبت نما ہوں جو قاسم کے دل میں پنپنے کے بعد تم میں شکار کر رہی ہے اس سے بچ جاو محبت پا لینے کا نام نہیں ہے محبت احساس کا نام ہے محبت کو تخلیق نہیں

وہ دروازے کے پاس آگئی ہے وہ مڑی اس نے کنڈی کو ہاتھ والا نظریں ابھی بھی سنک پر تھیں جس پر خون بہے چلا جا رہا تھا کنڈی ہاتھ میں آگئی۔

اس نے کھینچا وہ کھل نہیں رہی تھی اب وہ مڑی ساری کنڈی کاٹی زدہ تھی زنگ آلود وہ جتنا کھینچنے کی کوشش کرتی کنڈی اتنی ہی سخت ہو جاتی شدید سخت وہ اپنی جگہ سے سرک بھی نہیں رہی تھی روزی دائیں ہاتھ سے کنڈی کو تھامے وہیں فرش پر بیٹھ گئی ہر جگہ خون تھا اس کے ہاتھوں پہ اس کے منہ پہ اور کنڈی سخت تھی شدید سخت سارا دن گھر کے کام نبھائے تھے اور اب لینے کے وقت اپنے عمل کی یاد آگئی تھی تھکاوٹ اور ڈر سے جسم چور چور ہو رہا تھا نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے کچھ نہ بننا دیکھ کر وہ وہیں سو گئی۔

انسان خالق کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے تو مجھے وہی دے جو میں مانگ رہا ہوں یہ بھلا کیا طریقہ ہے تجھے جو دینا تھا اور جسے تیرا وجود سونپنا تھا یہ تو اللہ نے پہلے سے سوچ رکھا ہے تو بہتری کیوں نہیں مانگتا؟ تو خیر کیوں نہیں مانگتا خواہشیں آسب ہوتی ہیں جو ان پر قابو پالیں جیت جاتے ہیں اور جو ان پر قابو نہ پالیں وہ کہیں کا نہیں رہتا کسی چیز کو منع کرنے کی سمجھ آتی ہے کہ آپ کے اندر کا الارم بجنے لگتا ہے مگر کسی چیز کے لینے دینا لگی اوزھ لینا یہ کہاں کی عبادت ہے؟

ہمیں غلام پیدا کیا گیا ہے مشورے کی ضرورت اس اللہ کو کیسے ہو سکتی ہے؟ لیکن ہم مشورے دینے لگ جاتے ہیں خواہ مشوں کے غلام بن جاتے ہیں۔

وہ عایں ضرور کریں لیکن ضد نہ کریں وہ رحمان ہے اگر تو قہار بھی ہے۔

☆ ☆ ☆

ماہ روز نے سونے سے پہلے حیدر کو کہا تھا مجھے جگادیکھئے گا بھیج کر تیار کرنی تھی لیکن نیند کو بھی پورا کرنا تھا

نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اس نے خوف سے چپک مارنا چاہی لیکن آواز نہ نکلی چپکلی کی موٹی زرد آنکھوں میں ہنسی تھی پھر اس مخلوق نے اپنی زبان باہر نکالی تالوں سے چپکی ہوئی اپنے آپ سے لپٹی زبان جب زبان کھلنے لگی روزی کا دل آخری بار دھڑکا اب موت یقینی تھی اللہ وہ اتنا کہہ کر جہاں بیٹھی تھی وہیں ڈھے گئی لمبی سبز زبان جو کانٹی زدہ لگی اور جس کی سرخ رنگیں خون کے قطروں جیسی تھی جتنے جوش سے نکلی اتنی ہی تیزی سے واپس ہو گئی زبان نے ہلکا سا روزی کے بازو کو چھوا وہ نیم بے ہوش بیڑ کے نیچے پڑی رہی باقی رہے نام اللہ کا کچھ ساعتیں گزری اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا شاخ پر کچھ نمی تھا وہ سینے کے بل گری تھی اب اس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور کھینچے ہوئے بیت الخلاء کے دروازے تک آن پہنچی اباجی کے ہاتھوں کی لکھی دعا دروازے پر جھکا رہی تھی وہ خاص ایسے صفحے پر لکھی گئی تھی جو اندھیرے میں بھی چمکتا تھا داغ کی سونیاں ابھی تک قاسم پر انکی تھیں وہ آیت جو وہ الٹی پڑھ رہی تھی الٹی ہی داغ میں آئی اور بے دھیانی سے منہ سے پھسل گئی کھنڈی پر رکھا ہاتھ جیسے پانی میں چلا گیا ہو یوں تیزی سے دروازہ کھلا وہ اندر داخل ہوئی اس نے اپنا بازو دھوتا تھا اس گندی زبان کے تھوک کا اثر ابھی محسوس ہو رہا تھا اس نے دروازے کو کنڈی لگائی مبادا کوئی اندر آ جائے سنک پر تل کھولا پانی ٹھنڈا ہے رنگ اس نے ہاتھوں میں پانی بھرا اور منہ پر چمپا کا مارا آنکھوں نے کوئی اور ذائقہ محسوس کیا تھا آنکھیں کھولی تو قل سے خون نکل رہا تھا لال لال خون وہی لال رنگ جو چپکلی کی زبان کی رگوں کا تھا سنک میں گرتا خون جب ٹکرا ٹکرا کر اطراف میں گرتا تو کانٹی زدہ ہو جاتا چپکلی کے جسم کی طرح وہ چیچی مکر شاید اس کی آواز نہ نکل سکی یا کہیں پہنچ نہیں سکی اسے اندازہ نہ ہوا وہ پیچھے ہٹتی دروازے سے جا ٹکرائی لوہے کا دروازہ ٹھک ٹھک کر کے اس کے وجود سے بجا تو اسے پتا چلا کہ

حیدر: کل پیچہ ہے جاگ جائیں

ماہ روز: سونے دیں نا

حیدر: آپ کو آواز آرہی ہے میری؟

ماہ روز: نہیں

حیدر: اٹھ جائیں

ماہ روز: سونے دیں نا نیند نہیں خراب کریں نا

i..... for this

حیدر: ہا ہا ہا

ماہ روز: اتنے زور کا پٹتے ہیں آنکھ کھلوا دی میری آپ

کی بھی نیند خراب کرے گا کوئی

حیدر: آپ نے جو کہا ذرا پھر سے کہیں اور فل ان دا

بلینک

ماہ روز: میں نے روٹین والا کہا تھا سچ میں نہیں کہا نیند

میں کہا

حیدر: کیا کہا یہی تو پوچھ رہا ہوں

ماہ روز: میں رونے لگ جاؤں گی

حیدر: اچھا بتائیں کون خراب کرے گا میری نیند؟

ماہ روز: آپ کو بیگم بتائیں گی آپ کی دیکھا ڈاپ

حیدر: میری بیگم آپ جیسی ہوں گی

ماہ روز: جی اور میں آپ کو سونے نہیں دوں گی

ماہ روز: میرا مطلب ہے آپ کی بیگم آپ کو سونے نہیں

دے گی

حیدر: اچھا آپ ہوں تو آپ کیا کریں؟

ماہ روز: منہ دھو کر رکھیں الو

حیدر: الو پسند ہیں مجھے

ماہ روز: مجھے بھی پسند ہے وہ جسے میں الو کہتی ہوں

حیدر: ہا ہا آپ نے الو کو چھوا ہے کبھی؟

ماہ روز کی آنکھوں کے سامنے لیب کا منظر گھوما تھا وہ

پاٹ رہی تھی لیکن دھڑکنوں نے اس پر بے قراری کا

مظاہرہ کیا تھا

ماہ روز: جی اتنا نرم ہوتا ہے مگر کرنٹ لگتا ہے چھونے

سے وہ بھی بہت زور کا۔۔۔ تنگ نہ کریں

حیدر: دل کھول کر ہنستا چاہتا ہوں موسم کی نوازش ہے

کہ محترمہ کا موڈ اچھا ہے

ماہ روز: چپ کریں

حیدر: ایک شرط پر مجھے ایک گانا dedicate کریں

ماہ روز: مجھ کو ہے بنایا تیرے جیسے ہی کسی کے لیے۔

یاد رہے میرا سارا زور کسی پر ہے

حیدر: ہا ہا ہا میں چپ

ایک دوسرے سے بات کر کے وہ دونوں ایسے مکمل

ہو جاتے تھے جیسے کبھی پیاس ہی نہ رہی ہو محبت جسم کی

ضرورت ہے اور روح کی حدت یہ روح اور جسم کا تعلق

مضبوط کرتی ہے انسان کا ملیت کی طرف تب ہی متوجہ ہوتا

ہے جب اس کے اندر کوئی تشنگی نہیں رہتی۔

رفتہ رفتہ حیدر ماہ روز کے اتنا قریب آ گیا کہ خود ماہ روز

کو بھی حیرت ہونے لگتی وہ ماہ روز کے ابا جی سے ملنے ہر

دوسرے تیسرے دن پہنچ جاتا وہ بھی اسے دیکھ کر خوش

ہونے لگتے ماضی کے کبھی درپے انہوں نے آہستہ آہستہ وا

کر دیئے حیدر خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہتا ماہ روز

صرف چائے کا کپ رکھنے آتی ماہ روز کو دیکھتا تو سوچتا یہ

داستانوں جیسی لڑکی اپنے اندر کتنی داستانیں چھپائے پھرتی

ہے یونیورسٹی میں بھی بیشتر وقت ساتھ گزرنے لگا فریملکی

بہت فاصلہ تھا لیکن ٹیکسٹ نے مشکل آسان کر دی حیدر

اب بھی اس سے سوال کرتا کبھی وہ چڑ جاتی کبھی جواب

دے دیتی آہستہ آہستہ رشتوں کو تری ہوئی ماہ روز واپس

سوال بھی کرنے لگ گئی۔

آپ کو کوئی اور چیز نہیں ملی تھی۔ وہ ہنسی میں اڑاتی

آپ ایسے کیوں کہتی ہیں؟ میری نظر سے خود کو دیکھیں

حیدر باقاعدہ خفا سا ہو جاتا

دل گدھی پر آجائے تو پری کیا چیز ہے ماہ روز اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی

”آپ ہرٹ کر رہی ہیں مجھے حیدر اٹھ کر کلاس سے ہی چل پڑتا لیکن جانا کہاں تک تھا مڑ مڑ کر ماہ روز کو ہی دیکھتا رہتا ماہ روز اس کے لیے مانی تھی صرف اس کی مانی سب کے سامنے سختی کا لبادہ اوڑھے گھومتی اور حیدر کے سامنے بچی بن جاتی ایسی بچی جسے صرف حیدر ہی سنبھال سکتا تھا وہ اسے ڈائریکشن دیتا سر دگر مہتا کھانے کا پوچھتا جیسے اسے بیٹھے بٹھائے کوئی بے بی مل گئی ہو

صحیح سے کور کر کے آیا کریں خود کو سردیوں میں ہدایت ملتی

ماہ روز کو ہنسی آ جاتی۔ آپ کو جیسے بڑا الیکٹرکس ہے نا بچے سنبھالنے کا۔

ہاں جی ہادیہ کو سنبھالتا ہوں نا۔ وہ بڑے فخر سے بہن کی بیٹی کا نام لیتا ماہ روز دل میں جل جھل جاتی اسے حیدر کہیں نا کہیں بہت اچھا لگنے لگا تھا کہ جس کی وہ بلا شرکت غیرے مالک ہے یہ کم گود جیسے دھیسے بولنے والا شخص ماہ روز کے اندر اتنی بے ساختگی بے قراری پیدا کر چکا تھا کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ حیدر کو بے اختیار دیکھے بے قرار دیکھے اسے پکڑے اور جھنجھوڑ کر رکھ دے تاکہ اس کی آنکھوں سے نکلتی سچائی اس کے لبوں سے بیان ہو جائے اس کا ہاتھ تھامے اسے گول گول چکر دے تاکہ جب وہ رکے تو اپنا توازن سنبھالنے میں کچھ وقت لگائے اور اس وقت میں سکون سے ماہ روز حیدر کو دیکھ سکے جو اپنی آنکھوں کی حدت سے اسے ہلکیں اٹھانے نہیں دیتا جو خواب تو دیتا ہے ہنکنے نہیں دیتا سونے تو دیتا ہے پچھلے نہیں دیتا پاگل تو ہے لیکن پاگل ہونے نہیں دیتا۔

.....☆.....

صبح آنکھ کھلی فیضی انگل اسری اور اباجی سامنے کھڑے تھے آنکھ کھلتی دیکھ کر اس کی جانب لپکے شاید کوئی ڈرانا خواب دیکھ لیا فیضی انگل نے اباجی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اباجی خاموش تھے لیکن بہت پریشان بھی اسری نے ان کی طرف دیکھا اور بہت ہلکے لہجے میں بولی۔ تنہائی سے بوکھلا گئی ہے میری یاد میں ایسی ہو گئی ہے میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی سب بخار اتر جائے گا اباجی نے دھیرے سے سر ہلایا سائیڈ پر پڑے الیکٹرک کلینڈر سے معلوم ہوا اسے سوئے ہوئے دودن گزر چکے تھے یعنی وہ بے ہوش رہی یا شاید سوئی رہی فیضی انگل کے گھر آ کر یک گونہ گوسکون ملا یہی اس کی دعا تھی لیکن کسے خبر دعا سے دوا بن جائے اس رات کے حادثے نے روزی کے دل میں ڈر ڈال دیا تھا آیت کو الٹا پڑھنا اس کے دل میں کھٹکتا رہا لیکن کوئی اندر تسلیاں دیتا رہا کہ آیتیں ہی پڑھی ہیں کوئی جنتز منتر تو پڑھا نہیں ہے پھر کیسا ڈر وہ تو اللہ کا کلام ہی ہے ان تاویلوں اور دلائل نے مجبور کیا اور اس نے قصہ کسی اور سے منسوب کر کے اسری کو سنایا

تم کسی سو کا لذت محبت پر یقین کرتی ہو وہ بھی آج کے دور میں؟ لڑکوں کے لیے محبت وقتی دل لگی ہے ان لڑکوں کو کہاں پروا ہوتی ہے کہ ان کی ریشمی ہاتیں کیسے کسی کی زندگی کو داغدار کر دیتی ہیں نقصان تو ہمیشہ لڑکیوں کے ہی حصے میں ہی آتا ہے میرے بھائی کو ہی لے لو روز مختلف لڑکیوں سے خفے تحائف لاتا ہے ایک کا دیا تھو دوسری کو دیتا ہے اپنے اسٹینڈرڈ کو اونچا دکھانے کے لیے ہر لڑکی کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے ویسے تو اس کی سو برائیاں مجھے لوگوں کی دوسوا چھائیوں سے زیادہ پیاری ہیں لیکن جب میں اس کی زندگی کا یہ پہلو دیکھتی ہوں تو وہ میرے لیے ہیں سے ہو جاتا ہے اسری کے انکشافات پر روزی کے کان

پچھے مڑ کر خباثت سے بولا۔

ابو آپ کو فخر کرنا چاہیے کہ لڑکیاں آپ کے بیٹے پر فدا ہیں مجھ سے کھیلتا چاہتی ہیں جہاں تک اسری کی بات ہے ایسا کوئی قدم اٹھایا بھی تو میں اس کا گلابادوں گا۔

اسری بے خوف کھڑی ٹوٹے ہوئے کانچ کو دیکھتی رہی کہ یہ دونوں نفوس بیٹیں تو اس کو سیٹھے اس کے اندر سے لگ رہا تھا یہ روز کا معمول ہے کمرے میں بیٹھی روزی نے یہ سب پہلی دفعہ دیکھا وہ دنگ تھی اس نے ہمیشہ قاسم کے ہاتھ میں اسری کا ہاتھ دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ یہ تحفظ ہے لیکن آج پتا چلا تھا کہ یہ ایک بھائی کی ان سیکورٹی ہے اسے شدید عدم تحفظ ہے کہ اگر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو میرے پیدا کیے ناگ اس بہن کو ڈس لیں گے۔

انسان ہمیشہ وہ دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے ایک ہی نیلا آسمان کی وسعتوں کا پتہ بھی دیتا ہے اور وہی نیلا رنگ گہرے پانیوں میں تیرنی زندگی کی بھی وجہ ہے انسان اونچاد بکھنا چاہے تو اسے آسمان نظر آتا ہے اور نیچے گرنا چاہے تو پاتال میں جا گرتا ہے آج اسے ایک اور رخ نظر آیا اس نے درد کی شدت سے آنکھیں میچ لیں سو گر رہی تھی اور گرتی چلی جا رہی تھی۔



سائیں سائیں کر رہے تھے قبل اس کے کہ وہ کسی رد عمل کا اظہار کرتی اسری نے اس کا بازو چھوڑا اور پولی

کلام الہی کو الٹا پڑھنا کیسے کسی مسلمان کے لیے قابل عمل طریقہ ہو سکتا ہے؟ نماز میں بھی سورت فاتحہ کے پلخ و ترتیب رکھنے کا کہا گیا ہے حالانکہ لفظ قلب کا مطلب ہے دل اور قلب کا مطلب کتا اگر تجوید میں ہم چھوٹی سی غلطی کر دیں تو مٹنی پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے یہ سب جاننے اور بوجھے ہوئے بھی اگر کوئی یہ گناہ کرے تو اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ شخص ان کے راستے پر چل رہا ہے جن پر اللہ کا غضب ہوا تم سوچو روزی بنی اسرائیل اللہ جبارک و تعالیٰ کی ہر دلعزیز قوم تھی کے ان کے لیے من و سلوی اتارا گیا انہیں علم، عزت اور جسامت میں فضیلت دی گئی لیکن وہی قوم جب اللہ کے کلام میں ترسیم و تبدیلی جیسے گناہ کی مرتکب ہوئی تو اللہ نے اس سے پسندیدہ کا لقب چھوڑ دیا

قرآن پاک میں بار بار ارشاد ہوا

تم اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں دیکھو گے

وعظ شاید جاری رہتا باہر محن میں چھناک سے کچھ ٹوٹ گرنے کی آواز آئی اسری معمول کی طرح باہر کو لپکی جاتے جاتے دروازہ کھلا چھوڑ گئی

”تم کرنا کیا چاہتے ہو میرے ساتھ؟“

مجھے بتاؤ میں ایسے ہی مر جاتا ہوں شرم سے روز ڈوب مرنا پڑتا ہے لوگوں کی بیٹیوں سے کھیلتے ہو انہیں استعمال کر کے چھوڑ دیتے ہو میں جوان بیٹی کو دیکھتا ہوں تو دل دہلنے لگ جاتا ہے اور کچھ نہ کر دوس عزت کا خیال کرو میری بھی اپنی بھی اور اس کی عزت کا بھی فیضی انکل محن کے درمیان میں کھڑے چلائے جا رہے تھے ان کا سرخ چہرہ اس بات کا گواہ تھا کہ گلاس انہی کے ہاتھ سے چکنا چور ہوا ہے قاسم فرنج کے آدھ کھلے دروازے کو تھامے کھڑا تھا کوئی چاکلیٹ فرنج میں رکھ رہا تھا باپ کی بات سن کر مسکرایا اور

نہلے پہ دھلا

عارف شیخ

ایک نوجوان کی سرگزشت، اسے پولیس نے ترنوالہ سمجھ کر پھانس لیا تھا مگر اس کی ذہانت کے باعث پولیس کو لینے کے دیئے پڑ گئے۔

قارئین افق کیلئے بطور خاص

پولیس موبائل تھانے کے اندر آ کر رک گئی اور پھر دو سپاہیوں اور ایک سب انسپکٹر سمیت تینوں افراد ایک نوجوان لڑکے کو پھنسی لگائے موبائل سے باہر آ گئے اور تھانے کی عمارت کی طرف بڑھے تب پیچھے سے انہیں موبائل کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے کاٹشیل کی آواز سنائی دی۔

”سرجی میرا بھی حصہ ہوگا۔“

☆.....☆

دو گھنٹے بعد مسلمان کو پانچ گندے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ لاک اپ سے رہائی ملی اور وہ سب انسپکٹر یا علی کے سامنے لاکھڑا کیا گیا تھا۔

”تیرے گھروالے اگر پانچ لاکھ دیں گے تو ہم تجھے چھوڑ دیں گے ورنہ تجھے ڈیکیتی اور اسلحے میں فٹ کر دیں گے۔“ یا علی نے وضاحت کی۔

”لیکن میں تو طالب علم ہوں میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ نے مجھے راستہ چلتے پکڑا ہے۔“

مسلمان کی آواز میں اعتماد تھا۔

”معلوم ہے یار۔ اسی لیے تو سودا کر رہے ہیں۔“

یا علی بولا۔ ”تو اگر ڈیکیت ہوتا تو تجھ سے اور کوئی کام لیتے۔“

”لیکن جناب عالی.....“

”بات کو گول مول نہیں کر۔“ یا علی سختی سے بولا۔

”بس یہ بتا کہ تیرے گھروالے تیری رہائی کے لیے پانچ لاکھ دیں گے۔“

جواب میں سب انسپکٹر نے صرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔

وہ نوجوان لڑکا اب ایس ایچ او کے سامنے موجود تھا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“ ایس ایچ او نے سوال کیا۔

”مسلمان نام ہے جی۔“ سب انسپکٹر بولا۔

”کہاں سے اٹھایا ہے۔“ ایس ایچ او اب سب انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا۔

”ایک پارک سے لکھا تھا۔“ سب انسپکٹر نے بتایا۔

”کام ہو جائے گا۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”کیوں نہیں جناب عالی چند لاکھ تو سب کے پاس ہی سے نکل آتے ہیں۔“ سب انسپکٹر مسکرایا۔

”ٹھیک ہے اسے بند کر دو اور معاملات طے کر کے کام مکمل کرو۔“ ایس ایچ او نے حکم دیا۔

”سرجی ضرورت پڑی تو رات اسے ڈرائنگ روم

”سرجی میرے تو باہی نہیں ہیں اور میں اس شہر کا بھی نہیں ہوں۔“

”کدھر سے آیا ہے۔“ یا دلی چونکا۔

”وہ جی میرا گھر ادھر ملتان میں ہے اور بڑے غریب ہیں جی بڑا بھائی دکان چلاتا ہے تو گھر چلتا ہے۔“

”تو ادھر کیا کر رہا ہے؟“ یا دلی نے پوچھا۔

”وہ جی پڑھنے آیا ہوا ہوں۔“

”اوہ استاد یہ تو غلط ہو گیا۔“ سب انسپکٹر نے فکر مندی سے کہا۔ ”لیکن ہم تجھے ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔“

”سر میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ سلمان نے التجا کی۔

”نہیں تھانے آنے کے بعد کوئی ایسے نہیں جاسکتا۔“ سب انسپکٹر نے کہا اور سلمان کو لاک اپ میں بند کروادیا۔

☆.....☆

سلمان کو اٹھا کر لانے والے دونوں سپاہی باتیں کر رہے تھے۔ ”یہ تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔“ ایک سپاہی برکت بولا۔

”مجھے تو اپنے بیس ہزار جاتے نظر آرہے ہیں۔“ دوسرے سپاہی کریم نے ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کی۔

”لیکن ایس ایچ او صاحب کچھ تو کرے گا۔“ برکت بولا۔

”یار اسے اٹھاتے ہوئے معلومات کر لینی چاہئے تھی۔“ کریم نے کہا۔

”یہ سب اتنی جلدی سے ہوا۔“ برکت بولا۔

”ایس ایچ او صاحب نے اپنے شاہنواز سر کو کہا کہ 24 گھنٹے میں رقم کا بندوبست کرو۔“

”اتنی ایرجنسی کیسے گئی۔“

”اوپر کسی بڑے افسر نے رقم کی ڈیمانڈ کی تھی ورنہ

ایس ایچ او صاحب کا تبادلہ ہو جاتا۔“ برکت نے تفصیل دی۔

”اور ہمارے صاحب کو تبادلے سے ڈر لگتا ہے۔“ کریم ہنسا۔ پھر بولا۔ ”لیکن اب ہو گا کیا۔“

”میرے پاس خبر ہے کہ اس لڑکے اور شاہ نواز صاحب کی دوبارہ سے بات ہوئی ہے شاید کوئی راستہ بن رہا ہے۔“

”اچھا ہے بن جائے ہمیں بھی کچھ مل جائے گا۔“ ☆.....☆

سب انسپکٹر شاہ نواز ایس ایچ او کے سامنے بیٹھا تھا۔ ”سراسر لڑکے سے تو رقم نہیں مل سکتی، لیکن اس لڑکے کا ایک دوست ہے اسے اگر اٹھایا جائے تو ہمارا کام ہو جائے گا۔“

”یہ اس لڑکے نے بتایا ہے۔“ ایس ایچ او نے سوال کیا۔

سب انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایس ایچ او نے فوراً ہی سلمان کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس کی پیشکش سے متعلق تفصیل جانتا چاہی۔

”تو وہ مدد کرتا تھا۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔ ”جی سر وہ میری کافی مدد کرتا تھا اس لیے میں پڑھ رہا تھا۔“

”اس کا باپ کیا کرتا ہے؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”سر یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن کاروباری ہے۔“ سلمان نے بتایا۔ ”کافی پیسے والے لوگ ہیں۔“

”پانچ لاکھ دے دیں گے۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

بھی ایسے مثبت آیا کہ بچے کو کچھ نہ کہا جائے ایک سے دو گھنٹے میں رقم مل جائے گی تھانے میں جشن شروع ہو گیا پورے عملے کو کچھ نہ کچھ ملنے کی امید تھی۔

ایس ایچ او صاحب کے حکم پر شاہ رخ کو سب انسپکٹر کے کمرے میں بٹھایا گیا اور منرل واٹر کی بوتل بھی منگوا کر دی گئی تھی۔ ٹھیک نصف گھنٹے بعد کئی موبائلیں تھانے پہنچ چکی تھیں۔ اور دوسری گاڑیوں کی آمد جاری تھی۔ پولیس بھی پہنچ رہا تھا۔

تھانے کے عملے کو کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ ایس پی سے لے کر ڈی آئی جی تک تھانے آ گئے تھے۔ صورت بالکل الٹ ہو گئی تھی پورا تھانہ معطل ہو کر گرفتار کیا جا چکا تھا۔ اور چارج دوسرے ایس ایچ او نے سنبھال لیا تھا۔

سلمان گھر پہنچ چکا تھا اسے یقین تھا کہ شاہ رخ کو بھی آزادی مل گئی ہوگی اور دوسرے دن اسے اخبار سے تمام تفصیل کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پولیس کا تمام عملہ اب گرفتار ہے۔

وہ اخبار کی تمام تفصیلات پڑھتے ہوئے مسکرا رہا تھا، کیونکہ اس نے شاہ رخ کو چھسوا کر خود کو نہیں بچایا بلکہ ایس ایچ او سمیت تمام عملے کو پکڑوا دیا تھا۔ اصل میں وہ جانتا تھا کہ شاہ رخ ایک سیشن جج کا بیٹا ہے اس لیے ڈی آئی جی خود تھانے آ گئے تھے۔

سلمان کو اب صرف ایک کام کرنا تھا اپنے دوست اور محسن شاہ رخ سے معافی مانگنا تھی اس کے لیے اس نے وہی ذریعہ استعمال کیا جو شاہ رخ سے دوستی کے لیے استعمال ہوا تھا یعنی فیس بک۔



”سر شاہ رخ کا باپ اپنے بیٹے کے لیے دس لاکھ بھی دے دے گا۔“ سلمان نے اس طرح سے بات کی کہ ایس ایچ او کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

”اب دس لاکھ پر ہی کام ہوگا۔“ سب انسپکٹر نے بھی اپنے صاحب کی آنکھوں کو پڑھ لیا تھا۔

چنانچہ سلمان نے اپنی جان بخشی کے عوض ایس ایچ او اور سب انسپکٹر سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ شاہ رخ کو ان کے حوالے کر دے گا اور بدلے میں وہ اسے آزادی دیں گے۔ دونوں کے درمیان طے شدہ معاہدہ کے تحت سلمان شاہ رخ کو فون کر کے تھانے کے نزدیک ویران جگہ بلوائے گا اور پھر موبائل اسے بھی تھانے لے آئے گی۔



شاہ رخ تھانے آیا تو اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس کی گاڑی اور اس کے لباس سے موبائل کا عملہ سمجھ گیا تھا کہ دس لاکھ کی آسانی مل گئی ہے۔ شاہ رخ کو فوراً ہی سلمان کی جگہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا تھا اور معاہدے کے تحت سلمان کو چھوڑ دیا گیا۔

سلمان نے فوراً ہی رکشا پکڑا اور اپنے روم پر پہنچا جلدی جلدی بیگ تیار کیا اور منتوں میں وہاں بس اسٹاپ پر پہنچا اور ملتان جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ اس شہر میں رک کر خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

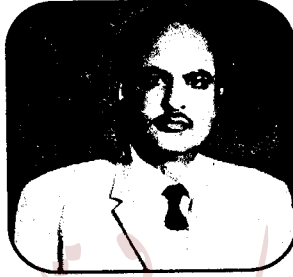


شاہ رخ ایس ایچ او کے سامنے پیش تھا۔ اسے وہی سبق سنا دیا گیا تھا جو سلمان کو سنایا گیا تھا۔ ”میرے گھربات کر لیں آپ کو پیسے مل جائیں گے۔“ شاہ رخ نے کہا۔

فوراً ہی فون ملا کر رابطہ کیا گیا اور وہاں سے جواب

گوشہٴ ابنِ صفی

ادارہ



میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اس ہی سلسلے میں گزشتہ ماہ ستمبر 2017ء کے شمارے میں ”دی گریٹ ابنِ صفی فیمنز کلب“ (فیس بک) کی جانب سے فیس بک پر محترم ابنِ صفی کے بارے میں ایک سلسلہ ”ابنِ صفی ایک عہد ایک رجحان“ منعقد کیا اس سلسلے کے کچھ مضامین شائع کیے گئے تھے ان میں نادائستگی میں کچھ اغلاط ہوئیں جن کی نشاندہی اس سلسلے کے منتظم جناب سید اسد عادل اسیٹنی نے کی۔ میرا انہما مضمون نہ صرف ابتداء میں میرے نام سے شائع ہوا وہی مضمون دوبارہ سید اسد عادل اسیٹنی کے نام سے شائع ہو گیا یقیناً یہ ایک بڑی غلطی ہے اس کے لیے ادارہ جناب اسد عادل صاحب سے اور اپنے تمام قارئین سے معذرت چاہتا ہے۔

دوسری غلطی جن کی نشاندہی کی گئی وہ ہے ان تمام محبانِ ابنِ صفی کے نام جنہوں نے اس سلسلے میں رات و دن محنت کی اور اس سلسلے کو کامیابی سے ہم کنار کیا شائع ہونے سے رہ گئے۔ ایک اور غلطی یہ بھی ہوئی کہ اس سلسلے کا پہلا مضمون جو حافظ ابوبکر کا تھا اور دوسرا مضمون جو اس سلسلے میں پانچویں نمبر پر شائع ہوا تھا وہ پرچہ میں شائع ہونے سے رہ گیا یہ دونوں مضامین اس بار ابتداء میں ترتیب سے لگائے جا رہے ہیں اور ایک درستی یہ ہے کہ جناب سید کاظم جعفری اور جناب فخر الدین کیفی صاحبان کے جو مضامین گزشتہ ماہ شائع ہوئے ہیں وہ اس سلسلے کی کڑی نہیں ہیں وہ الگ کہیں شائع ہوئے تھے۔ میں قلبی طور پر منتظمین گروپ ”دی ابنِ صفی فیمنز کلب“ جن کی کوشش و کاوش رنگ لائی شکر یہ ادا کرتا ہوں مجھے افسوس ہے کہ پچھلے ماہ ان تمام افراد کے نام شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔

گروپ منتظمین اور ایونٹس کے منتظمین کے نام یہ ہیں سید اسد عادل اسیٹنی، سید عبدالعلیم اسیٹنی، یاسر حسنین، صبیحہ یاسمین۔ ایونٹس میں مزید یہ نام شامل ہیں معاذ خان حمیرا، ثاقب زویا خان اس تمام سلسلے کو حمیرا ثاقب اور زویا خان نے فیس بک پر پیش کیا۔

یہ تمام مضامین بہت اہم ہیں کیونکہ اس سے نہ صرف محبانِ ابنِ صفی کے جوہر کھل کر سامنے آئے اور ان کے خفیتہ جذبات کو قلم کا ذریعہ میسر آیا یوں کچھ لوگوں کو لکھنے کی تحریک ملی یہ بھی ابنِ صفی صاحب کی تحریر کا ایک جوہر ہے کہ ان کے پڑھنے والوں نے ان سے متاثر ہو کر لکھنے کی بلکہ بہتر لکھنے کی کوشش کی ہے اور بہت سی خوب صورت تحریریں منظر عام پر آئیں جو نذر قارئین ہے امید کرتا ہوں کہ منتظمین ایسے سلسلے اپنے محترم ابنِ صفی صاحب کے بارے میں مزید منعقد کرتے رہا کریں گے اس سلسلے کے باقی مضامین بھی پیش خدمت ہیں جو یقیناً قارئین کو پسند آئیں گے۔

ابن صفی سے میری شناسائی حافظ ابو بکر

جب راقم کو سلسلہ "ابن صفی ایک عہد، ایک رحمان" کے بارے میں علم ہوا تو خیال آیا کہ کیوں نہ اس وسیع موضوع پر طبع آزمائی کی جائے۔
مگر یہ سوچتے ہی ہماری ٹانگیں اس طرح کا پٹنے لگیں جیسے جاڑے کا بخار ہو گیا ہو، سوچا یہ نہیں گروپ میں کیسے کیسے جونی کے تجربہ کار لکھاری ہوں گے، وہاں ہم جیسے نو آموز و معصوم لکھاریوں کی کیا دال گلے گی!.....
لیکن بھر سوچا کہ۔

"اٹھ باندھ کر کیا ڈرتا ہے

پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے"

اس شعر کی مصداق لکھنے کا مکمل ارادہ کر لیا، خیر اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف، جناب ابن صفی بلکہ اگر ہم ان کو استاد محترم بھی کہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں ان کی وجہ سے ہیں، ورنہ ہمیں تو بات کرنے کی بھی میز نہ تھی۔

آج سے چار سال قبل جب راقم کے سر پر عشق کے جادو کے بجائے مطالعہ کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا تو ایک صاحب (اللہ ان کو اس کا اجر دے) نے ہماری دیوانگی کو دیکھتے ہوئے ہمیں ابن صفی کی عمران سیریز کا ناول "مونالیزا کی نواسی" اور "خونی فنکار" پکڑا دیا۔

بس پھر کیا تھا جب ہم نے ان دونوں ناولوں کا مطالعہ کیا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے، سارا ناول ہمارے سر کے اوپر سے کسی جیٹ طیارے کی طرح گزر گیا، بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ واقعی اس ناول کا پلاٹ باقی ناولز سے مشکل تھا۔
ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم تب بھی ذہین تھے، بس یہ ناول سمجھ میں نہ آ سکا، اس کے بعد ہمیں باقاعدہ عمران سیریز کا چسکا لگ گیا، پورے ہفتے کا جیب خرچ بچا کر ہم اردو بازار جا پہنچے، ہم نے ایک دکان دار سے کہا کہ ہمیں عمران سیریز کا ایک ناول دیے دیں تو اس نے ہمیں پہلے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا جیسے کہ ہم مرغ سے آئے ہوں (یاد رہے اس وقت راقم کی عمر 11 سال تھی) پھر ہم نے کیسے دوکان دار کو مطمئن کیا کہ ہم نے ہی پڑھنا ہے وہ الگ داستان ہے۔

قصہ مختصر ہم ابھی تک جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کا مطالعہ کر رہے ہیں، ابن صفی اور ان کے ناولوں کے بارے میں بس یہ کہنا چاہیں گے کہ استاد محترم کے انداز تحریر میں ایسا جادو ہے جو پڑھتا ہے دیوانہ ہو جاتا ہے، جاسوسی ناولز کا میدان ہوا یا افسانہ نگاری کا میدان، کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، ہم خراج تحسین پیش کرتے ہیں اپنے استاد محترم کو جنہوں نے اس وقت قلم اٹھایا جب فحش رسالے مارکیٹ میں عام دستیاب تھے، انہوں نے نوجوان نسل کو جس طرح ادب کی طرف لگایا وہ واقعی ان کا ہم پر احسان تھا، ہم سب ان کے جتنے بھی شکر گزار ہوں وہ کم ہے، اللہ انکو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔
(اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو یہ سوچ کر درگزر کر دیجیے کہ راقم پندرہ سال کا معصوم سا لڑکا ہے)

دور جدید اور ابن صفی

سید فہد حسینی

ابن صفی صاحب پر کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، ان گنت موضوعات پر ابن صفی

صاحب نے لکھا، اگر ان موضوعات کو باری باری شمار کیا جائے تو اس پر ایک محکم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔
میں کوئی رائے نہیں اس لئے شاید ان صنفی پر کچھ خاص نہ لکھ سکوں کیونکہ پہلے کبھی لکھا نہیں، پھر بھی اپنی سی کوشش ہے کہ کچھ سطریں لکھ کر اپنی عقیدت کو الفاظ کے روپ میں ڈھال دوں۔
میرے ذاتی اندازے کے مطابق پاکستان و ہندوستان میں اردو زبان جاننے والے فریدی، حمید، عمران و قاسم سے 85 فیصد لوگ تو ضرور واقف ہوں گے۔

جب بھی اردو جاسوسی ادب کا نام آئے گا تو ابن صنفی صاحب کا نام سرفہرست ہو گا یا کم از کم بانیوں میں تو ضرور شمار ہو گا، جب بھی اردو ادب کو فروغ دینے والوں کا ذکر آئے گا تو حقیقت کو دیکھا جائے تو کہیں نہ کہیں ابن صنفی صاحب کا نام بھی نظر آئے گا۔

ابن صنفی صاحب نے صرف جاسوسی پر ہی نہیں لکھا بلکہ بہت سارے انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے موضوعات پر بھی لکھا، یعنی اردو جاسوسی ادب پڑھتے ہی پڑھتے ساتھ ہم دیگر کئی اہم موضوعات کو بھی جاننے لگتے ہیں، جن کا ہماری زندگی سے کہیں نہ کہیں تعلق ضرور ہوتا ہے۔

ابن صنفی صاحب ایک ایسے ہر دل عزیز مصنف ہیں جن کے ناول الماری میں کم اور لوگوں کے سر ہانے اور نکیہ کے نیچے زیادہ ملتے ہیں، حال ہی میں، میں اسنے کالج کی لائبریری میں ابن صنفی صاحب کے ناول تلاش کرتا رہا، ہمارے ادارے میں شاف کے علاوہ ہر طالب علم کو صرف چودہ دن دیے جاتے ہیں کہ وہ کوئی بھی کتاب پڑھ کر مقررہ وقت پر واپس کر دے، مگر پڑھنے والے طلبہ نے ابن صنفی صاحب کے ناول کافی عرصہ واپس نہیں کئے، میں نے یہ ناول کئی بار لائبریری میں تلاش کئے پھر گری کی چھٹیوں سے پہلے ناول لائبریری کی الماری میں نظر آئی تو اندازے سے معلوم ہوا کہ طالب علم ناول ایک دوسرے کو پڑھنے کے لئے دے دیتے ہیں اسی لئے ناول لائبریری میں پہنچنے کے بجائے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ طلباء کے درمیان ابن صنفی کے ناول کس قدر مقبول ہیں، یہی وجہ ہے کہ کالج کی لائبریری میں ان کے ناول نظر نہیں آتے۔

میرے ساتھ خود بھی یہی معاملہ ہے، یعنی ابن صنفی صاحب کے کچھ ناول میرے پاس ہیں اور ان کو کئی بار پڑھا ہے مگر پھر بھی کبھی کبھار کوئی ناول پڑھتے پڑھتے سر ہانے رہ جاتا ہے، یہ ناول ایسے ہیں کہ بار بار پڑھیں تو سوائے چند خاص واقعات کے ہر بار ناول میں کچھ نہ کچھ نیا ضرور نظر آتا ہے، چاہے سائنس ہو یا سراغ رسانی، ایکشن ہو یا نفسیات، سسپنس ہو یا مزاح، بین الاقوامی سطح کی بات ہو یا قومی سطح کی، غرض یہ کہ اردو سیری ادب ہو یا کوئی بھی موضوع ہو ہر موضوع پر ابن صنفی صاحب کو کمال حاصل تھا۔

ابن صنفی صاحب نے جو کچھ لکھا اس میں سے کسی ایک موضوع پر لکھنا بھی بہت مشکل لگتا ہے، کیونکہ انھوں نے ہر ایک موضوع کو ایک خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔

مثال کے طور پر سائنس کو ہی لے لیجئے کہ ابن صنفی صاحب نے سائنس پر کیا لکھا تو کئی ناولوں میں سائنس اور سائنسی آلات کا ذکر بخوبی ملتا ہے، جس کی کئی مثالیں ہیں جیسا کہ ان کے ایک ناول میں بیان کیا گیا ایک سائنسی آلہ ابھی اسی سال 2017 میں بنایا گیا جو کسی دوسری زبان میں کبھی کبھی بات کو اس زبان میں تبدیل کر کے آپ کو بتائے گا جس کو آپ سمجھتے ہوں کہ کہنے والے نے کیا کچھ کہا، ناول طوفان کا اغوا کار رپورٹ جس کا فرضی نام ابن صنفی صاحب نے "نولادی" رکھا تھا، اسی قسم کا ایک رپورٹ دس سال بعد روس نے بنا؟ الا جو ٹریفک کو کنٹرول کرتا تھا، ایک اور بات بھی ہے جس پر شاید ابھی تک غور نہیں کیا گیا، کیونکہ ایک جھلک کی طرح اس بات پر ابن صنفی صاحب

نئے روشنی؟ اہی کسی وہ یہ کہ ناول زمین کے بادل کے آخری لمحات میں جو فریدی حمید و عمران کا مشترکہ کارنامہ تھا میں کنٹرل فریدی ایک اڈن ٹشتری کو کنٹرول کر نیک نظام سمجھ جاتا ہجو اسکرین کے؟ ریلے کنٹرول کیا جاتا ہے، اور پھر آج کل کے سچ موبائل اور دیگر مشینوں کو دیکھا جائے تو اب ہر نئی مشین اسکرین ہی سے کنٹرول ہوتی ہے، اس دور میں کسی ایسی مشین یا موبائل کا وجود تو دور کی بات ہے تصور بھی نہیں تھا جو آجکل ہم استعمال کر رہے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ابن مہنی صاحب کے ہر ایک موضوع پر الگ الگ ایک کتاب یا کتابچہ ضرور بن سکتا ہے، ابن مہنی صاحب کی شاعری کے ساتھ ساتھ انکے ناولوں میں جو اکثر اقوال ملتے ہیں ان سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کو ملتا ہے، ان کے یہاں صرف جاسوسی، ایکشن و ڈہانت ہی نہیں بلکہ اخلاقیات، سماجیات سے متعلق اہم باتیں بھی سیکھنے کو ملتی ہیں۔

جس وقت میں جماعت و نجم میں تھا اس وقت ابن مہنی صاحب کے ناول فریدی اور لیو؟، پانی کا دھواں، جاپان کا قندہ اور سوالیہ نشان وغیرہ کو پڑھا تھا، اس وقت یہ تو نہیں معلوم تھا کہ مصنف کیا ہوتا ہے، مگر فریدی و حمید سے الفت سی ہو گئی تھی، پھر عمران سے بھی تھوڑی واقفیت ہوئی اور وہ بھی پسندیدہ کرداروں کی لسٹ میں آ گیا۔ ابن مہنی صاحب کے مذکورہ ناولوں کے ساتھ میں نے اکرم الہ آبادی صاحب کا بھی ایک ناول موت کا سفر پڑھا، یہ ناول بھی مجھے خوب پسند آیا، لیکن جو محبت و انسیت مجھے ابن مہنی صاحب سے ہے وہ کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتی۔

ابن مہنی صاحب کے جو ناول میں نے سب سے پہلے پڑھے ان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ ناول کراچی میں ابن مہنی صاحب مرحوم نے خود میرے والد صاحب مرحوم کو دیے تھے، یہ میری پیدائش سے بھی شاید 20 یا 25 سال پہلے کی بات ہے، والد صاحب نے یہ سوچ کر وہ ناول سنہال کر رکھے تھے کہ اگر کبھی شادی ہوئی، کوئی اولاد ہوئی، تو میری اولاد بڑی ہو کر یہ ناول پڑھ کر؟ جن ضرور ہوگی، آخر کار یہ ناول اس طرح مجھے دراشت میں ملے جن کو میں نے پانچویں جماعت میں پڑھا، بڑے ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مجھے جب بھی ان ناولوں کو پڑھنے کا موقع ملا تو میں نے یہ موقع کبھی نہیں گنوا یا۔

اللہ کا شکر ہے میں جیسا بھی ہوں اللہ کے فضل و کرم سے بہتر ہوں، ہمارا بہتر کردار و بہتر اخلاق اور ہماری بہتر شخصیت ہمارے والدین و معلم کی بدولت اچھی ہوتی ہے، والدین اور استاذ کی دی ہوئی تعلیم و تربیت ہمیں اچھا انسان بناتی ہے، ہمارا معاشرہ اور زندگی کے تجربات ہمیں سکھاتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ والدین کے ساتھ ساتھ ابن مہنی نے ہر ہر میدان میں ایک معلم کی طرح ہماری تربیت کی ہے۔

ابن مہنی صاحب کو پڑھ کر تھکے ہوئے؟ ہنوں کو تفریح کا سامان مل جاتا ہے، الجھے ہوئے دلوں کو قرار آ جاتا ہے، ان کے ناولوں سے اردو جاسوسی ادب اور علم کی کئی باتیں ہمیں سیکھنے کو ملتی ہیں، ابن مہنی صاحب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور آگے بھی لکھا جاتا رہے گا، حالانکہ میں خود کو کسی قابل نہیں سمجھتا لیکن اسی سلسلہ کی تجدید کے لئے میں نے بھی اپنے ناکارہ قلم سے ان کی شخصیت پر اپنی بساط بھر لکھنے کی کوشش کی ہے۔

ابن مہنی صاحب کے لئے دعا ہے کہ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے..... آمین۔

ابن صفی اور ہم

عالیہ چودھری

ابن صفی کی شخصیت پہ قلم اٹھانا کوئی معمولی بات نہیں، یہ بڑے دل گردے کا کام ہے، جو مجھے کرنا پڑ گیا ہے، دل بے چین اور بے قرار ہے، آخر کار یہ اتنا عظیم کارنامہ عالیہ نے ہی انجام دینا تھا۔

خیر میں آپ کو بتاؤں، جب میں دوسری جماعت میں تھی اس وقت ایک بار اکل لطیف ہمارے یہاں آئے، رات رہے اور صبح جاتے ہوئے تانا جی کو سپنس ڈائجسٹ، جاسوی ڈائجسٹ اور ابن صفی کے ناول دے گئے، تانا جی سب ناول تالے میں رکھتے تھے، مجس نے ہمیں بھی بے چین کیا، تانا جی کے سر ہانے سے چابی چرائی اور جلدی سے ایک ناول اٹھا لیا، ڈرتے ڈرتے تالا لگایا اور سب سے چھپ کر جو دیکھا تو ناول تھا..... "صحرائی دیوانہ"

جاسوسی دنیا یعنی فریدی اور حمید کا ناول، بس پھر کیا تھا، گوہنے عافیت ڈھونڈ کر ہم ناول میں گم، گھر والے ہماری تلاش میں گم، پھر ہم کہاں ملے.....! شام تک نہ کھانے کا ہوش نہ اپنا پتا، بس اس روز سے فریدی اور حمید دل میں بٹھ گئے، ناول کے دو حصے تھے، دوسرے حصہ تلاش کر کے بیڈ کے نیچے سے برآمد ہوئے تو جمع سامان مسروقہ پکڑے گئے، بہر حال یہ ہماری ابن صفی سے پہلی ملاقات تھی، اور پھر سارا جب خراج انہیں ناولوں پر خرچ ہونے لگا، جاسوسی دنیا سے عمران سریز تک آئے تو عمران کے ہو گئے، اور آج بھی ابن صفی ہمارے دل میں بے ہیں۔

ابن صفی نے کرداروں کے ذریعے ہماری تربیت کی، بے شک ماں، باپ، استاد سب نے اپنا فرض نبھایا مگر ابن صفی نے تو حد سے زیادہ ہی تربیت کی، پڑھنے کی لگن ایسے لگادی کہ آج تک کوئی ہمارے دل و دماغ تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔

عمران اور فریدی کے پاکیزہ کرداروں نے ہمیں انسانیت کی معراج عطا کی، ان کے ناولوں کو پڑھ کر ہم عشق، مشک کو کھاسی خشک سمجھنے لگے، خوش اخلاقی، رواداری، عزت نفس، ادب و احترام کیا کچھ ہم نے ان ناولوں سے نہیں سیکھا.....!

ابن صفی نے اس دور میں پاکیزہ سری ادب تخلیق کیا جب فحش نگاری کو کتاب کی مارکیٹ ویلیو جانا جاتا تھا، انھوں نے ثابت کیا کہ ایک ادیب کیسے معاشرے کا نباض ہوتا ہے اور معاشرے کو صحیح ادبی دوا دے کے رگوں سے بے غیری کا زہر نکال کر تندرست کر سکتا ہے۔

جی تو چاہتا ہے ابن صفی یہ لکھتی چلی جاؤں مگر داس وقت میں مگن جانش نہیں اور لکھوں تو کتاب لکھ دوں، ہر کردار کو سامنے لاؤں، کاش مجھے موقع ملے، آخر میں بس یہ کہوں گی کہ.....

نہ ابن صفی کا کوئی ہم پایہ تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا، اور ہاں..... جب میں نے ابن صفی کی تصویر دیکھی تو بس دیکھتی رہ گئی۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاں مرد تھا۔

ابن صفی۔ محسن اردو سری ادب

عبدالودود عامر

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خاص بنا کر پیدا کیا ہے، ہر انسان انفرادی خصوصیات رکھتا ہے، مسئلہ صرف اپنے اندر کے گوہر کو پہچاننے کا ہوتا ہے، جو لوگ اپنے اندر مخفی صلاحیتوں کو پہچان لیتے ہیں اور پھر اس کا صحیح و مثبت استعمال بھی کرتے ہیں وہ تاریخ ساز لوگ ہوتے ہیں ابتداءً آفرینش سے لے کر اب تک ایسے بے شمار لوگ ہر زمانے میں

پیدا ہوئے اور اپنا نام اور مقام امر کر لیا۔

ایسے ہی ایک فرد ابن صفی بھی تھے، جو بلا مبالغہ اردو سری ادب کے بانی ہیں، جنھوں نے اردو زبان اور اردو ادب کو کئی جہتوں سے آشنا کیا، اردو ادب کی تاریخ ابن صفی کے ذکر کے بغیر ناممکن اور ادھوری ہے، آئیے ذرا جائزہ لیتے ہیں کہ ابن صفی کے اردو ادب اور اردو ادب پڑھنے والوں اور ان کی نسلوں پر کتنے گہرے اثرات و احسانات ہیں۔

انسان ہمیشہ سے تجسس کا پتلا رہا ہے، تقریباً ہر انسان کے اندر فطری تجسس کا مادہ پایا جاتا ہے، وہ ان چیزوں میں زیادہ کشش محسوس کرتا ہے جس سے اس کے سنسپنس اور تجسس کے جذبہ کی تسکین ہو سکے، ابن صفی سے پہلے اردو ادب کو ہم شامی دربار اور خواص کا ادب کہہ سکتے ہیں، کچھ تبدیلی البتہ مرزا غالب کے خطوط سے ضرور آئی۔ ابن صفی کے آغاز جوانی کے دور میں جاسوسی ادب کا تصور ہی نہیں تھا، اردو ادب نہایت تکلیف اور مشکل ترین تحاریر میں ملفوف ایڑیاں رکھ رہا تھا، اگر کچھ تھوڑا بہت جاسوسی ادب تھا بھی تو وہ انگریزی ناولوں کے تراجم تھے، لیکن ان کا معیار اتنا ٹھنپا اور گرا ہوا تھا کہ کسی بھی با ذوق شخص کے ذوق مطالعہ کی تسکین نہیں کر سکتا تھا، ان انگریزی ناولوں کے تراجم میں جو غاشی کا سیلاب ہوتا تھا وہ اس معاشرے کے بنیادی اقدار کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہا تھا۔

ایسے حالات میں ابن صفی کا یہ عزم کرنا کہ وہ ایسا جاسوسی ادب تخلیق کریں گے جو معیاری بھی ہوگا اور معاشرے کی بنیادی اقدار کا عکاس بھی ہوگا، بلاشبہ جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، اس وقت تک ابن صفی کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا، اس کے برعکس بڑے بڑے قد آور لوگ اردو ادب پر راج کر رہے تھے، جب قدرت کو کچھ لوگوں سے کام لینا ہوتا ہے تو اس قسم کے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ با عمل ہوگ میزبان میں آ جاتے ہیں۔

ابن صفی نے صحیح وقت پر اپنی صلاحیت کو پہچانا، اس کا استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اردو ادب کا درخشاں ستارہ بن کر چمکنے لگے، ان کے ناولز نہ صرف لوگوں کی لائبریریوں کی زینت بنے بلکہ تکیوں تلے بھی انھوں نے اپنا مقام بنایا، پھر آہستہ آہستہ تکیوں کے نیچے محبت ناموں کی جگہ فریدی اور عمران کے کارناموں نے لے لی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ناول نہیں ہیں بلکہ ایک طوفان ہیں، جس نے سب کی مقبولیت کو اپنے اندر سمو لیا ہے، بلا تخصیص مردوزن، بوڑھے، بچے اور جوان ان کے شیدائی تھے، ایک طرف جہاں ایک مزدور اپنی دیہاڑی لگا کر ناول خریدتا تھا تو دوسری طرف سربراہ مملکت بھی بڑی بے چینی سے نئے ناول کا انتظار کیا کرتے تھے۔

یہ ابن صفی کا ہی کارنامہ ہے کہ ان کے ناول باپ بیٹی کے سامنے اور ایک بہن اپنے بھائی کے سامنے پڑھنے سے نہیں ہچکچاتی، کیونکہ اس ادب کو کشش منظر نگاری اور ذومعنی جملوں اور استعارات سے دلچسپ بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اس کا ہر کردار اپنی اقدار اور اعلیٰ اخلاقی روایات سے مکمل جڑا ہوا ہوتا تھا، اس میں مزاح ہوتا ہے مگر صاف ستھرا، جملوں کی کاٹ بھی ہے مگر لمبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دینے والی۔

کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ ایک فرد کا دماغ اتنا زرخیز بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جن ایجادات کا ذکر اپنے ناولوں میں کرتا ہے وہ آنے والے زمانہ میں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں، یا خدا..... کیا الہام ہوا تھا ابن صفی کو؟ ابن صفی کے خیال کی پرواز اتنی بلند تھی کہ نقیشت کے جو طریقہ انھوں نے متعارف کرائے اس سے مرعوب ہو کر سرکاری انجینئرز نے بالآخر اپنے افسروں کی تربیت کے لئے ان سے غیر رسمی مشاورت بھی مانگی۔

ان کے ناولوں کے جملے ایسے ہوتے تھے کہ محفل زعفران زار ہو جائے اور خلوت میں سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی پیٹ پکڑ کر ہنسنے پر مجبور ہو جائے، ایسے ایسے کردار کہ انسانی عقل دنگ رہ جائے، بلاشبہ ابن صفی اردو ادب کے بہت

بڑے محسن ہیں، کیونکہ اگر وہ ابتدا نہ کرتے تو انگریزی ناولوں کے بخش ترجموں کا سیلاب جانے لگتی نسلوں کی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیتا۔

اور اب ایک آخری بات، جب جب ابن صفی کا ذکر ہوگا تو ان نقالوں کا بھی نام لیا جائے گا جنہوں نے ابن صفی کی مقبولیت کو سیزھی بنا کر مشہور ہونے کی کوشش کی، بجائے اس کے کہ جو بنیاد ابن صفی رکھ کر گئے تھے اسی پر نئے کرداروں کے ساتھ جاسوسی ادب کی ایک بلند عمارت تعمیر کرتے، انہوں نے الٹا ابن صفی کے کردار چوری کئے اور ان کرداروں کے ذریعے مشہور ہونے کی بہت ہی بھونڈی کوشش کی۔

دکھ صرف اس بات کا ہے کہ ابن صفی نے جو کردار بڑی محبت اور محنت سے تخلیق کئے تھے ان کا بیڑا غرق کر دیا، کسی نے ان کرداروں کو میدان عشق کا شہسوار بنا ڈالا تو کسی نے اتنی قتل غارت کرائی کہ درندگی بھی چیخ اٹھی کہ ہائے یہ کیا درندگی ہے!.....!

ان لوگوں نے ابن صفی کے نٹ کھٹ سے عمران کا سب سے برا حشر کیا، کسی نے اس کو ناقابل تسخیر بنا دیا تو کسی نے جنوں بھوتوں سے لڑنے والی روحانی شخصیت میں تبدیل کر دیا، وہ دن ہوا ہوئے جب علی عمران اپنی باتوں اور اوٹ پٹانگ حرکتوں کے بیچ پورا کیس حل کر لیا کرتا تھا، اب عمران مٹین پسلل کے لڑکھو متا ہے اور بے درلج قتل عام کرتا ہے، خنجر کے ذریعے ناک کاٹ کر اعتراف جرم کرواتا ہے، چادہ گردوں سے لڑتا ہے، جنوں بھوتوں کو مارا کرتا ہے، آج کا عمران سب کچھ بن چکا ہے مگر ہمارا علی عمران اس میں ہمیں نظر نہیں آتا۔

آج کی نسل ابن صفی کا نام بھولتی جا رہی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس حوالے سے دوبارہ اتنا کام کیا جائے کہ ابن صفی کے ناول دوبارہ تکیوں اور بستر میں جگہ پالیں۔

ابن صفی۔ اردو سری ادب کے بانی حمزہ رمضان

"جو کہہ گئے وہی شہر اہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی"

اردو جاسوسی ادب میں ابن صفی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، جب کبھی اردو جاسوسی ادب کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو اس میں ابن صفی کا نام سنہری حروف میں لکھا نظر آئے گا، کیونکہ ان کا شمار جاسوسی ادب کے بانیوں میں ہوتا ہے، بلکہ یہ کہا جائے کہ اردو جاسوسی ادب کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی تو بے جا نہ ہوگا۔

ویسے تو ان سے پہلے بھی کئی مصنفین جاسوسی ادب لکھ رہے تھے مگر وہ ناول ایک مخصوص طبقہ تک ہی محدود رہتے تھے، دوسری بات یہ کہ وہ انگریزی ناولوں کا ترجمہ اور چہ بہہ ہوتے تھے، یہی وجہ تھی کہ دوسرے معاشرے کے ناولوں کے ترجمے ہمارے معاشرے میں پنپ نہ سکے، لیکن جب جناب "اسرار احمد" نے "ابن صفی" کے نام سے لکھنا شروع کیا تو ایک بہترین اور لا جواب سلسلہ شروع ہو گیا، جس کو ہر طبقہ فکر کے افراد نے جنون کی حد تک بڑھا۔

یہ ناول اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ ایک نشست میں ختم کئے بغیر چھوڑنے کا دل نہیں کرتا، رنگارنگ کردار، طنز و مزاح، سسپنس اور ایڈونچر سے بھرپور ان ناولوں کی مثال ملنا مشکل ہے، کسی نے ایک بار ابن صفی سے پوچھا تھا کہ "آپ کے ناول الماریوں کیوں نہیں ملتے؟"..... تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا تھا "کیونکہ وہ تکیوں کے نیچے ملتے ہیں۔"

بلاشبہ ایسے ہی ہیں ان کے ناول، جنہیں پڑھتے وقت آدمی ان ناولوں کے سحر میں کھوسا جاتا ہے، تصور میں وہ

بھی حمید کے ساتھ آرکچو میں کافی بی رہا ہوتا ہے، کبھی فریدی کیساتھ لاہوری میں میں بیٹھا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے، کبھی کیڈیلاک میں کسی کیس کی تفتیش کے سلسلہ میں ادھر ادھر کی خاک چھان رہا ہوتا ہے، کبھی ذہنی جنگ میں اس کے ساتھ نئی نئی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہوتا ہے تو کبھی عمران کی حماقتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، کبھی اسکے ساتھ مجرموں کے گردنیں توڑ رہا ہوتا ہے، ناول پڑھتے وقت وہ کبھی رام گڈھ، سریم بالا، کمٹالی، ریکم بالا جیسی جگہوں پر گھوم رہا ہوتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں میں سب سے اہم بات ان کے بہترین کردار ہیں، جو آج بھی زندہ جاوید ہیں، اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی آج ان کا ہر کردار اسی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

ان کے کرداروں کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نہ صرف ابن صفی کی زندگی میں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی کئی مصنفین ان کے کرداروں فریدی، حمید، عمران، ایکسٹو، قاسم، فیاض کے ساتھ ساتھ رنگ ہی، تھریسیا، نالوتہ اور دیگر کرداروں پر لکھ رہے ہیں۔

ابن صفی کے تمام مثبت کردار نہ صرف بہادر، دلیر، ذہین ہیں بلکہ معاملہ فہم، حساس طبع اور با کردار بھی ہیں، فریدی، حمید، عمران، انور وغیرہ سب مضبوط اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں، جو ہمیں بھی اپنے کردار کو مضبوط بنانے کا سبق دیتے ہیں۔

ابن صفی اپنے ناول "دلیر مجرم" سے لے کر "آخری آدمی" تک تمام ناولوں میں ایک اہم سبق دیتے ہیں، "قانون کا احترام" ابن صفی کا یہ مقصد تھا کہ وہ عوام کو قانون کا احترام سکھائیں، کیونکہ جو آدمی قانون کا احترام کرے گا جرم سے دور رہے گا، جب تک عوام میں قانون کا احترام نہیں ہوگا چوری، لٹ، اور خوریزی ہوئی رہے گی، اسی لئے ہر آدمی کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ قانون سے آگاہ ہو، اس کا احترام بھی کرے، ابن صفی اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے کیونکہ ان کے کردار اور ناول ہمیں قانون کا احترام سکھانے میں کامیاب رہے۔

ان کے ناولوں میں ایکشن، ایڈونچر، سراغری، مہم جوئی، ذہنی جنگ کے واقعات بھرے پڑے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح، بذلتی، حاضر جوابی اور ظرافت کا ایک سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، جسے پڑھ کر قاری بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے، ابن صفی کا مزاح شکفتہ، شائستہ، بے ساختہ ہوتا ہے، ان کی تحریریں سنجیدگی اور مزاح کا مریخ ہوتی ہیں، "جاسوسی دنیا" میں جہاں "فریدی" کا پروکار اور سنجیدہ کردار ہے تو وہیں "حمید" جیسا پر مزاح و شریہ، اور قاسم جیسا احمق کند ذہن کردار بھی موجود ہے۔

اسی طرح "عمران سیریز" میں عمران جتنا پر مزاح، شریہ اور حماقت آمیز حرکتیں کر کے سب کو ہنسانے والا ہے تو دوسری طرف بطور ایکسٹوائی سنجیدہ اور سخت ہے۔

ابن صفی کے لکھنے کا انداز بہت ہی بہترین اور اچھوتا ہے، وہ اپنی تحریروں میں مشکل سے مشکل بات بھی سادگی سے سمجھانے کے ماہر تھے، انھوں نے اپنے ناولوں میں اکثر چھوٹے چھوٹے جملوں میں زندگی کے حقائق کو بڑی جا بکدستی سے بیان کیا ہے، روزمرہ زندگی کے ہر مسئلے پر اپنے ناولوں کے ذریعہ اپنے قارئین کی رہنمائی کی ہے۔

ابن صفی ایک کثیر المطالعہ اور وسیع المعلومات انسان تھے، ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر ان کی گہری نظر تھی، حالات و واقعات سے ان کی پہلی آگاہی و آشنائی ان کو اپنے ناولوں کے پلاٹ کا انتخاب کرنے میں مدد دیتی تھی۔

ان کے ناولوں میں ان کے کردار جتنے صاف تھرے، اور اعلیٰ اقدار کے حامل نظر آتے ہیں خود ابن صفی بھی اپنی عملی زندگی میں مضبوط اور بلند کردار، با اخلاق، انسان دوست، عاجز، منکسر المزاج، خلیق اور شفیق انسان تھے، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، درمیانہ قد اور فراخ سینے کے عقب میں ایک محبت بھرا موم کی طرح نرم دل رکھتے تھے،

سلسلہ درگاہ کا فرق کے بغیر بلا تخصیص و امتیاز ہر کسی سے خندہ پیشانی و مہربانی سے ملتے تھے، جب کسی سے گفتگو کرتے تو اپنی نرم مزاجی و تکلفت بیانی سے اسے اپنا گرویدہ بنالیا کرتے تھے، اپنی انہیں خصوصیات اور انداز کی وجہ سے وہ ہر طبقہ میں مقبول تھے، کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے تھے۔
بقول شاعر..... سہیل اقبال۔

"جیسے کہ مہر و ماہ سے روشن ہیں دشت و در
جیسے کہ مسافروں کے لئے دشت میں شجر
جیسے کسی کے نغمہ جاں بخش کا اثر
تاریکیوں میں رات کی جیسے رہن سحر
پیغام صبح نو بھی نئی زندگی بھی ہے
ایسے ہی دہر کے لئے ابن صفی بھی ہے"
"انسانیت کی پستی پہ آنکھیں ہیں اشک بار
بھوکا کسی کو دیکھ کہ دل بھی ہے بے قرار
صحن چمن سے پھول میسر ہوا کہ خار
سب ہی اسے عزیز ہیں سب ہی سے اسکو پیار"

ان کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے، کیونکہ ان جیسے عظیم انسان بہت ہی کم ملتے ہیں، بچپن سے ان کے ناول پڑھنے کی وجہ سے مجھے ان سے بہت عقیدت ہے، ان کے ناول بھی بار بار پڑھنے کی عادت ہے، دعا ہے کہ یہ عادت اور عقیدت ہمیشہ قائم رہے۔

"مشکل ہے ایک روز بھی جینا کسی کے ساتھ

بچپن سے جی رہا ہوں میں ابن صفی کے ساتھ۔"

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے ہر دل عزیز مصنف کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

"آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبز و نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

ابن صفی۔ ایک لاثانی نام

ظہیر شیخ

"آپ کے منہ سے دودھ کی بو آرہی ہے۔"

"وہ دراصل میں نے آئس کریم کھائی تھی۔" حمید بھی شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

حاضر جوابی، صاف ستھرا مزاج، شرارتی انداز، دلچسپ جملے، ایکشن، سسپنس اور اس جیسے کئی انداز لئے ابن صفی صاحب بلاشبہ ایک "مستقل لکھاری" نہیں بلکہ "مستقبل کے لکھاری" تھے۔

جی ہاں بالکل وہ مستقبل کے لکھاری تھے..... حلال اور ماضی پر تو بہت سوں نے لکھا، اور فکشن پر بھی، لیکن ابن صفی صاحب کے ناولز کو فکشن کہنا شاید غلط ہوگا کیونکہ فکشن تو ایک فرضی چیز ہے اور ابن صفی صاحب نے مستقبل کا نقشہ کھینچا جو کہ سچ نکلا۔

میں نے ابن صفی کو بہت کم پڑھا لیکن جو بھی پڑھا کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ یہ اتنی دہائیاں قبل لکھا گیا ادب

ہے..... ایسی بہت بڑا کمال تھا ان کا کہ آج بھی کوئی لکھاری ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکا، بلاشبہ ابن صفی صاحب میرے نقطہ نظر سے جاسوسی کہانیوں کے بانیوں میں سے ہیں۔
ایک بات جو اکثر ان کے حوالے سے دل میں آتی ہے بہت عجیب سی ہے، لیکن ان کے نادلوں کو پڑھ کر جو محسوس کیا وہ کہہ رہا ہوں کہ میرے نقطہ نظر سے "شاید بہت سارے سائنس دانوں نے اپنی ایجادات بھی ابن صفی صاحب کے ناول پڑھ کر کی ہیں"
ادب کا یہ پہچان ہے کہ اس میں موروثیت نہیں ہے جسے کسی میں منتقل کیا جاسکے، یہ تو خدا کی دین ہے اور کسی کسی کو عطا ہوتی ہے اور ابن صفی صاحب کو اللہ پاک نے اس دولت سے مالا مال کیا تھا، اللہ پاک انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے...

ابن صفی۔ مستقبل کا مصنف

اعزاز سلیم وصلی

کمپیوٹر کے کی بورڈ کو چھوئے ہی میری انگلیاں دماغ سے آنے والے منتشر خیالات کو ٹاپ کرنے کے لیے بے تاب ہیں مگر دماغ اس وقت الجھن میں ہے کہ آخر کیا لکھوں؟
اس شخصیت کے بارے میں جس نے ایک دنیا کو دیوانہ بنا رکھا ہے وہ خود تو دنیا میں نہیں ہے مگر اس کے الفاظ اس کے قلم کا جادو اس کے کردار اور وہ خود ہمارے دل میں زندہ ہے۔
ابن صفی پر لکھنا اتنا آسان ہوتا تو آج نام نہاد نقاد اور بزم خود ادب کے ٹھیکیداران پر بہت کچھ لکھ چکے ہوتے، ان لوگوں کی "ادبی خاموشی" اس بات کی دلیل ہے کہ ابن صفی کی قد آور شخصیت پر لکھنا ان کے قلم کی استطاعت اور خود ان کی صلاحیت سے باہر کی بات ہے۔ بات شروع کرنے سے پہلے بتا دوں کہ میں نے ابن صفی صاحب کو ابھی کچھ دنوں پہلے پڑھنا شروع کیا ہے لہذا یہ پوسٹ چاہے دوسرے کئی ممبران جیسی نہ ہو لیکن چونکہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھی گئی ہے اس لیے اس میں بھی الفاظ ہیں وہ میرے دل سے نکلے ہوئے میرے جذبات کے ترجمان ہیں۔

یہ 2010ء کی بات ہے ایک بچہ جس نے ہاتھ پر کبھی بھی کچھ لکھنے کی حماقت نہیں کی تھی زندگی میں پہلی بار ایک نام لکھ کر سب کو دکھا رہا تھا اور آپ جانتے ہیں وہ کس کا نام تھا جی ہاں وہ نام تھا "علی عمران"
بڑے بھائی نے جب دیکھا تو پوچھا نام تو لکھ لیا ہے مگر جانتے ہو اس کردار کے خالق کون ہیں؟ بچے نے نفی میں سر ہلایا تو بھائی نے بتایا یہ کردار ابن صفی صاحب نے تخلیق کیا تھا اس کردار کو بنانے کا مقصد یہ تھا کہ اسے فحاشی پھیلانے والے دوسرے لکھاریوں اور ان کے کرداروں کے خلاف صف آرا کر دیا جائے یہ بات تو شاید بچے کی سمجھ میں نہ آئی ہو لیکن اس کے ذہن میں ابن صفی کا نام محفوظ ہو گیا۔ یہ ہوتا ہے ایک عہد ایک رجحان ایک پانچویں کلاس کا بچہ آج سے کئی سال قبل جاسوسی دنیا کی بنیاد رکھنے والے مصنف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آخر کیا دماغ دیا تھا خدا نے اسے کہ جس کے کردار سب کے ذہنوں میں نقش ہیں۔ بچہ بڑا ہو گیا ایف بی پڑا یا تو دیکھا صرف وہ ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ اس نام سے واقف ہے اس نام کا عاشق ہے پھر بچے نے پہلی بار ابن صفی صاحب کی تحریر پڑھی وہ پڑھتے ہوئے حیران تھا کہ آج سے تقریباً ستر سال پہلے کے زمانے میں اس مصنف نے آج کے دور کے لوگوں کا رویہ کیسے لکھا ہوگا؟

میں نے ساتھ مصنف وہی لکھتا ہے جو اپنے ارد گرد دیکھتا ہے مگر ابن صفی نے مستقبل کے بارے میں کیسے لکھ لیا

جب سوچتا ہوں تو حیرانی ہوتی ہے ابن صفی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے ایک بات سامنے آئی کہ 1970ء میں ان سے پاکستان اٹھیلی جسن ایجنسی جاسوسی کے طریقہ کار بھی سیکھتی رہی ہے کیا کوئی خیالی کردار بنانے والا شخص اتنا مشہور ہو سکتا ہے؟

ابن صفی ایک ایسے رائٹر تھے جن کے ناول اور نچنل میں بک جانے کے بعد بلیک مارکیٹ میں بھی نہیں ملتے تھے اور یہ صرف ایک ملک میں ہوتا تو پھر بھی تھا یہ وہ مختلف ممالک تھے جو ایک نام کے واپانے تھے۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ ”جب کبھی بندہ بہت پریشان ہو یا دنیا سے کٹ جانے کا دل چاہے تو اسے چاہیے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی پرسکون جگہ بیٹھ کر ابن صفی صاحب کو پڑھے سب بھول جائے گا۔“

ابن صفی اردو ادب کے ایسے رائٹر تھے جن کے ناولز سب سے زیادہ دوسری زبانوں میں ترجمہ کیے گئے لاکھوں لوگوں نے ان کو مختلف زبانوں میں پڑھا حتیٰ کہ بے پڑھے لکھے لوگوں نے ان کے ناولوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے پڑھنا سیکھا اور جو نہ سیکھ سکے انہوں نے دوسروں سے سن کر لطف حاصل کیا کہنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر آخر میں اتنا کہوں گا کہ ”ابن صفی دی گرینٹ“ جیسا ناول نگار کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

ابن صفی اور اردو ادب

نعمان احمد اعوان

میں تمہیں یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح

مجھ کو ہر آگے محفل میں مثالوں کی طرح

ابن صفی کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کرنے کا جو سلسلہ گروپ ایڈمنز کی طرف سے شروع کیا گیا ہے اس میں میری کاوش پیش خدمت ہے، میں کوئی لکھاری تو نہیں جو ابن صفی سے اپنی عقیدت کو درست طریقے سے انصاف کے ساتھ بیان کر پاؤں گا، لیکن اپنی بساط بھر جو کوشش کی وہ آپ سب کے پیش خدمت ہے۔

ابن صفی سے میرا تعارف کالج دور میں ہوا، اسکول میں پڑھتے ہوئے اس نوع کے ناول میرے مطالعہ میں نہیں آئے، صرف بچوں کے رسالے، کتب یا اخبار پڑھنے کی اجازت تھی، جب کالج میں داخلہ لیا تو گھر کے نزدیک واقع بک شاپ پر عمران سیریز کے نام سے ناول دکھائی دیئے جو ایک روپیہ پیمہ کر ایئر پر پڑھنے شروع کئے، آج میں یہ بات آپ سب سے شیئر کر رہا ہوں کہ میں نے ابتدا مظہر کلیم کے ناولوں سے کی اور کچھ ہی عرصے میں 200-250 ناول جو اس شاپ پر موجود تھے سب پڑھ لئے، میرے بڑے بھائی ابن صفی کے ناولوں کے بڑے شائق تھے، ان کی مفصل بک شیلیف میں ابن صفی کے ڈھیروں ناول موجود تھے، مجھے یہ ناول حاصل کرنے کے لئے بڑی تک و دو کرنی پڑی، ان کا خیال تھا کہ میں ابھی بچہ ہوں، اس لئے ابھی صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دوں، لیکن پھر میں نے ان کو اس بات پر قائل ہی کر لیا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اس لئے ابن صفی کے ناول پڑھ سکتا ہوں، بہر حال، بہتر اردقت وہ مجھے ناول دینے پر رضامند ہو گئے۔

پھر جب میں نے یہ ناول پڑھے تب معلوم ہو کہ اصل کیا ہے اور نقل کیا ہے، اس طرح میرا تعارف اردو ادب کے ایک بڑے نام جناب ابن صفی صاحب سے ہوا اور ایک چور جو قانون دان ہونے کے باوجود قانون کی وجہاں اڑا رہا تھا اسے چھڑکا رمل گیا۔

اردو کے سری ادب کے بارے میں اگر بات کی جائے تو اس موضوع پر بے شمار افراد نے طبع آزمائی کی مگر جو پذیرائی اسرار احمد المعروف ابن صفی کو ملی وہ اور کسی کے نصیب میں نہیں آئی، ابن صفی کو اگر اردو میں سری ادب کا بانی

کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، آپ نے اردو ادب کی اصناف شعر و شاعری اور طنز و مزاح پر لکھا اور بہت خوب لکھا مگر آپ کی وجہ شہرت آپ کے زندہ جاوید جاسوسی ناول ہیں، جو بظاہر تو صرف تفریح کا ذریعہ دکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ناول ملک و قوم سے محبت کا جذبہ بیدار کرنے اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ مستقبل کا مورخ جب اردو ادب کو فروغ دینے والوں کی فہرست مرتب کرے گا تو اس میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی موضوع پر ابن صفی صاحب کا نام ضرور شامل کرے گا، انھوں نے جاسوسی ناولوں کی صورت میں اردو ادب کی بہت خدمت کی جو سراہے جانے کے قابل ہے۔

ابن صفی نے اپنی مشہور غزل "راہ طلب میں کون کسی کا" کے آخری شعر.....

"بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا

اپنی ذات سے عشق ہے سچا بانی سب افسانے ہیں"

..... میں آج کل کے دور کی نفسانسی اور خود پرستی کو مکمل طور پر بیان کر دیا ہے۔

جس موضوع پر پوری پوری کتب لکھی جاسکتی ہیں اس کو ایک شعر میں بیان کر کے گویا سمندر کو کوڑے میں بند کر دیا ہے، اگر آپ ابن صفی نہ جانتے اسرارِ ناروی ہی رہتے تو آج آپ کا شمار اردو کے بڑے شعرا میں ہوتا، آپ نے اس دور میں لکھا جب موجودہ ذرائع عامہ اور جدید سہولیات موجود نہ تھیں، لیکن آپ کے کئی ناولوں کے مطالعہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں اس سے علم ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ کس قدر وسیع اور آپ کی سوچ کس قدر بلند تھی۔ آپ نے اپنے ناولوں میں بے شمار ایسی سائنسی ایجادات کا ذکر کیا ہے جو آج دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ رکھی گئی ہوں۔

"مثال = عمران سیریز 68، کنگ جانیگ، جس میں ہزاروں میل دور واقع فراہیسی مقبوضہ علاقے ٹاہٹی اور وہاں کے آخری حکمران پومارے پنجم کا تذکرہ ہے"

"مثال = جاسوسی دنیا 67، طوفان کا اغوا، جس میں فولادی نامی روبوٹ کا تذکرہ ہے، آج کل کی روبوٹ ٹیکنالوجی اس کی ہیئت جانتی مثال ہے"

"مثال = عمران سیریز 100، ہلاکت خیز، جس میں زیرو لینڈ کے ایسے شعاعی دفاعی نظام کا ذکر ہے جو دشمن کے طیاروں اور میزائلوں کو ہوا میں ہی تباہ کر دیتا ہے، امریکا میں ایسا شعاعی ہتھیار تیار ہو چکا ہے جو میزائلوں کو ہوا میں تباہ کر دیتا ہے اور اس کو مزید وسعت دینے کا کام جاری ہے"

ان کے ناولوں کی ایک خاصیت یہ بھی کہ ہے کہ بار بار پڑھے جانے کے باوجود ان کی ادبی چاشنی اپنی جگہ قائم و دائم رہتی ہے، ہر مرتبہ مطالعہ کرنے پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پہلی مرتبہ مطالعہ کر رہے ہوں، اس کے برعکس ان کے ناولوں کے ناول پہلی مرتبہ پڑھنے پر ہی یوریت اور ذہنی پراگندگی کا باعث بن جاتے ہیں۔

آپ نے اپنی تحریروں میں قانون کی بالادستی کا سبق دیا، یعنی مجرم خواہ کتنے ہی دلیر اور ذہین فطین کیوں نہ ہوں قانون کے محافظوں کے شکنجے میں ایک دن ضرور آتے ہیں، ان کے کئی ناولوں کے ابتدا میں مجرم اپنے جرائم میں عروج پر ہوتے ہیں اور بظاہر فتح یاب دکھائی دیتے ہیں لیکن آخر میں فتح قانون کے محافظوں کو ہی ہوتی ہے۔

ابن صفی نے ذہنوں کو چھو جانے والے کردار احمد کمال فریدی اور علی عمران جو ان کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے مرکزی کردار ہیں تخلیق کئے، ایک ادارے کے سربراہ کی کارکردگی پر پورے ادارے کا دارومدار ہوتا ہے، اس سربراہ کا کردار اپنے ماتحتوں کے لئے مشعل راہ ہوتا ہے، اس لئے آپ نے احمد کمال فریدی جیسا کردار تخلیق کیا جو بظاہر محکمہ سراغ رسانی کا ایک معمولی انسپکٹر ہے، لیکن باطن وہ صدر مملکت سے منظور شدہ بلیک فورس نامی خفیہ تنظیم کا

سربراہ بھی ہے، سنجیدہ مزاج اور اپنے اصولوں کے معاملے میں ٹھوس چٹان کی مانند ہے، جس کو اس کے نائب کیپٹن حمید نے انھیں سب خصوصیات کی بنا پر کرنل ہارڈسٹون کا نام دیا ہے۔

دوسری طرف علی عمران کا کردار ہے جو بظاہر تو اپنی چلتی اور ٹٹلون مزاج طبیعت کے باعث اپنے ساتھیوں کو ناپسند ہے، لیکن بحیثیت ایکسٹوڈہ وزارت خارجہ کی سیکریٹ سروس کا سربراہ بھی ہے، بحیثیت عمران اس کے ساتھی اس کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں، لیکن جب یہی عمران ایکس ٹو بن کر اپنے ماتحتوں سے مخاطب ہوتا ہے تو ان کی جان نکل جاتی ہے، اپنے ساتھیوں میں پوچھا جانے والا ایکس ٹو اپنے کام اور اصولوں کے معاملے میں فریدی جیسی طبیعت رکھتا ہے۔

بقول علامہ اقبال کے.....

"نگاہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز

یہی ہے رخت سفر میر کا رواں گئے لئے"

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں وطن سے محبت کا بھی درس دیا، انسانیت سے محبت کو اولین ترجیح دی، وطن کی خاطر ہر مشکل کو برداشت کرنے اور کڑے سے کڑے امتحان میں آف تک نہ کرنے کی تربیت دی، ان کے ناولوں میں اکثر قانون کے محافظ وطن اور انسانیت دشمن قوتوں سے لڑتے ہوئے شدید زخمی ہوئے مگر اپنے فرض سے پیچھے نہیں ہٹے۔

"مثال = عمران سیریز 23، رائی کا پریت، جس میں صفدر جو عمران کا ذہین و ہوشیار ماتحت ہے بھوک و کمزوری کے باوجود دشمن سے لڑائی میں فتح حاصل کرتا اور اس کا راز معلوم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے"

آپ کے کئی ناولوں میں ایسے مجرموں کی بارے میں بتایا گیا ہے، جو اپنے ساتھ معاشرے یا کسی فرد واحد کے ظالمانہ سلوک کے رد عمل کے طور پر انتقام لینے کی خاطر غلط راہوں پر چل پڑے، مگر آپ نے اس بات کا سبق دیا کہ خواہ جرم کی راہ پر چلنے کی کوئی بھی وجہ ہو مجرم قابل معافی نہیں، اس کو اس کے کینے کی سزا ضرور ملنا چاہیے، ہاں معاشرے کو درست کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ ایسے حالات نہ پیدا ہونے پائیں کہ کسی کو جرم کی راہ اپنانا پڑے۔

"مثال = جاسوسی دنیا 29، لاشوں کا آبشار، جس میں ڈاکٹر نارنگ معاشرے کے اپنے ساتھ کئے گئے ناروا سلوک کے باعث سب سے انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے"

ابن صفی کے ناولوں کی جو بات مجھے بذات خود سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ ہے کہ آپ کے ناولوں میں فحاشی کا عنصر بالکل نہیں ہوتا، ان کے ناولوں کے مرکزی کردار علی عمران اور کرنل فریدی عورت پرستی سے کوسوں دور نظر آتے ہیں، انہوں نے اپنے ماتحتوں کو بھی اسی ڈھب پر رکھا ہے۔

ان کے کردار ناولوں میں بظاہر تو خواتین سے دوستی کرتے نظر آئیں گے مگر وہ صرف وقتی ضرورت کے تحت ہوتا ہے، وہ عورت کو عیاشی یا تلذذ کی شے نہیں سمجھتے، یہ وقتی دوستی معلومات حاصل کرنے اور خواتین کی مدد کرنے کے لئے ہوتی ہے، اس وقتی اور ملاقات میں بھی تقدس اور پاکیزگی کو پامال نہیں کیا جاتا، ہوس پرستی، فحاشی اور حیوانی جذبہ کی تسکین نہیں کی جاتی۔

ابن صفی کے ناولوں کے برعکس مغربی مصنفین کے ناولز میں یہ چیز جا بجا نظر آتی ہے، ان ناولوں میں فحش جملے یا حرکات نظر آتی ہیں، ابن صفی نے جس دور میں لکھا اس وقت انگریزی ناولوں کے اردو تراجم بازار میں دستیاب تھے، جو فحش بیانی کی وجہ سے ہی فروخت ہوتے تھے، ان ناولوں میں ایسے نفوادر گھنیا جملوں کا استعمال ہوتا تھا جو ذہنی

جیسی تسکین کا سبب ہوتے تھے۔

ابن صفی نے عمدہ قسم کے ناول لکھے اور ایسے لکھے کہ ہر عمر کا شخص ان کا مطالعہ کر سکے، آپ کے ناولوں میں ہمیں کسی بھی قسم کا کوئی نازیبا جملہ یا بات نہیں دکھائی دیتی، چھپ چھپ کر ناول نہیں پڑھنے پڑھتے، یہ لٹریچر کھلے عام سب کے سامنے بھی پڑھا جاسکتا ہے، جو کسی بھی طور باعث شرمندگی نہیں۔

ابن صفی اس دنیا سے تو پردہ فرما گئے لیکن اپنی خوبصورت تحریروں کے روپ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، جب تک ادب کی ایک صنف جمی زندہ رہے گی ابن صفی کا نام روشن ستارے کی طرح تابندہ رہے گا۔

اللہ پاک، مرحوم کی بخشش و مغفرت فرمائے اور ان کی قبر و حشر کی تمام منازل کو آسان فرمائے..... آمین

لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں

لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی ہی داستاں

ستارہ جو ٹوٹ گیا

اصفیہ ناز

ابن صفی ایک نام نہیں عہد ہے، ان جیسی نایاب شخصیت آج کے دور میں تو ملنا بے حد مشکل ہے، ہم نے کبھی قلم نہیں اٹھایا لیکن آج پہلی بار ابن صفی کی عقیدت و محبت سے مجبور ہو کر ان کے بارے میں قلم اٹھانے کی جسارت کر رہے ہیں، ابن صفی پر لکھنا ہماری خوش نصیبی ہے۔

ہماری معلومات ان کے بارے میں بہت ناقص ہیں، نہ ہمارے پاس ان کے بارے میں جاننے کے ذرائع تھے اور نہ ہی شاید اب ہیں، کیوں نہیں ہیں یہ الگ داستان ہے، بس ان کے ناول پڑھنے کے بعد ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی ہمت کی ہے اگر کچھ غلطی ہو جائے تو آپ سب سے استدعا ہے درگزر کیجئے گا۔

"اچھے ہیں اس قدر کہ بھلائے نہ جائیں پھر

کچھ لوگ دھڑکنوں میں دھڑکتے ہیں عمر بھر"

یہ شعر سن کر بے اختیار ابن صفی صاحب ک یاد آئی تھی، ابن صفی صاحب آج بھی ہم لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، ان جیسا قلم کار شاید اب دوبارہ نہ ملے، اب تک کی زندگی میں سینکڑوں ناول پڑھنے کے بعد بھی ان جیسا قلم کار نہیں ملا، ہر قلم کار میں ان کی جھلکیاں ڈھونڈنے کی لاشعوری کوشش کرتے ہیں مگر کبھی تلاش ختم نہیں ہوئی۔

ابن صفی صاحب کے ناولوں میں منظر کشی، کردار نگاری، طنز و مزاح، زبان و بیان، اور مکالمے کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان کے طنز اور مزاح کی تو مثال ہی نہیں ملتی، جہاں سماج کی نفسیات پر ان کی دسترس ان کی علیست کی آئینہ دار ہے وہیں ان کے مکالمے اور کردار کی مثال ملنا بھی مشکل ہے، انہوں نے اپنے کرداروں کو اس نوعیت کا بنایا ہے کہ آج بھی لوگ ان کے دیوانے ہیں۔

ان کا ایک کمال تو یہ تھا کہ وہ جس دور یا جس عہد کی بات کرتے تھے جس شہر، جس گلی، جس مقام کو اور وہاں کی حالات کو صفحہ قرطاس پر ابھارتے تھے قاری کا ذہن بھی وہیں پہنچ جاتا تھا، وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بیگانہ ہو کر ناول میں غرق ہو جاتا تھا، ان کے مکالمے اور منظر کشی دیکھنے کے اعتبار سے اتنے مستحکم اور جان دار ہوتے تھے کہ قاری اسی شہر اور اسی عہد میں خود کو موجود پاتا تھا۔

ابن صفی خوش رو، خوش فکر اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے معاملہ جہم اور صاحب رائے انسان تھے، ان کے سانچہ ارتحال سے علمی و ادبی دنیا میں جو غلاء لپیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا ناممکن حد تک مشکل ہے۔
ابن صفی انسان دوست اور معاشرہ کا درد رکھنے والے انسان تھے، انسانیت ان کا مسلک تھا، ان کی سب سے بڑی خوبی ہماری نظر میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں مذہبیات کو نہیں کھینچا، جیسا کہ آج کل کے کچھ نام نہاد لکھاری اپنے ناولوں سے مذہبی دہشت گردی پھیلا کر معصوم اور کورے ذہنوں کو اپنی گھٹیا ذہنیت سے مسموم کر رہے ہیں۔

مذہب کا ذکر ان کے ناولوں بس اس قدر ہی ملتا ہے کہ وہ اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام چاہتے ہیں، ایک اللہ کی حاکمیت کے قائل ہیں، وہ اپنے ناولوں میں انسان اور انسانیت کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولز کا کوئی مذہب نہیں ہے، ان کے ناول ہر دور، ہر مذہب اور ہر معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔
ان کا مطالعہ اور معلومات اتنی گہری و عمیق تھی کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں ایسی ایسی مشینوں کا تذکرہ کیا جس کی ایجاد تو دور، تصور بھی محال تھا، ان کے ناولوں کے پلاٹ بہت عمدہ ہوا کرتے تھے، ایسے کہ بڑھنے والا اس میں کھو کر رہ جاتا تھا، ان کے تخلیق کردہ کردار بہت بلند ہوا کرتے تھے انہوں نے مجرموں کی بھی ایسی کردار سازی کی کہ پڑھنے والے کے دل میں ان کے لئے بھی نرم گوشہ موجود رہتا ہے۔

ان کے ناولوں میں ویسے تو بے شمار منفی کردار ملتے ہیں مگر سنگ ہی اور تھریسا جیسے مجرموں کی مثال ملنا مشکل ہے، ان کے کئی کردار ایسے ہیں جن کی موت پر بہت افسوس ہوتا ہے، مثال کے طور پر ناول علامہ دہشتناک کا منفی کردار شہزاد عرف علامہ دہشتناک، ناول لاشوں کا بازار کا کردار ڈاکٹر نارنگ عرف مشرکیو، اور ایڈلاڈ اسیریز کا مجرم کردار ایڈلاڈ۔

ابن صفی کی تخلیقات جس طرح ہماری ذہنی تربیت کرتی ہیں اس سے یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ناولز درس گاہ سے کم نہیں، یہ ایک اہل حقیقت ہے جسے ہم سب تسلیم کرتے ہیں۔

"زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستان کہتے کہتے"

لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کو اپنے پاس جلدی بلا لیتے ہیں، شاید اسی لیے ابن صفی صاحب کا ساتھ بھی ہم لوگوں کو بہت مختصر لگتا ہے، اللہ تعالیٰ ابن صفی صاحب کو خشت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔
آمین ثم آمین۔

دل سے نکلے ہیں جو لفظ

مریم کاشف

وہ شخصیت جن سے آپ بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے ہوں ان کے بارے میں کچھ لکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے، کچھ میں نہیں آتا کہ کہیں سے لکھنا شروع کیا جائے، کیونکہ وہ الفاظ ہی میسر نہیں جو اپنی پسندیدہ شخصیت سے میری محبت اور عقیدت کو بیان کر سکیں۔

سوچوں تو لگتا ہے جی واماں ہوں، لیکن ایک جھوٹی سی کوشش کرتی ہوں، میرے پاس بڑے بڑے الفاظ کا ذخیرہ نہیں جو میں ابن صفی جیسے گریٹ رائٹر کے لیے پیش کروں، ہاں خالص عقیدت اور محبت ضرور ہے۔

کچھ دن پہلے گروپ کی طرف سے انٹاکس منیج موصول ہوا کہ آپ کو ابنِ صفی پر کچھ لکھنا ہے، سوچا بھلا میں کیا لکھ سکتی ہوں، میں اس قابل نہیں کہ اتنے عظیم مصنف پر قلم اٹھاؤں، پھر سوچا کہ ٹھیک ہے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے ذریعہ اپنی عقیدت کو بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔

پہلے سوچا ابنِ صفی صاحب کی لکھی تمام کتابوں کا ریکارڈ وغیرہ جمع کر کے اس بابت لکھوں، پھر سوچا نیٹ سے کچھ مواد جمع کروں، ابو سے ذکر کیا تو ابو نے کہا بیٹا میرے پاس راشد اشرف صاحب کی کتاب ہے ابنِ صفی کے بارے میں، وہاں سے معلومات لے لو

میں نے کہا ٹھیک ہے ابو... مگر پھر دل نہیں مانا کہ نہیں جو بھی لکھنا ہے خود سے لکھنا ہے۔

مجھے یہ بات بتاتے ہوئے کافی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے عمران سیریز کا آغاز منظرِ کلیم کی عمران سیریز سے کیا، آج تک اس بات کا بچتا وہ ہے کہ عمر بہت کم تھی اور پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا، اس لئے جو بھی ملتا اسے پڑھ ڈالتی، ایک بار منظرِ کلیم کی عمران سیریز لے کر بیٹھی تو ابو کی نظر پڑ گئی، ابو نے سمجھایا کہ بیٹا پڑھتے ہوئے معیار کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہئے، یہ غیر معیاری کتابیں آپ کا مینٹل لیول بھی لو گر دیں گی۔

ابو کافی دیر تک سمجھاتے رہے، انھوں نے ابنِ صفی کی عمران سیریز کے متعلق بتاتے ہوئے کہا، دراصل عمران سیریز کے اصل خالق ابنِ صفی ہیں اس لئے آپ کو چاہئے کہ ان کے ناولوں کا مطالعہ کریں، اس دن میں پہلی بار ابنِ صفی کے نام سے متعارف ہوئی، ابو نے مجھے ابنِ صفی صاحب کی عمران سیریز کا پہلا ناول "خونِ فاک عمارت" پڑھنے کے لئے دیا۔

اس کتاب کا پڑھنا تھا کہ میری آنکھیں کھل گئیں، واللہ کوئی اتنا اچھا بھی لکھ سکتا ہے اتنا اچھا اتنا مختلف اور دلچسپ.....؟ اس کے بعد تو ابنِ صفی کے ناولوں کی ایسی لٹ لگی جواب تک قائم ہے۔

پہلی دفعہ میں نے ابنِ صفی کو 1998 میں پڑھا، جاسوسی دنیا بھی پڑھی، مگر عمران سیریز کے نشے نے یوں جکڑا کہ اس کے آگے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا،

1998 سے لے کر آج تک ہمیشہ ہر سال عمران سیریز نئے سرے سے پڑھتی ہوں اور مزے کی بات یہ کہ میرے میاں کا شیف زبیر بھی ہر سال بے حد شوق سے عمران سیریز پڑھا کرتے تھے، اور اس پر طویل ڈسشن بھی کیا کرتے تھے، ابنِ صفی وہ مصنف ہیں جن کو ہر بار پڑھ کر پہلی بار پڑھنے جیسا حرا آتا ہے۔

ابنِ صفی وہ حیرت انگیز مصنف ہیں جن کی کتابیں آج پڑھو تو لگتا ہے آج کل کے حالات کے تناظر میں لکھی گئی ہیں، یہ ابنِ صفی کا کمال تھا کہ ان کے ناولوں میں آئینہ مستقبل کی جھلکیاں ملتی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے وہ مستقبل میں ہونے والے تمام حالات دیکھ رہے ہوں اور ہمارے لیے تازہ بہ تازہ لکھ رہے ہوں۔

انھوں نے سائنسی موضوعات پر ایسا لکھا کہ اس وقت پڑھنے والے عیش عیش کراٹھے، اور اب ہم پڑھیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ واللہ ایسی جدیدیت.....؟ کمال کا عبور حاصل تھا انھیں اپنے فن پر، جو ایک باران کا اسیر ہوا وہ پھر بھی اس جال سے نہیں نکل پایا۔

میرا شمار عمران پسندوں میں ہوتا ہے، ایسا نہیں کہ میں نے فریدی سیریز نہیں پڑھی، مگر جو بات مجھے عمران میں نظر آتی ہے وہ فریدی میں نہیں۔

(فریدی پسندوں سے معذرت کے ساتھ)

عمران ایک ایسا کردار جس نے مجھے ہمیشہ بے حد متاثر کیا۔

ایک بات آپ لوگوں سے شیر کرنی چلوں، میرے شوہر کا شیف زبیر جاسوسی پبلیکیشن کے مشہور معروف رائٹر

تھے، ان کی طویل اور شامی و تیمور سیریز بہت مشہور ہوئی، ان تحریروں کو پڑھ کر ڈھائی سال پہلے ایک پبلشر نے ان سے رابطہ کیا اور کہا کہ آپ ہمارے لیے عمران سیریز لکھیں، انھوں نے پرکشش معاوضے کی آفر بھی کی، کاشف صاحب نے انھیں اسی وقت منع کر دیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے، مگر پبلشر صاحب نے سوچ کر جواب دینے کے لئے کہا۔

کاشف صاحب نے مجھ سے کہا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں لکھوں، میں اپنے پسندیدہ مصنف کے کرداروں پر لکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، یہ ابن صفی جیسے عظیم مصنف کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ ان کے کرداروں پر قلم اٹھایا جائے، میں ان لوگوں میں اپنا نام شامل نہیں کرانا چاہتا جنھوں نے ابن صفی کے عمران کی مٹی پلید کر کے اسے "عجیب و غریب" عمران بنا دیا ہے، میں اس بات کی گواہ ہوں کہ ان سے عمران سیریز لکھنے پر کتنا اصرار کیا گیا، مگر انھوں نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔

جب میں نے ابن صفی کو پڑھنا شروع کیا تو ایک خواہش دل میں جڑ پکڑتی گئی..... ان سے ملنے کی خواہش..... جب جب میں انھیں پڑھتی یہی سوچتی کاش ابن صفی زندہ ہوتے تو میں ان سے ملنے ضرور جاتی..... چاہے مجھے بس میں ہی کیوں نہ جانا پڑتا، میں بھی بس میں بیٹھی نہیں تھی، اس لیے بس بہت انوکھی سواری لگتی تھی، لہذا میرے نزدیک ابن صفی سے ملنے کے لئے بھی ایسی سواری سے بھی جایا جاسکتا تھا۔

پھر سوچا یہ خواہش پوری ہونا ممکن نہیں لیکن یہ خواہش تو پوری ہو سکتی ہے کہ جنت میں اپنے محبوب مصنف سے ملاقات ہو جائے اور میں اب بھی یہ خواہش رکھتی ہوں، اللہ پاک قبول فرمائیں، ان شاء اللہ وہاں ابن صفی صاحب سے خوب باتیں ہوں گی تمام کرداروں پر۔

کچھ سال پہلے سر احمد صفی صاحب فیس بک پر نظر آئے، پہلے تو ان کے نام نے چونکا دیا، پھر جب معلوم ہوا کہ آپ ابن صفی کے صاحبزادے ہیں تو حیرت و خوشی کا کوئی عالم نہ رہا، اپنے میاں کو بھی انتہائی خوشی سے اطلاع دی کہ آج فیس بک نے کیسی خوشی سے نوازا ہے کہ اپنے محبوب مصنف سے وابستہ لوگوں سے ملاقات کرادی۔

اس بات کا افسوس ہے کہ احمد صفی صاحب میرے گھر کے بالکل پاس رہتے تھے لیکن میں ان سے مل نہ سکی، دراصل مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ ہم سے اتنا نزدیک رہتے ہیں، یہ بات احمد صفی صاحب کے لاہور شفٹ ہو جانے کے بعد میری دوست حاجرہ ربیعان نے بتائی، میں کف افسوس ملتی رہ گئی کہ اگر حاجرہ مجھے پہلے یہ اطلاع دے دیتیں تو ہم سر احمد صفی سے ملنے جاتے..... خیر بار زندہ صحبت باقی۔

مجھے ابن صفی اتنے محبوب ہیں کہ میں انھیں بھی دعاؤں میں نہیں بھولتی، ہمیشہ ان کی مغفرت اور بلند درجات کی دعا کرتی ہوں، قرآن پاک ختم کروں تو ان کے لیے بھی ضرور دعا کرتی ہوں، یہ بات اس لیے بتائی کہ آپ لوگ بھی ضرور ان کے لیے دعا کیا کریں۔

سب نے بہت خوبصورت انداز میں ابن صفی کو خراج تحسین پیش کیا آپ تمام لوگوں کے سامنے میری تحریروں کی معنی نہیں رکھتی، بس کچھ دلی جذبات تھے جو میں نے بیان کر دیے۔

ابن صفی سے تعارف

فرحان خان

میں سائنس کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، مجھے بھی بھی اردو سے کچھ خاص رغبت نہیں رہی، دوستوں کے کہنے سننے پر کچھ شوق تو پیدا ہوا لیکن اچھی طرح عبور حاصل نہ ہو سکا، داغ نے اردو کے لئے شاید ٹھیک ہی کہا تھا:

"آئی ہے اردو زبان آتے آتے"

پھر ہوا یوں کہ میرا داخلہ یونیورسٹی میں ہو گیا، لیکن ابھی داخلے کا اردو سے کیا تعلق؟ ارے ہے تعلق..... ذرا صبر کیجئے اسی طرف آ رہا ہوں، ہاں تو جناب داخلہ ہو جانے کے بعد میرا واسطہ ایک ایسے ہم جماعت سے پڑا جو اردو کا دلدادہ تھا، میں اسے "کتابی کیڑا" (Bibliophile) سمجھتا ہوں اور آج بھی ہم سب اسے "اردو میڈیم" کہہ کر بلاتے ہیں۔

جی ہاں تو اسی "اردو میڈیم" دوست کے توسط سے میں ابن صفی سے روشناس ہوا، یہ میرا اردو زبان کی طرف پہلا قدم تھا، اس کے لیپ ٹاپ میں ابن صفی کے سارے ناول پی ڈی ایف میں موجود تھے، جب بھی مجھے وقت ملتا اس کے لیپ ٹاپ سے ابن صفی والا فولڈر کھول کر ناولوں کا مطالعہ شروع کر دیتا۔

رفتہ رفتہ میں نے سارے ناول پڑھ لئے، آپ سوچ رہے ہوں گے کیسا جیوٹ بندہ ہے کتابوں میں پڑھنے کے بجائے پی ڈی ایف میں ہی پڑھ ڈالا اور بورنگ نہ ہوا، دراصل بات یہ ہے کہ ہماری زیادہ تر درسی کتب پی ڈی ایف میں ہوتی ہیں اس لئے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔

ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے بارے میں تو کبھی لوگ جانتے ہیں، ہم میں سے اکثر کا یہی خیال ہے کہ ابن صفی صرف ناول نگار ہی ہیں اور ان کا ادبی سفر 1952 سے شروع ہوا، لیکن بعد میں جب طغزل فرغان، سکی سولجر اور اسرار ناروی سے متعارف ہوا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ سفر تو شاید 1948 سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔

یقیناً ابن صفی کے ناولوں (عمران سیریز اور جاسوسی دنیا) کی حد تک میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ برصغیر میں زیادہ پڑھے جانے والے ناول یہی ہیں، لیکن ایک بات افسوسناک ہے کہ ہم ابھی تک ان کی بانی تحریروں سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے، شاید یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم نئے لوگوں کو وہاں تک پہنچنے ہی نہیں دیتے، ان کو عمران سیریز اور جاسوسی دنیا میں ہی الجھائے رکھتے ہیں، یوں نئے قارئین کچھ نہایت ہی عمدہ تحریروں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ابن صفی نے جو پڑھا اسے کسی ناکسی صنف ادب (نظم، غزل، مضمون، افسانہ اور ناول وغیرہ) میں ہم تک پہنچانے کی کوشش کی، پھر چاہے وہ کرائم فکشن ہو، تھرلر ہو، سائنس فکشن ہو، نفسیات ہو، تاریخ ہو، فلسفہ ہو یا منطق۔

ان کا ناول "اب تک تھی کہاں" دیکھیں کہ کس طرح اس میں ایک نفسیاتی بیماری کو بیان کیا گیا ہے، جس کی تھک شاہی نقارہ میں بھی ملتی ہے (میں یہاں کرداروں اور کردار نگاری کا تذکرہ قصداً نہیں چھیڑوں گا، کیونکہ یہ بہت وسیع موضوع ہے، اس لئے اس چھوٹے سے مضمون میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا نیز یہ کہ اس پر لکھنے لئے اچھا خاصا وقت درکار ہے)

طنز و مزاح میں "تزک دو پیازی" اور "پرنس چلی" کو دیکھیں، صرف طنز کا لطف لینا چاہتے ہیں تو "ہم شریف لوگ"، "شیر کا شکار"، "شیطان صاحب" اور ان جیسے کئی مضامین دیکھے جاسکتے ہیں، "شکرال کے جیلے" اور "ساڑھے پانچ بجے" جیسے افسانوں کا نام بھی اس ضمن میں لیا جاسکتا ہے۔

مجھے شعر شاعری کی بالکل شد بد نہیں، اس لئے معذرت.....! البتہ فلم دھا کہ کے لئے لکھی گئی غزل

"راہ طلب میں کون کسی کا"

کانوں میں رس مگھوتی رہتی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر میں فی زمانہ ابن صفی کی وجہ شہرت "عمران سیریز" کو سمجھتا ہوں، اور اس سے بھی زیادہ "ابن صفی کے نقالوں" کو، دیکھنے برامانے کی ضرورت نہیں، میں سیدھا سادہ شریف انسان ہوں، اس لئے جو کچھ بھی سمجھا ہے اس کا اظہار کر رہا ہوں، تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں، زرا اٹھنڈے دل سے یہ ڈنڈا اور پتھر سائیڈ پر رکھ کر پوری بات تو سن لیں..... جی ہاں تو میں کہتا تھا کہ نوجوان نسل کی اکثریت انہیں نقالوں کی وجہ سے ابن صفی تک پہنچتی ہے، کم از کم پاکستان کی حد تک تو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کو کئی ایسی کہانیاں ملیں گی جس میں لوگ کسی ناکسی نقال کی وجہ سے ابن صفی تک پہنچے، آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ میں خواہ مخواہ نقالوں کا تذکرہ نکال کر آپ کو بار بار تاؤ دلانے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے، نقالوں نے اپنی تعریف کرانے کے لئے مجھے کوئی رشوت وغیرہ نہیں دی ہے، یقین نہ ہو تو آپ اپنی جیب دیکھ لیجئے، جی ہاں دیکھئے ڈنڈا زرا مجھ سے دور رکھئے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے، بار بار ڈنڈا اٹھا کر دھکائے میں آپ کے بارے میں یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ کہیں آپ کا تعلق انہیں میں سے تو نہیں ہے جو بھینس کے آگے بین، بجا کر خود کو عقل مند ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب بات نقالوں کی چھڑ گئی ہے تو آپ کو یہ بھی بتانا چلوں کہ ہر کوئی مجھ جیسا خوش نصیب نہیں ہوتا ہے، اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا کا ہے کی خوش نصیبی؟ تو سنئے جناب جنہیں نقالوں کو نہیں پڑھنا پڑتا وہ خوش قسمت ہی ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں خوش قسمت ہوں، لیکن ابھی میری بات ادھوری ہے، کچھ لوگ مجھ سے بھی زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں، یقیناً اب آپ سچ سچ مجھے یاد ڈالنے کے نادر و نایاب طریقوں پر غور کر رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا آدمی ہے یہ جو خواہ مخواہ تجسس پھیلا کر آپ کا وقت برباد کر رہا ہے، آپ کا غصہ بجا ہے، لیکن آپ نے یہ بھی سن رکھا ہوگا کہ زیادہ تاؤ کھانے سے لیریا ہو جاتا ہے اس لئے تاؤ کھانے کے بجائے میری پوری بات توجہ سے سن لیجئے، ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا، خوب یاد دلایا، آج کل دھینا اور پودینہ نایاب ہو گئے ہیں، ویسے تو ان کی کئی نادر و نایاب قسمیں پائی جاتی ہیں لیکن دیسی دھینا اور پودینہ کی بات ہی زرا لی ہے، میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ پودینہ کی چٹنی گرمی دماغ کو مفید ہے، ہا ہا ہا..... میں سمجھ گیا آپ یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ پھر پودینے کی چٹنی میں خود ہی کیوں نہیں کھا لیتا، خیر مجھے آپ کی سوچ پر کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ سوچنے کو تو یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ میں دنیا کے بجائے مریخ یا مشتری پر کیوں پیدا نہیں ہوا۔

دیکھئے یہ میرا تصور بالکل نہیں ہے، آپ لوگوں نے ہی مجھے ڈنڈا دکھا دکھا کر موضوع سے بھٹکایا ہے ورنہ میں تو خوش نصیبوں کی تیسری قسم بتانے کے لئے بالکل تیار تھا، جی ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت لوگ وہ ہیں جن کو یہ ناول ورثہ میں ملے، اور ان سے بھی بڑے خوش نصیب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابن صفی کے زمانے کو دیکھا اور ان کے ناولوں کے پہلے ایڈیشن کو پڑھا اور ابن صفی کے مقام کے معترف ہوئے۔

یقیناً وہ لوگ خوش نصیب ہیں جنہوں نے ابن صفی کے دور کو دیکھا، ان کے ناولوں کے انتظار میں شب و روز کاٹے، اور ان کو کسی خزانے کی طرح جمع کر کے سنبھال کر رکھا اور آئندہ نسل تک پہنچایا۔

یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات اور بھی قابل غور ہے، عمران سیریز کو اس مقام تک پہنچانے کے لئے جاسوسی دنیا نے جس میسر می کا کام کیا، اس کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا نا انصافی ہوگی، آپ شاید اس بات سے متفق نہ ہوں لیکن حق بات کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں، اگر بھیا تک آدمی جاسوسی دنیا کے ناول کے ٹوکڑ پر نہ چھاپا جاتا تو شاید آج کوئی عمران سیریز کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا۔

عمران پسندوں کو تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں ہے، جی ہاں یہ ایسا کوئی بہت بڑا انکشاف نہیں ہے جو میں نے کیا

ہے، یہ بات تو تقریباً سبھی لوگ جانتے ہیں کہ عمران سیریز جاسوسی دنیا کے کئی سال بعد آئی تھی، اس سے پہلے صرف جاسوسی دنیا کا ہی ڈنکا بجاتا تھا، میرا مطلب ہے جاسوسی دنیا کا ہی طوطی بولتا تھا، ویسے اگر آپ کا دل چاہے تو طوطی نامیں لائیں کرتا تھا بھی سمجھ سکتے ہیں، میری صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔

ایک بات صاف طور سے بتادینا چاہتا ہوں نہ تو میں عمران سیریز کی برائی کرتا ہوں اور نہ ہی جاسوسی دنیا سے مجھے کوئی میر ہے، اس معاملہ میں مجھے بالکل غیر جانبدار سمجھا جائے، مجھے ابن صفی کی ایک ایک تحریر سے محبت ہے، یقیناً نہ ہو تو میرے دماغ کا مشینی تجزیہ کر کر دیکھ لے، تجزیہ کرانے کے جملہ اخراجات نقالوں کے فیفر کے ذمہ، ارے ہاں ایک بات تو بھول ہی گیا، ویسے اس میں کسی کا تصور نہیں، میں نے تو بس یہ بات ایسے ہی اڑتے اڑتے سن لی تھی کہ شاید انڈیا میں عمران سیریز جاسوسی دنیا کے تحت ہی شائع ہوتی تھی۔

دیکھئے دیکھئے، ادھر کونے میں بیٹھے کچھ لوگ میرے اوپر دانت میس رہے ہیں..... میں جانتا ہوں یہ کون لوگ ہیں..... خیر جانے دیجئے میں ان کا نام لیکر اپنی عاقبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

اب پھر سے آتے ہیں ایک نئے موضوع کی طرف، آپ کے ذہن میں سوال آ سکتا ہے کہ ابن صفی کے ناولوں میں کیا انفرادیت ہے؟ ہمیں ان کے ناولوں کا مطالعہ کیوں کرنا چاہئے؟ یہ سوال کوئی ایسے زیادہ مشکل نہیں ہیں جن کا جواب تلاش کرنا تکلیف دہ ہو، آپ خود ہی سوچئے..... نہیں سوچ سکتے..... میں جانتا ہوں..... آپ تو اس وقت ڈنر کے خیال میں مگن ہوں گے، خیر..... مجھ سے سنئے، یہاں ایک آدھ نکتہ بیان کرنے کے بعد میں بھی اجازت چاہوں گا..... بھئی ڈنر کے خیال میں مگن ہونے کا مجھے بھی حق حاصل ہے، بھلے ہی وہ اہلی ہوئی ترکاریاں ہی کیوں نہ ہوں۔

ابن صفی کے ناول پڑھ کر آپ اس دور کا تصور کریں جب مواصلات کا نظام اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا، اور نا ہی علاج..... میں موجود سٹیٹلائٹ سے ٹھہرائی کی جاسکتی تھی، ایک دوسرے سے رابطہ کرنا اتنا آسان نہیں تھا، یہ سلسلہ تو بہت بعد میں شروع ہوا، ذرا سوچیں جب ایس ایم ایس اور ای میل نہیں ہوتے تھے تو معلومات بھیجنے اور وصول کرنے کے لئے کیا کیا طریقہ استعمال کئے جاتے تھے..... اس دور میں جب کمپیوٹر اتنے ترقی یافتہ نہیں ہوتے تھے کہ ان کو کوئی جیب میں (سارٹ فون کی شکل میں) لئے گھومتا پھرے، یاد کریں جب قاصد پیغام رسانی کرتے ہوئے تل کر دیئے جاتے تھے، موبائل نیٹ ورک نا ہونے کے سبب لاسکی رابطے کا واحد ذریعہ ٹرانسمیٹر سمجھا جاتا تھا، فون نمبر (لینڈ لائن) پہچان کا ذریعہ بنتے تھے، بعض لوگ (عمران سمیت) اپنا الگ ای پیج اسی مقصد کے لئے قائم کرتے تھے تاکہ پہچانے نہ جاسکیں، اس دور میں کوئی بھی انسان دو تاروں کو ایک ہی ریسپور سے جوڑ کر آپ کا نمبر ہائی جیک کر سکتا تھا۔

شاید بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہو، خیر کوئی بات نہیں، جب دماغ میں ڈنر کا حسین تصور گھس جائے تو ایسی پر مغز باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، لہذا اس کو سمجھنے کے لئے بعد از ڈنر تشریف لائیں، ورنہ سمجھ کے پھیر میں آپ بچ اور ڈنر کا فرق بھی بھول سکتے ہیں۔

جی ہاں، یہ تو ہونی صرف جاسوسی کی بات، اسی طرح سائنس فکشن، جغرافیہ، دوسرے ممالک کے تہذیب و تمدن اور نفسیات پر بھی ابن صفی نے خوب لکھا، انھوں نے جاسوسی ناول نگاری کا آغاز جس مقصد کے لئے کیا، ہمیں وہ نہیں بھولنا چاہئے، جی ہاں آپ بالکل ٹھیک سمجھے میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ ابن صفی کے لکھنے کا مقصد ادب اور بالخصوص سری ادب سے جنسیت کا خاتمہ تھا۔

انہوں نے اس دور میں یہ کام کیا جب ادب میں ماہر القادری، شوکت تھانوی، منٹو، عصمت چغتائی اور وہی

دہانوی جیسے لکھاریوں کا عروج تھا اور سری ادب کے نام پر دستیاب انگریزی تراجم میں بھی جنسیت کا ترکا ہوتا تھا (بے شک جیمز بانڈ کے ناولوں کو دیکھ لیں)، منہو عصمت چغتائی و دیگر کی تحریروں میں سے پھر بھی کچھ سبق نکل آتا ہے لیکن کچھ ذہنوں کے لئے وہ پھر بھی وہ زہر قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب تک مناسب رہنمائی نہ ملے تو بھلا ایسے ہیجان خیز ادب سے لوگ کیا عبرت پکڑیں گے...؟ بلکہ وہ تو مزید بے ادب ہو جائیں گے، وہ سماج جہاں مذہبی کتابوں سے بھی لطف اٹھالیا جاتا ہو ایسے لغو ادب کو پیش کرنے کی منہاجش نکالی جاسکتی ہے.....؟ ہرگز نہیں کسی قیمت پر نہیں.....!

ایسے پرفتن دور میں صاف سحر ادب متعارف کروانا جو ان تمام فضولیات سے پاک ہو ایک جرات مندانہ فیصلہ تھا، ہم سب کو اس کے لئے ابن صفی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ہمیں معیاری ادب پڑھنے کے لئے دیا۔ ابن صفی نے جنسیت کے متبادل کے طور پر مزاح کو چنا اور اسی کے ذریعے اپنے ناولوں کو مقبول بنایا، لوگوں کے دماغ میں جڑ پکڑ چکی اس بات کو غلط ثابت کیا کہ صرف فکاہ اور دھمی ناول اکہائیاں ہی ذہن میں جگہ بنا پاتی ہیں، مجھے کہنے دیجئے کہ ان ناولوں کو محض ذہنی عیاشی کے طور پر بھی نہیں پڑھنا چاہیے، اس میں ہمارے یکھنے کے لئے اب بھی بہت کچھ ہے، ان ناولوں میں آپ ٹھوڑا بہت فارن انفیروز کی جھلک دیکھ سکتے ہیں، خفیہ انجینسیوں کی مختلف اقسام کے بارے میں آپ کو پتہ چلتا ہے، ان کی اقتدار و اختیار کو لے کر آپسی چپقلش کا علم ہوتا ہے اور بھی بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔

ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جو ابن صفی کے ناول پڑھنے سے پہلے اس قسم کی معلومات سے بے بہرہ رہے ہوں گے، ان ناولوں کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انجینسیوں کی آپس میں مدد کے کیا طریقہ کار ہوتے ہیں؟ یا یہ کہ اگر ایک ایجنٹ بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو اس کا سدباب کیسے کیا جائے؟ سیکریٹ سروس محض سات آٹھ اشخاص پر مشتمل ٹیم کا نام نہیں بلکہ ایک جال (نیٹ ورک) کا نام ہے جس سے منسلک لوگ وقت آنے پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

بے شک ناول نگاری ایک ایسا میدان ہے جہاں پر کچھ معاملات میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، انسانی ذہن بھلا سکتی باتیں یاد رکھ سکتا ہے اس لئے بھول چوک کا امکان بہر حال رہتا ہے، بے شک ابن صفی کے ناولوں میں ایسی ہی کچھ ایک خامیاں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن فی الحال ہمارا یہ موضوع نہیں اس لئے ہم اس پر بات نہیں کریں گے، وقت ملا تو اس پر پھر بھی گفتگو ہوگی۔

ایک پوری سیریز کو بغور دیکھیں تو کسی حد تک یہ سب معمولی باتیں لگتی ہیں، لیکن جو کچھ بھی اس میں بتایا جاتا ہے اس سے ہر حال میں ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا ہے، مہینہ یا ابن صفی کا کمال تھا کہ اتنی بڑی بڑی سیریز لکھ دینے کے باوجود ان کے ناولوں میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا، بہت زیادہ باریک بینی سے اگر کوشش کی جائے تو ایک آدھ غلطیاں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔

ابن صفی کے مقام کا تعین کرنا مجھ جیسے نوآموز قاری کے لئے ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے، بات کہاں سے نکلی اور کہاں پہنچ گئی، اس کے لئے صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ یہ موضوع ہی اتنا وسیع ہے کہ اس پر بات شروع کی جائے تو کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

آج جو کچھ لکھ سکا (تنقیدی، تحریری یا محض بکواس) اس کا کریڈٹ اردو میڈیم کو جاتا ہے، کیونکہ یہ مضمون ہماری چند نشستوں اور بحث کے نتائج کا مرہون منت ہے۔

ویسے اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میری اردو ابن صفی کے ناولوں کی بدولت ہی کسی قابل

ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں اردو، لہذا یہ مضمون پسند آئے تو آپ ہم تینوں کو دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

ابن صفی۔ ایک درخشاں ستارہ

کوثر اسلام

1951 کے اواخر کا ایک خوشگوار دن تھا۔ چند بے تکلف ادیب دوستوں کی محفل جی ہوئی تھی، اردو ادب موضوع گفتگو تھا، دوستوں میں سے کسی نے کہا کہ اردو میں صرف خوش نگاری ہی مقبولیت حاصل کر سکتی ہے، ایک نوجوان ادیب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی لکھنے والے نے خوش نگاری کے اس سیلاب کو اپنی تحریر کے ذریعہ روکنے کی کوشش نہیں کی ورنہ یہ سیلاب نہ جانے کب کا تھم چکا ہوتا، اس پر دوستوں کا موقف تھا کہ جب تک بازار میں اس کا متبادل دستیاب نہیں ہوگا لوگ یہی کچھ پڑھتے رہیں گے، نوجوان ادیب نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا متبادل پیش کرے گا، اور پھر جلد ہی جو کچھ اس نوجوان ادیب نے کہا تھاج کر دکھایا، دوستوں کی محفل میں بلند بانگ دعوے کرنے والے اس نوجوان کو دنیا آج ابن صفی کے نام سے جانتی ہے۔

ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا، آپ 26 جولائی 1928 کو الہ آباد، اتر پردیش کے ایک گاؤں نارائیں صفی اہل؟ کے گھر پیدا ہوئے، آپ کی والدہ کا نام نصیراء لہ بی بی تھا، اردو کے مشہور شاعر نوح ناروی رشتے میں آپ کے ماموں کہتے تھے۔

ابتدائی تعلیم نارائیں صفی کے پرائمری اسکول میں حاصل کی، اس زمانے میں عموماً زمینداروں کے بچے پرائمری یاڈل پاس کر کے بیٹھ جاتے تھے، ان کے والدین کا خیال تھا کہ ہمارے بچے کو کون سا نوکری کرنا ہے جو بی اے، ایم اے کرے، لیکن ابن صفی کی والدین کا خیال تھا کہ؟ بچہ چاہے نوکری کرے یا نہ کرے اسے ہر حال میں اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔

اس وجہ سے مزید تعلیم کے لیے آپ کو شہر بھیج دیا گیا، میٹرک آپ نے ڈی اے وی اسکول الہ آباد سے پاس کیا، جبکہ انٹر الہ آباد کے ایونک کرچن کالج سے کیا، 1947 میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا، اسی اثناء میں برصغیر میں آزادی کے ہنگامے شروع ہو گئے، ہنگامے فرو ہوئے تو تعلیم کا ایک سال ضائع ہو چکا تھا، لہذا بی اے کی ڈگری جامعہ آگرہ سے یہ شرط پوری کرنے پر ملی کہ امیدوار کا عرصہ دو برس کا تدریسی تجربہ ہو۔

اگست 1952 میں آپ اپنی والدہ اور بہن کے ہمراہ پاکستان آ گئے، جہاں ان؟ دن نے کراچی کے علاقے لالوہیت کے سی ون ایریا میں 1953 سے 1958 تک رہائش اختیار کی، ان کے والد 1947 میں پہلے ہی کراچی آ چکے تھے۔

ابن صفی کے والد کو مطالعے سے دلچسپی تھی لہذا گھر میں ناولوں اور قدیم داستانوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، لیکن ابن صفی کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی، آپ چوری چھپے کوئی کتاب اٹھاتے اور کھیلنے کے بہانے نہت پر نکل جاتے، ایک دن ان کی چوری پکڑی گئی، والدین میں بحث ہوئی اور فیصلہ آپ کے حق میں ہوا۔

جب آپ ساتویں کلاس میں تھے تو آپ نے ایک افسانہ لکھا اور اسے ہفت روزہ؟ "شاہد" "محب" میں چھپنے کے لیے بھیج دیا، جناب عادل رشید اس جریدے کے ایڈیٹر تھے، ان؟ دن نے افسانہ کی پمٹی کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھا کہ وہ کوئی معمر آدمی ہیں، اس لئے ان کے افسانہ کے ساتھ یہ جملہ لکھ دیا۔

"بچہ؟ فکر مصور جذبات حضرت اسرار ناروی"

1948 میں ماہنامہ کھیت الہ آباد میں طغرل فرغان کے نام سے لکھنے لگے، متعدد طنزیہ مضامین اور افسانے لکھے، کچھ پیر وڈز بھی لکے ہیں، لیکن وہ اس سب سے مطمئن نہیں تھے، کچھ اور کرنا چاہتے تھے، چنانچہ دوستوں کی محفل میں وہ واقعہ پیش آنے کے بعد انھوں نے ابن صفی کا قلمی نام اختیار کیا اور مارچ 1952 میں اسپنلر فریدی اور سر جنت حمید کے کرداروں پر مشتمل جاسوسی دنیا کا پہلا ناول "دلیر مجرم" لکھا، اس ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اگست 1955 میں "خوفناک عمارت" کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا، کردار میں ایسا جادو تھا کہ جس نے بھی ان کے ناول پڑھے ان کا دیوانہ ہو گیا، کچھ ہی عرصے میں فریدی اور حمید کی طرح عمران کا کردار بھی مقبولیت کی بلندی پر پہنچ گیا۔

عمران اور کرنل فریدی پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو زبان کی جرمن اسکا لڑا کٹر کرشننا اویسٹر ہیملڈ کہتی ہیں کہ "ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے کردار 'فریدی' اور 'عمران' کبھی کسی عورت کی جانب نگاہ بدپ کرتے تو کھائی نہیں دیتے۔"

ابن صفی کے ان دو مشہور زمانہ کرداروں کے بارے میں بھی تھوڑی سی بات کر لیتے ہیں، عمران کا پورا نام علی عمران ہے، یہ حضرت ڈاکٹر (بی ایچ ڈی) ہیں اور اردو کے سب سے زیادہ مشہور جاسوسی پیر وڈز ہیں، ان کی حقائق اور تنجیدگی دراصل انسانی ضمیر کے دورخ ہیں۔

کرنل فریدی کا پورا نام احمد کمال فریدی ہے، یہ صاحب عمران سے عمر میں چند سال بڑے ہیں، عمران کی طرح یہ بھی ڈاکٹر (بی ایچ ڈی) ہیں، ان کے والدین حیات نہیں، ان کا تعلق ایک اعلیٰ نواب خاندان سے ہے، یہ مزاجاً تنجید؟ مگر انتہائی نرم دل و دلکش فرد ہیں، اپنے مضبوط ارادوں اور اصول کا پابند ہونے کی وجہ سے تنجید؟ وہ نہیں لوگوں میں عمران سے زیادہ مقبول ہیں۔

ابن صفی نے لگ بھگ 250 ناول لکھے، آپ کے فن کو سراہنے والوں میں بابا اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر بخون گورکھپوری، محمد حسن عسکری، کالم نگار حسن نثار، شاعر امجد اسلام امجد، صحافی و ادیب قاضی اختر جوناگڑھی، فیملڈ مارشل ایوب خان اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسی شخصیات شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے محقق و ادیب راشد اشرف کے نام 2009 میں اپنے ایک پیغام میں انکشاف کیا کہ جن دنوں وہ بڑا امیدان ناظم آباد کراچی کے قریب رہا کرتے تھے ابن صفی کے ناول ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ ابن صفی کے فن کا اعتراف کرنے والی مغربی شخصیات میں خاتون ناول نگار اگاتا کرسٹی، اردو زبان کی جرمن اسکا لڑ کرشننا اویسٹر ہیملڈ اور ناروے میں پروفیسر فن مچسن شامل ہیں۔

کرشننا اویسٹر ہیملڈ کے بقول "ابن صفی کے جاسوسی ناول کی جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے الوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے، اس لیے اسے محض تفریحی ادب نہیں کہا جاسکتا، ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت کے مواقع بھی پوری طرح موجود ہوتے ہیں۔"

سہیل اقبال کے مطابق وہ ایک روز ابن صفی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، یہ 1965 کی بات ہے، رضی اختر شوق اور روزنامہ حریت کے اے آر ممتاز بھی تھے، جاسوسی لٹریچر کی بات چٹنکی تو شوق صاحب نے بتایا کہ پچھلے دنوں اگاتا کرسٹی کہیں جاتی ہوئی کراچی ایئر پورٹ سے گزری تھیں، کچھ لوگوں کو پہلے سے علم تھا کہ وہ کچھ دیرونی آئی بی لاؤنج میں قیام کریں گی، اس لیے وہ ان سے ملنے گئے، کسی نے جاسوسی لٹریچر کا ذکر کیا تو مسکرائیں اور بولیں۔

"برصغیر میں صرف ایک اور بجٹل جاسوسی رائٹر ہے اور وہ ہے ابن صفی، باقی سب اس کے نقال ہیں، کسی نے

بھی اس سے ہٹ کر کوئی نئی راہ؟ نہیں نکالی۔"

1960 سے 1963 تک آپ انفصام کے مریض رہے، آپ کو اپنے ناول کے کردار مجسم شکل میں نظر آتے۔ آپ ان کے ساتھ باتیں کرتے، آپ کو لگتا تھا کہ عمران اور کرنل فریدی آپ کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ 1963 میں آپ حکیم محمد اقبال حسین کے علاج کی مدد سے نہ صرف اس مرض سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوئے بلکہ عمران سیریز کے بہترین ناول ڈیڑھ متوالے کے ہمراہ جاسوسی ادب کے میدان میں پوری توانائی کے ساتھ دوبارہ قدم رکھتے ہوئے اپنے بدخواہوں کو کچھ یوں للکارا.....

"کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے!

پھر تھکنے لگے سیو آؤ"

ابن صفی کے ناولوں کی مقبولیت اور دوسروں سے ممتاز ہونے کی کئی وجوہات ہیں، جن میں سرفہرست مقصدیت ہے، ہر ناول میں کوئی نہ کوئی مشن یا مقصد ضرور ہوتا ہے۔

دوسری بات آپ کے ناولوں کا مرکزی خیال ہمارے معاشرے کا کوئی واقعہ (خصوصاً جرم سے متعلق) ہوتا ہے، آپ پیشرس میں ہمیشہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام اور پاکستان کا چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔ مرکزی خیال میں آپ مجرم کو خوف خدا سے عاری دکھاتے ہیں، مجرم قاتل، اسمگلر اور غدار قسم کے لوگ ہوتے ہیں، معاشرے کے ان ناسوروں کو آپ عمران اور فریدی کے ذریعے ختم کرتے ہیں۔

تیسری بات آپ کی کردار نگاری ہے، ابن صفی کا ہیرو ہر قسم کی جسمی آلودگیوں سے پاک ہے، کردار اور قوت ارادی کا انتہائی مضبوط ہے، جدید و قدیم علوم اور زبانوں پر دسترس رکھتا ہے، قانون کا محافظ ہے، اس کے علاوہ آپ کی تکنیک، زبان، معیار، ادب اور واقعات ناول نگاری بھی بے مثال ہیں۔

آپ نے اپنے ناولوں کے ذریعہ نوجوانوں کی علمی اور ذہنی تربیت کی، آپ کے ناولوں ہی کا اثر تھا کہ بہت سے نوجوان جنس زدہ ہونے سے بچ گئے۔

ابن صفی 1970 میں پاکستانی انٹینس ایجنسی ISI آئی۔ ایس۔ آئی کو جاسوسی کے حوالے سے غیر رسمی مشاورت بھی دیتے رہے۔

1979 میں آپ بیمار ہوئے معائنے سے پتہ چلا کہ آپ کو کینسر ہے، علاج سے بیماری تو کم ہو گئی لیکن جسم میں متواتر خون کی کمی واقع ہونے لگی۔

24 جولاء 1980 کو آپ کو بخار ہو گیا، جورات ہوتے ہوتے بہت بڑھ گیا، اگلادون جمعہ کا تھا، چھٹی کی وجہ سے ڈاکٹر کا ملنا مشکل تھا، باہم مشورے سے ڈاکٹر رحمان کو بلا لیا گیا، جب ڈاکٹر صاحب آئے تو بخار بہت تیز ہو چکا تھا، سانس اس قدر تیز چل رہی تھی کہ بولنا دشوار تھا، جب ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے لیے آستین سر کاٹی تو ان؟ وں نے منع کیا اور کہا "میرے بازو اب مزید مت چھیدو" ڈاکٹر نے پاؤں کی رگ میں انجکشن لگایا، جس سے ان کی طبیعت کچھ بہتر ہو گئی، شام کو حسب معمول ملاقات کے لیے لوگ آئے تو تیز بخار کے باوجود ان سے بات چیت کرتے رہے۔

رات کو ڈیڑھ بجے کا عمل تھا، گھڑیاں دیر ہوئے 26 تاریخ کا اعلان کر چکی تھیں، آپ کو بیت الخلاء لجانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حیران کن طور پر اٹھے اور کمرے سے متصل باتھ روم گئے، حالانکہ سارا دن کمزوری کی وجہ سے باتھ تک نہ اٹھتا تھا۔

باتھ روم سے واپس آئے تو سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی، بقول احمد صفی آپ نے بھیا کو بلایا کہ پیٹھ سہلا

دیں، امی نے فوراً بھیا کو جگایا، جب وہ پیٹھ سہلار ہے تھے تو ابو نے کہا "تا حق تم لوگوں کو آدھی رات کے وقت تنگ کر رہا ہوں، میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے تھوڑی دیر میں اچانک تکلیف میں مزید اضافہ ہو گیا، سانس اور بھی تیز چلنے کی وجہ سے پورا پٹنگ ہل رہا تھا، امی اور بہنیں گھبرا کر رونے اور دعائیں مانگنے لگیں، بھیا روتے جاتے اور ابو کو جھوڑتے جاتے تھے، افتخار گاڑی لے کر ڈاکٹر کو لینے گئے۔ بھیا اور مجھ میں ابو کے پاس سے ہٹنے کی ہمت نہیں تھی، امی اور بہنیں ہانگوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں، اچانک ابو نے زور سے سانس لی اور ان کے چہرے کا کرب یکسر دور ہو گیا، وہ بالکل پرسکون ہو گئے۔

26 جولائی 1980 بروز ہفتہ اپنی سالگرہ کے دن آپ کو پاپوش نگر قبرستان کراچی میں سپرد خاک کیا گیا۔

ابن صفی۔ ایک عہد ساز شخصیت

جوہر عباس

عمو مادرِ پاک کے بہاؤ کے خلاف تیر یا مشکل ہوتا ہے اور اگر طفیلی بن بھی ہو تو یہ مرحلہ مشکل ترین بن جاتا ہے۔

1928 کی جولائی کے تیسرے دن میں قصبہ نار، ضلع الہ آباد میں پیدا ہونے والے اسرار احمد نے جب اپنے دوست مجاور حسین رضوی سے سنا کہ فی زمانہ جنسیات پر کھلے ہندوں لکھنا ہی کامیاب رائیٹر بننے کی ضمانت ہے تو انہوں نے کہا کہ کس نگاری کا سہارا لیے بغیر بھی کامیاب تخلیق کار بنا جاسکتا ہے۔

اور پھر اس کم سن مہار بھی ۳۲ سال کی عمر میں پہلا باضابطہ ناول "دلیر مجرم" لکھا جس نے الہ آباد کی سرحدیں توڑتے ہوئے پورے ہندوستان سے داد و تحسین بڑھاتے ہوئے لاکھوں قارئین پیدا کر کے دھوم مچادی۔

اور یہ باقاعدہ عہد سازی کے سفر کی ابتداء لکھی، ورنہ آغاز تحریر کے ڈاڈے تو ماہنامہ نہت الہ آباد، 1948 سے جاملتے ہیں۔

اسی ناول کی اشاعت کے بعد اس مفروضے کا بھی خاتمہ ہوا کہ یا لکھاری جنسی جہتوں کو ابھارے یا انگریزی سے ترجمہ کرے بھی قاری پیدا کر سکتا ہے، خصوصاً جاسوسی ناول کے شعبے میں شش تیر تھرام فیروز پوری کے تراجم تھے اور بس۔

ابن صفی نے جاسوسی ناولوں کے علاوہ دوسرے قلمی ناموں سے افسانے، غزلیں اور مزاحیہ تحریریں بھی بطور یادگار چھوڑی ہیں، جن میں طغزل فرغانہ اور سگی سو لجر قابل ذکر ہیں، اور یہ دو قلمی نام بھی اس حد تک قوی تھے کہ ابن صفی کو حکومتی پابندیوں کی زد میں لاکھڑا کیا، مجبوراً ابن صفی کو 1952 میں پاکستان جانا پڑا۔

ابن صفی کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف ناول ہی نہیں لکھے بلکہ ناول کے ذیل میں انہوں نے استعارہ کی نئی چالوں، بڑی قوتوں کی عالمی دہشت گردی اور منافقت کا پردہ جس طرح سے چاک کیا اس سے وہ روسو اور رائے پیری سے کم نظر نہیں آتے۔

مشرق کے معاشرتی اقدار کو عالمی منظر نامے پر ایک قابل احترام مقام دلانے کے لئے اقوام مشرق کو ابن صفی کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

کون ہے جس کی تحریریں اسکوئی لڑکوں سے لے کر گورنر جنرل تک کی نظر میں یکساں طور پر اہمیت رکھتی ہوں؟ کون ہے جس کی کتابیں پڑھنے کے لیے لوگ اس کی زبان کو سیکھنے کی خواہش اور کوشش کریں؟ کون ہے وہ جس کی تحریروں کے اشتیاق میں لوگ اشاعت کی تاخیر پر خود اسی سے ناراض ہو جائیں؟ کون ہے وہ جس سے اعلیٰ جنس ایجنسیاں مشاورت کریں؟ کون ہے وہ جس نے ایک پست اور غلام قوم کے افراد کے دماغ میں یہ خیال ڈالا کہ وہ

بھی بڑی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں؟

وہ بڑا نام تاریخ برصغیر میں "ابن صفی" کا ہے۔

ابن صفی کا مکمل کارنامہ بقول خود اگلے 1955 میں "خونفک عمارت" کے ذریعہ عمران کی تخلیق ہے، ورنہ کرنل احمد کمال فریدی کے کردار والے ناول "دلیر مجرم" کو انہوں نے انگریزی ناول سے متاثر بنایا، بقول اگلے 8 ناول دوسری زبانوں سے متاثر ہیں، جبکہ بقیہ ناول سب ان کی اپنی تخلیق ہیں۔

ابن صفی کے مغربی شخصیات کے مداحوں میں خاتون ناول نگار اگاتا کرشی، اردو زبان کی جرمن اسکالر خاتون کرستینا اویسٹر ہیملڈ اور تارو مجھین پروفیسر فن حصین شامل ہیں، بقول اگاتا تھا: میں اردو نہیں جانتی مگر یہ جانتی ہوں کہ اردو میں ایک ہی اور بجل تخلیق کار ہے ابن صفی۔

ابن صفی نے سات برس کی عمر میں طلسم ہوشربا کی ساری جلدیں ختم کر لی تھیں، پھر اس کا اثر تو آتا ہی تھا، وہ اپنی کہانیوں میں خوب خوب طلسم پیدا کرتے ہیں، ان کی قوت مشاہدہ کے باجود ستانہ استعمال سے یہ زندہ طلسمات سائنس فکشن لگتی ہے، عمران کا کردار کسی بھی طرح عمر و عیار سے کم نہیں ہے، بس انداز ایسا ہے کہ آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ تو اس کی ٹریننگ ہے اور یہی حزرے کی چیز ہے۔

فریدی میریز اپنے کمال پر جا کر بھی میری میسین اور شرلاک ہومز سے مختلف معلوم نہیں پڑتی، برصغیر کے بیوروکریٹک نظام حکومت میں ایسا کردار کچھ حقیقت سے دور بھی معلوم ہوتا ہے، مگر عمران کا کردار قاری سے اقرار لے لیتا ہے کہ یہ چیز اس کی اپنی زندگی سے ماخوذ ہے، عمران کا لی اماں کی جوتیاں سر پر رکھنا خالص مشرقی اقدار کی نمائندگی کرتا ہے، دلا بچی تعلیم اور سیکرٹ سروس کی مشقوں کے بعد بھی اس کے چہرے سے علم کا نور برسر ہے، انہیں اقدار کو نبھالے جانا ابن صفی کو صدی کا تجھار اور ناول نگار بنانا ہے۔

توس قمر کے سات رمحوں، یعنی خود عمران، جوزف، سلیمان، جولیا، مصدر، سنگ ہی اور تھریسیا..... ان سب میں سب سے پختہ رنگ کا نام عمران ہے۔

وہ عملی زندگی میں آپ کو ڈگر یوں کی فوج رکھنے والا احمق نظر نہیں آئے گا، مگر ابن صفی جب آپ کو اس کی حماقتیں دکھاتے ہیں تو اپنی انہی تمام تر حماقتوں اور مصوہیت کے ساتھ وہ یوں جلوہ گر ہوتا ہے کہ سلیمان ہو یا سر سلطان، کبھی اس خطبی اور ازلی بیوقوف کے گردیدہ نظر آتے ہیں۔

عمران کی ٹیڑھی شخصیت پر ابن صفی ناول "گھر کا بھیدی" میں کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں: "لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ عمران کی شخصیت اتنی غیر متوازن کیوں ہے؟ وہ ہر معاملے کو ہنسی میں کیوں اڑا دیتا ہے؟ والدین کا احترام اس طرح کیوں نہیں کرتا جیسے کرنا چاہئے؟

اس کے پیچھے بھی ایک طویل کہانی ہے، بچپن میں ماں اسے نماز، روزے سے لگانا چاہتی تھی، باپ نے ایک امریکی مشن اسکول میں داخل کر دیا، باپ ایک سخت گیر آدمی تھے، اپنے آگے کسی کی چلنے نہ دیتے، لہذا عمران بچپن ہی سے ذہری زندگی گزارنے کا عادی ہوتا گیا، باہر کچھ ہوتا تھا اور گھر میں کچھ، مشن اسکول اور گھر بلو تریت کے تضاد نے اسے بچپن ہی سے ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا تھا، ہر چیز کا مضحکہ اڑا دینے کی عادت پڑتی جا رہی تھی"

اس پیرا گراف سے اندازہ لگائیں کہ کیا یہ واقعیت نگاری نہیں ہے؟ ابن صفی نے مزاج، جراثیم، فلسفہ کے مثلث کا ایسا اچھوتا مربع پیش کیا کہ بعض اوقات مضمون کی بلندی کے آگے زبان پیچھے رہ جاتی ہے۔

پطرس بخاری کے بعد غالباً ابن صفی ہی وہ تخلیق کار ہیں کہ جنکی تخلیقات سے پلاٹ چرا کر فلمیں بنیں اور کرداروں کو چرا کر لکھاریوں نے اپنے حلوے مانڈے کا انتظام کیا، اس پر بھی کمال یہ کہ ابن صفی نے ناقدین کے

بجائے قارئین سے سند کمال حاصل کی، جس کے بعد نائدین بن بھی عوام کے ساتھ ہو لیتے۔
 بقول ابن صفی "ایک صاحب کہہ رہے ہیں اتنے ناول لکھ دیے اب زرا ادب کی خدمت بھی انجام دے لیں،
 گویا انکی دانست میں، میں جھک مار رہا ہوں"
 اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی نے محض صلاحیتوں کی بنیاد پر کمال ہی حاصل نہیں کیا بلکہ اس صنف
 ادب کو بھی جائز مقام دلا دیا۔
 یہ عظیم شخصیت 26 جولائی کو اس دنیا میں آئی اور اپنے فنیس کو برسی اور یوم ولادت کے بکھیرٹوں سے بچانے کے
 لیے 26 جولائی 1980 کو اس دار فانی سے کوچ کر کے کراچی کے پاپوش مگر قبرستان میں آسودہ خاک ہوئی۔

ابن صفی۔ میرے محبوب مصنف

لبنی رضوان

جب سے ابن صفی محترم کے بارے میں لکھنے کو کہا گیا ہے تب سے گو گو کی سی کیفیت کا شکار ہوں، کہاں ابن صفی
 سی اعلیٰ شخصیت اور کہاں مجھ جیسی ادنیٰ قاری۔
 اسنے الفاظ کی کم مائیگی اور بے بسی کا شدت سے احساس کئی دن تک میرے لکھنے میں مانع رہا، لیکن اسد عادل
 اور صبیحہ عیسیٰ پر خلوص احباب کے ساتھ نے مجھے تقویت بخشی اور آخر کار لکھنے کی ہمت کر بیٹھی ہوں۔
 میرے پاس بھاری بھر کم الفاظ نہیں ہیں، اور نہ ہی اندازِ بیاں متاثر کن ہے، گروپ میں اب تک کی پوسٹ شدہ
 تمام تحاریر پڑھنے کے بعد تو یہ احساس اور بھی جاں گزریں ہو گیا ہے۔
 ماشاء اللہ سب نے ایک سے بڑھ کر ایک لکھا اور ان تمام مجھے ہوئے لکھاریوں کے بیچ میری یہ تحریر پیشک
 بہت ادنیٰ و معمولی ہے لیکن میرے جذبات اور احساسات ہرگز بھی معمولی نہیں۔ انہی سچے جذبات سے لبریز یہ تحریر
 آپ سب کی نذر ہے۔

شروعات کہاں سے کروں؟

مجھے بھی اس شخص پر لکھنا ہے جس پر سینکڑوں لکھنے والے لکھ رہے ہیں، ہزاروں لکھنے والے لکھ چکے ہیں اور نہ
 جانے کتنے لوگ آگے بھی لکھتے رہیں گے۔
 اس عہد پر لکھنا ہے جو میں نے تو نہیں دیکھا لیکن اس کے اثرات آج تک باقی ہیں، اپنی کتابوں میں، اپنے
 کرداروں میں اور میرے دل میں۔

اس شخص پر لکھنا ہے جس کے بارے میں 'نا ادب' نے کہا کہ یہ 'ادب' کی 'بے ادبی' کرتا ہے، یہ وہی لوگ
 تھے جو رات کی تاریکی میں خود بھی اس کے فن کا نشہ کرنے تھے، یہ اس شخص کا ذکر ہے جس کی زندگی میں جاسوسی
 ناولوں کو ادب کا درجہ نہ مل سکا، ہاں یہ ذکر میرے محبوب مصنف ابن صفی کا ہے۔

ابن صفی میرے لیے صرف ایک شخصیت نہیں وہ میرے لیے ایک عہد ہیں، میرے محسن ہیں، میرے استاد
 ہیں، میری تنہائیوں کے ساتھی، میرے دکھ درد کے ساتھی، میرے دوست، میرا معیار، میرے لئے اردو ادب کا
 ایک درخشاں اور تابندہ ستارہ ہیں۔

میرا ابن صفی سے پہلا تعارف:
 جب سے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو اپنے ارد گرد کھلونے اتنے نہیں دیکھے جتنا کتابوں کا ڈھیر دیکھا، ابو جی کو کبھی
 بھی خالی ہاتھ نہیں دیکھا، اپنی مخصوص کرسی پہ مخصوص انداز میں کتاب ہاتھ میں لئے کچھ نہ کچھ پڑھتے پایا، پھر ایسا

کیسے ہو سکتا تھا کہ گھر کے بقیہ افراد پر اس کا خاطر خواہ اثر نہ پڑتا۔

بھائی، امی، بہن اور کزنز سب اسی رنگ میں رکتے چلے گئے، شروع سے ہی یہ بات ذہن میں بیٹھتی چلی گئی کہ کتاب زندگی کا اہم جزو ہے، بھلا کتاب کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہے؟ یہ بات میرے ننھے ذہن میں بہت چٹکتی سی بیٹھتی چلی گئی۔

گھر کے کونے میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹیک ہوا کرتا تھا، وہاں میری پہلی بار بہن صفی سے سرسری سی ملاقات ہوئی، سرسری یوں کہ کتابیں صرف تصویروں کی حد تک کٹھالی گئیں، پھر ایسی پیشا فریدی اور عمران سیریز وقتاً فوقتاً نظروں سے گزرتی رہیں، لیکن کچی عمر میں جب بھی ایسی کوئی کتاب ہاتھ میں لئے الٹ پلٹ کرتی، بہن اور کزنز چھپا مار کے مجھ سے چھین لیتیں اور کہتیں کہ تمہاری عمر نہیں ابھی ایسی کتابیں پڑھنے کی، میں خالی ہاتھ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی۔

اس وقت میرے لیے بہن صفی کی کتابیں اس درخت کی مانند تھیں جس کے پاس جانے سے آدم و ہوا کو روکا گیا تھا، بھر ہوا ہی، خواب و خیال میں وہی کتابیں رہتے لگیں، میں بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر کس عمر میں یہ کتابیں پڑھ کر خراب ہونا ٹھیک ہے۔

میری بے چینی طبیعت 8 سال کی عمر میں عین اس دن مجھے ان کتابوں کے درمیان لے آئی جب، بہن اور کزنز گھر پر نہیں تھیں، میں نے کتاب اٹھائی اور پڑھنا شروع کیا پڑھتے ہوئے اتمام آ رہا تھا کہ دروازہ کھلنے اور کسی کے اپنے پشت پر ہونے کو بالکل محسوس نہ کر پائی، اور جب پتا چلا تو بانی سر سے گزر چکا تھا اور بھائی صاحب کی گھورتی نظر میرا پوسٹ مارٹم کیے دے رہی تھیں، پھر سزا تو ملتی تھی، جانے کتنے عرصے تک کسی کتاب کی شکل نہ دیکھ سکی۔

کچھ سالوں بعد میرے پاؤں پر ایک بہت خطرناک پھوڑا نکلا، جس کے باعث چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا، نہ دن میں سکون تھا نہ رات کو نیند آتی تھی، کھیل کود بھی سب بند ہو گیا، تب حقیقی معنوں میں میرا بہن صفی سے تعارف ہوا اور پھر بقول جولیا:

"چل پڑا چر!"

پھر کیے بعد دیکرے میں نے بہن صفی کے ناول کئی کئی بار چاٹ ڈالے، مجھے یہ بات بتاتے ہوئے کافی شرمندگی ہو رہی ہے کہ ابتدائی چار بابا پنج ناولوں کے میں نے فریدی کا کوئی ناول نہیں پڑھا، بس ساری محبت اور ساری توجہ عمران نے ہی اپنی جانب پھینچے رکھی۔

مجھے عمران سے کتنی محبت تھی اور ہے، اس حوالے سے میری زندگی میں جو کافی مضحکہ خیز واقعات گزرے وہ ایک الگ ہی داستان ہے، لیکن عمران سے میری دیوانہ وارانہ محبت کے ایک دو واقعات ضرور شیئر کروں گی۔ میں نے عمران کا ظاہری حلیہ ازبر کر رکھا تھا، اکثر ایک ایسی شخصیت کی تلاش میں رہتی، جس کی تھوڑی سی گڑھا ہو، آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہو، پیشانی کشادہ ہو اور چہرے پر طاری کردہ خود ساختہ حماقت کے ڈنگرے برستے ہوں۔

کوئی شادی کی تقریب ہو یا بچے کی آئین، میت کا گھر ہو یا برتھ ڈے پارٹی، ہر جگہ تھوڑی سی گڑھے کی کھوج میرا ہم ترین مشن ہوتا، ایک بار کامیابی نصیب ہوئی لیکن جب گڑھا کھوج لیا تب شکل پہ نظر پڑی وہ کوئی ستر سالہ جھریوں زدہ چہرہ تھا، اور ایسے کئی گڑھے اس کے چہرے پر جا بے جا موجود تھے، بس کیا بتاؤں دل پہ کیسا گھونسا سا پڑا، لیکن اس کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری عمران کی تلاش ہنوز جاری رکھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب گھر میں میری شادی کی بات چیت چل رہی تھی تو جو بھی رشتہ آتا میرا پہلا سوال یہ

یہی ہوتا کہ کیا اس کا مزاج عمران جیسا ہے؟

میری بہن ہکا بکا.....

اگلے رشتے پہ پھر وہی سوال.....

اس سے اگلے پہ پھر وہی سوال.....

اور پھر جب میری بہن کو اندازہ ہوا کہ میں اس سوال کو لے کر خطرناک حد تک سنجیدہ ہوں تو اس کی شمی گم ہو گئی۔ پھر مسلسل ایک ہی کمرار سے تنک آکر اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ عمران کے انتظار میں بیٹھی رہیں تو کنواری مر جاؤ گی لیکن عمران نہیں ملے گا، بس پھر دل پہ پھر رکھ کر شادی کی ہامی بھری اور سوچا کہ عمران نہ سبھی میرے میاں عمران کے فین تو ہوں گے ہی اس سے گزرا رہا ہو جائے گا، لیکن یہاں بھی قسمت کھوٹی نکلی ارے فین ہوتا تو دور کی بات تو وہ عمران کا نام تک نہیں جانتے تھے۔

شادی کے بعد عمران تو نہ ملا لیکن یوغا کی پوری "کنفی" ٹیم ضرور مل گئی، ایسی دلدوز حقیقت کا سامنا کرنے کے بعد طبیعت کی درستی میں کچھ افادہ تو ہوا لیکن راز کی بات چپکے سے بتادوں کہ عمران کی تلاش اب بھی جاری ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ ابن صفی کا خاصہ ہے کہ لوگ ان کے کرداروں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے، ابن صفی نے اپنے کرداروں کی ہنت ہی ایسی رکھی ہے کہ کوئی بھی اس جال میں پھنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں ابن صفی کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ صحیح حق دار تھے، میری ناقص رائے میں ابن صفی ایک عام قاری کے مصنف تھے، یہ ہی وجہ ہے کہ ہر طبقے میں انھیں بے پناہ پڑھا گیا اور سراہا گیا، یہ مقام فیض صرف انھی کو حاصل تھا کہ ان کی کتابیں "میٹ سیکر" ہوا کرتی تھیں، ان کا لکھا ہوا فلشن آج کی دہائیوں بعد بھی اپنے کرداروں کی طرح زندہ جاوید ہے، کسی مشہور ادیب نے ان کے بارے میں کہا تھا۔

"ابن صفی نے ایسا فلشن لکھا ہے جس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔"

آج تیسری نسل میں بھی ان کی کتابیں ایسی ہی مشہور و مقبول ہیں جیسے ان کی زندگی میں تھیں، پورے برصغیر میں کوئی ایک بھی مصنف جاسوسی ادب میں اس قدر معیاری اضافہ نہیں سکا، ان کے معیار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کو کافی کرنے کے لیے درجنوں مصنفوں نے خود ان کے کرداروں پر ہاتھ صاف کیے لیکن ان مصنفین کا لکھا ہوا ابن صفی کے مقابلے میں خاک بھی نہیں۔

میں نے ابن صفی سے کیا سیکھا؟

جو کچھ بھی سیکھا وہ زندگی میں بہت جگہ میرے کام آیا۔

* میں نے ابن صفی کے کرداروں سے کسی بھی حال میں ہمت نہ ہارتا سیکھا۔

* اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہ کرنا سیکھا۔

* اپنے وطن سے عقیدت اور محبت سیکھی۔

* کردار کی مضبوطی سیکھی۔

* ہر قسم کی چوہن میں مزاج کے سہارے شگفتگی پیدا کرنا سیکھی۔

* بہترین اور با محاورہ اردو سیکھی۔

مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ اچھا ادب پڑھنے کا رجحان مجھے ابن صفی کے ناولز سے ملا، اس سے پہلے کوئی سادھی لٹریچر پڑھ لیا کرتی تھی لیکن ابن صفی نے میرا ایک معیار دیا اور مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے۔

اپنے محبوب مصنف کے لئے مجھ جیسی ادنیٰ قاری اور تو کچھ نہیں کر سکتی، کیونکہ بس میں ہی کچھ نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں اپنے محبوب مصنف کو کبھی نہیں بھولتی، ان سے اتنی اپنائیت اور دلی وابستگی محسوس ہوتی ہے گویا میرے والد ہوں۔

اللہ پاک میرے پیارے مصنف کو اگلے جہاں میں آسانیاں عطا کرے انہیں جنت کے باغوں میں سے باغ عطا کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں..... آمین

ابن صفی۔ ایک معلم اور عظیم مصنف

وریشہ عبدالجلیل

جب "ابن صفی ایک عہد ایک رجحان" کے نام کی پوسٹ نظروں سے گزری تو خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی اس بزم میں حصہ لوں۔

ابن صفی پر لکھنا میری دلی خواہش تھی لیکن ان کی شخصیت پر لکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا، گروپ پر موجود معزز اور سنیر شخصیات نے ایک سے بڑھ کر ایک تحریریں پیش کی ہیں، خصوصاً جناب احمد صفی صاحب، جناب ابرار احمد صفی صاحب، جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔

اس گروپ پر تو بڑی بڑی شخصیات موجود ہیں، احمد صفی صاحب، ابرار احمد صفی صاحب، مشتاق احمد قریشی صاحب کے علاوہ راشد اشرف صاحب، ہمایوں اقبال صاحب، محمد حنیف صاحب، عبداللہ احمد حسن صاحب، ابن آس صاحب، اب جس گروپ پر ایسے ایسے اہل علم لوگ موجود ہوں گے تو وہاں میری تحریر کی بھلا کیا اہمیت ہوگی۔ متذکرہ بالا معزز حضرات میں سے کچھ لوگوں کے مضامین پڑھے تو خیال آیا کہ اتنی عمدہ تحریروں کے بعد میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی بھلا کیا حیثیت ہوگی، سب ہی میسرز نے ایک سے بڑھ کر ایک مضمون لکھا، ان کے سامنے میری تحریر طفل کتب سی لگتی ہے، لیکن پھر یہی خیال آتا ہے کہ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے، آج ٹوٹا پھوٹا لکھوں گی تو یقیناً آگے چل کر اس سے بھی اچھا لکھ سکوں گی۔

ابن صفی صاحب کے ناولز اور دیگر تحاریر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری معلومات میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو گیا ہو، ان کے ناولوں کی صورت میں ایک خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو، ابن صفی کا نام جاسوسی ادب کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں، انھوں نے لکھنے کے انوکھے انداز کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کی، انھوں نے صرف جاسوسی ادب ہی پر نہیں لکھا بلکہ اپنے ناولز میں ہر موضوع کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا جو پڑھنے والے کو آج بھی اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہیں۔

ابن صفی صاحب کو پڑھ کر ایک بہت ہی اہم چیز ہمیں سیکھنے کو ملتی ہے یعنی زبان و بیان، جاسوسی ادب کے ساتھ ساتھ انھوں نے پڑھنے والوں کے دلوں میں اردو کے لیے محبت پیدا کی، جاسوسی دنیا، عمران سیریز، شعر و شاعری اور دوسری تحاریر کو پڑھ کر اور سمجھ کر ہمارے سامنے اردو کے وہ بندر دوازے کھلی کھل جاتے ہیں جو کسی اور کی تحاریر سے نہیں کھل سکتے۔

ابن صفی صاحب کو پڑھ کر اگر کوئی پوچھتا ہے کہ اردو میں بی اے، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کرے یا اردو جاسوسی ادب پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کرے تو اس کو کبھی مشکلات پیش نہیں آئیں گی، اگر کوئی مشکل پیش آ بھی گئی تو وہ بہت آسانی سے کسی بھی مشکل کا سامنا کر سکے گا کیونکہ اردو ادب اور اردو جاسوسی ادب کے حوالے سے طالب علم کے پاس وہ مواد اور الفاظ کا ذخیرہ موجود ہوگا۔

ابن صفی جیسے عظیم اور نامور ادیب و شاعر پر لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی کیونکہ انہوں نے اتنے موضوعات پر لکھا ہے کہ ہر موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

ان کے ناولوں کی خاص بات یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر کبھی بھی یوریت کا احساس نہیں ہوتا اگر کبھی ایسا محسوس بھی ہوتا ہے تو اگلے ہی صفحے پر اسکی تفریح اور مزاح پڑھنے کو ملتا ہے کہ انسان کی یوریت فوراً ہی رفع ہو جاتی ہے۔

ابن صفی کینا دلوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ فریدی و جمید شروعات میں ایک الگ ماحول میں سرگرم عمل ہیں اور آخری ناولوں میں الگ ماحول میں، شروعات سے لے کر آخری ناولوں تک ان کے سبھی کرداروں میں بتدریج تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جو پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خوشگوار سا تاثر چھوڑتی ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ان کے کردار بدلتے رہے ہیں، جو لوگ ان کے ناولوں کو پرانے زمانے کی آؤٹ ڈیٹڈ چیز کہتے ہیں وہ یا تو قوت مشاہدہ کی حس سے بے بہرہ ہوتے ہیں یا پھر انھوں نے ابن صفی کو اچھی طرح پڑھا ہی نہیں ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں اور کرداروں میں وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کر سکیں۔

ان کے ناول زیادہ تر ان حقیقی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں جن پر اس سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا، حقیقت بیان کی کے ساتھ ہی یہ ناول ہمارے معاشرے کے بہترین عکاس ہیں۔

عمران کے کردار کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس کا لالہ بالی اور بے فکر رویہ فریدی اور جمید کے رویوں سے قطعی مختلف کیوں ہے، فریدی زندگی کی حقیقتوں کو سنجیدگی سے تسلیم کرتا ہے جبکہ عمران کے نزدیک زندگی دیوانے کے ایک خواب سے کم نہیں اس کا مشہور قول ہے:

”آدی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جبکہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اسے اپنی تمام تر سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا پڑے گا۔“

[ناول:]

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”اس شخص کے لئے میرا دل رورہا ہے، کاش اس کے انتقامی جذبہ نے انفرادی رنگ اختیار کرنے کے بجائے ایسی تحریکوں کا ساتھ دیا ہوتا جو ظلم اور جبر کے نظام کو مٹا دینے کے لئے کام کر رہی ہیں۔“

[پتھارہ شہ زور]

جبکہ فریدی کی سنجیدہ شخصیت اس کے بنائے ہوئے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کرتی، ابن صفی کا یہ کردار بہت وضع دار اور پروقار ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”حرام خوری انسان کو سنگ دل بنا دیتی ہے، اگر یہ ایک ایماندار آدمی کی طرح روزی کما تا ہوتا تو اس کے بچے شرابی اور جواری نہیں ہو سکتے تھے، بے مشقت ہاتھ آئے ہوئے پیسے آدمی کو شیطنت کی طرف لے جاتے ہیں۔“

[ناول: نیلی لکیر]

ایک اور جگہ فریدی کہتا ہے:

”آدی خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو، اگر وہ معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہے تو کسی حقیر چیونٹی ہی کی طرح ایک دن خاک میں مل جائے گا۔“

[زہریلا آدمی]

اس سے ابن صفی کے وسیع النظر ہونے کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے اپنے دونوں کرداروں سے یہ بات ثابت کر دی ہے، صرف سنجیدہ انسان ہی کامیاب نہیں ہوتے بلکہ غیر سنجیدہ اور مزاحیہ انسان بھی کامیاب ہو سکتا ہے، کامیابی کا دار و مدار انسان کے رویوں پر نہیں بلکہ اس کے جذبات پر ہوتا ہے، جو اپنے کام سے جتنا عشق کرتا ہوگا اتنا

ہی کا میاب ہوگا۔

محقق اور ادیب محترم راشد اشرف صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ابن صفی نے کل 245 ناولز لکھے ہیں، اس کے علاوہ آٹھ ناول اور ہیں جن کا تعلق جاسوسی سے نہیں ہے، انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ابن صفی کی مزاحیہ تحریروں ڈیوٹی مرغ نامی مجموعے میں بہت عرصے قبل شائع ہو چکی ہیں۔

ابن صفی برصغیر کی واحد ادیب تھے جن کے ناولز ہر ماہ بیک وقت اردو اور ہندی میں چھپا کرتے تھے، انہیں اردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب تسلیم کیا جاتا ہے، مولوی عبدالحق، رئیس امر دہوی، مجنوں گورگھوری اور حسن عسکری نے ان کے فن کو سراہا ہے، اگا تھا کرشی نے آپ کے فن کا اعتراف ان لفظوں میں کیا:

"برصغیر کے اردو جاسوسی ناول نگاروں میں ایک ہی مکمل ناول نگار ہے جسے لوگ ابن صفی کے نام سے جانتے ہیں"

ابن صفی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے چاہنے والے ناول مارکیٹ میں آنے سے قبل ہی لا بریر یز اور بک ڈپوز کے چکر کا شکار شروع کر دیتے، تاکہ جلد از جلد اپنی کاپی حاصل کر سکیں، ریکل چوک پر تو چاند رات کا سا ساں ہوتا علی الصبح ٹرک بھر کر آتا اور دیکھتے ہی دیکھتے تیرک کی طرح بٹ جاتا۔

محترم فکیل جمالی لکھتے ہیں:

"ابن صفی ایک بلند پایہ ادیب و شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ بہترین انسان، بہترین دوست اور نہایت ذمہ دار، شریف اور وضع دار شخص تھے، ان کے ہونٹوں پر ہمہ وقت کھلتی مسکراہٹ انکی خوش اخلاقی کا اعلان کرتی تھی، ابن صفی کیسپے میں ایک ایسا دھڑکتا ہوا دل تھا جو ہر شخص کی دکھ درد کو فوراً محسوس کر لیتا تھا، نجانے کتنے غریب و نادار طالب علموں کو وہ وظائف دیتے تھے، اور کتنے ہی مجبوروں کی مدد کرتے تھے"

ابن صفی سے ہر طبقہ فکر کے لوگوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا، جنہوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا انہوں نے کم از کم اردو ہی سیکھ لی، اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ ابن صفی ایک عظیم مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم معلم کی حیثیت بھی رکھتے ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

ابن صفی کے ناول صرف تفریح طبع ہی کے لئے نہیں ہوتے بلکہ اس میں ہماری زندگی اور معاشرے کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے، بہتر سے سماجی و معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے، ان ناولز کو پڑھنے سے نہ صرف ہمارے دماغ پر خوشگوار اثر پڑتا ہے بلکہ غور و فکر کے نئے دروا ہوتے ہیں۔

آخر میں یہی کہوں گی کہ جو سمجھ میں آیا لکھ دیا جو غلطی ہو اس کی نشاندہی کرو دیجئے گا۔

اللہ تعالیٰ ابن صفی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے "نا تحقیق بھائیوں" کو ہدایت دے جو بقول ان کے "صفی" ہی کی چھاؤں میں پناہ لیتے ہیں۔

ابن صفی کے ناول میرا جنون

روشی خان

ہم کیا بتائیں تم لوگوں کو کتنے دیوانے تھے ابن صفی مرحوم کے، تم لوگوں کے خالو سے شادی سے پہلے ہم بڑی محبت کرتے تھے ابن صفی مرحوم سے، مرحوم لکھتے ہیں تو کلیجہ چھلنی ہوتا ہے، یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری شادی نہیں ہوئی تھی، ہماری ایک سہیلی نے ہمیں ابن صفی کا ایک ناول دیا۔

اس ناول کو پڑھ کر تو ہم دیوانے ہی ہو گئے ان کے انداز تحریر کے، بہت گالیاں دیتی تھیں اماں پرشتن ہمیں

عمران کے پیچھے، اور ہم ڈھٹائی سے ہنستے رہتے تھے، ہماری ہنسی پر اماں ہنسن ایک فلائنگ چپل ارسال کیا کرتی تھیں۔

ہمارا دیوانہ پن بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک ہماری شادی طے پا گئی، ہماری ساسو ماں نے ہمیں کسی شادی میں دیکھا تھا، ہماری بھولی سی صورت انہیں بھانپ گئی تھی، شادی طے پاتے ہی اماں ہنسن نے بیچ محسن میں ابن صفی کی تمام کتابوں کو آگ لگا دی۔

ہم با آواز بلند روتے ہوئے ایکٹو، عمران، فریدی اور حمید کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے، آپ لوگ جانتے ہیں جس کو ابن صفی کی تحریر کا چمکا لگ جائے وہ کب رکتا ہے، ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، ہم چپکے چپکے ناول پڑھتے رہے۔

شادی والے دن ہم اپنے بیگ میں ناول چھپا کے لائے، کہ ہمیں تو نیند ہی نہیں آتی تھی جب تک ناول کے چند صفحے پھیرنا لیں، شادی کی رات آپ لوگاں کے خالو تو سو گئے اور ہم بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے، نشہ جو لوٹا تھا ابن صفی کی تحریر کا، ہم چپکے سے اٹھے اور واش روم میں ناول لے کر پڑھنے بیٹھ گئے۔

جب ہم کافی دیر واش روم سے برآمد نا ہوئے تو آپ کے خالو نے واش روم کا دروازہ زور زور سے بجایا، کیونکہ ہماری بے چینی سے ان کی آنکھ کھل چکی تھی، ان کی خونخوار نظروں سے بچتے ہم واش روم سے نکلے، مگر صاحب وہ ناول دیکھ چکے تھے۔

کیا سہانا دور یاد کروادیا آپ لوگاں نے، اب تو ٹکڑ ماری نظر ہی جواب دے گئی ہے، آپ لوگاں کے گروپ میں آکر ابن صفی کی محسناں پھر سے جاگ گئی، میری بھابی کی ماسی کی بیٹی نے اس گروپ کا مجھ کو بتایا اس کی بہت بہت احسان مند ہوں، سب خوش رہو، اللہ حافظ۔

ابن صفی کے اسرار

ثاقب شیع

اور پھر گیارہواں صفحہ بھی پھاڑ کر میں نے کوڑے دان کی طرف اچھال دیا، جس کا ٹھیک اپنے مقام پر پہنچنا میرا اس کام میں کہنہ مشق ہونے پر دلالت کرنے لگا، موقع دیکھ کر قلم نے بھی دوبارہ کانوں پر ڈھکن تان کر پاؤں پھیلا دیے اور میں نے ایک بار پھر سے بال کھاتے ہوئے فکر کے قلم زخار میں غوطہ لگا دیا۔

گنتی کے دو ہزار الفاظ اور ان پر دس دنوں کی قید.....! یا خدا.....! یہ وہی بڑے میں دونوں کا تناسب جاننا چاہتے ہیں یا رس گلے میں چاشنی کی مقدار.....؟ یہ کیسے ممکن ہے.....؟ نہیں نہیں..... یہ ناممکن ہے.....! قطعی ناممکن۔

وہ مصنف جس کا قلم کروڑوں دلوں پر راج کرتا ہے، جس نے تین نسلوں پر حکومت ہے، جس کے تخیل کی بلند پروازی پر ہزاروں دانٹوں تلے انگلی دبا ہے، جس کے کردار کی دھڑنیں آج سینٹس سال بعد بھی ہم اپنے سینوں میں محسوس کر رہے ہیں، جس کی منظر نگاری پر صدیوں سے خاموش پہاڑ آہ و فغاں کرنے لگیں، جس کی ایک جنبش قلم سے وہ گلشن تخلیق ہو جائے جس کی بلبلیں نئے سمگلستانی پھریں اور جس کے گل غزلیں سنائیں، جسے کوئی پڑھ لے تو اسی کا ہو جائے، جس کا سحر انگیز مزاج جب کسی پر چل جائے چہ جائیکہ وہ کسی ملک کا صدر ہی کیوں نہ ہو تو وہ پالٹی مار کر رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے قبہ قہہ لگانے لگے، وہ جو بیک وقت ادیب اور شاعر دونوں کا نذر رکھتا ہو.... اس شخص کی تحریر کے اوصاف کا احاطہ کرنا میری اس مختصر بیاض کے لیے کہاں ممکن ہے....؟

ان کے فن کی ہر خوبی ایک طویل مضمون کا مطالبہ کر رہی ہے، مجھے تو کم از کم چھ ماہ کی مدت چاہیئے، میں ستاروں سے الفاظ لاؤں..... ہر خیال کو ہزار بار جذبات کے ترازو میں تولوں..... مضمون لکھنے کے لئے وقت کی اتنی لگیل مدت و مقدار کس نے رکھی.....! کیا یہ صفحات بچانے کی مہم ہے.....! کیا آج ہی انھیں گلوبل وار منگ یاد آئی.....؟ میری بددعا ہے..... خدا اس کے نکاح نامہ کے لیے صفحوں کی قلت کر دے، اس کے شادی کارڈ کیلئے کاغذ نہ ملے، اس کی شادی میں اس کی چھوٹی ممانی اور بڑی پھوپھو سے اس بات پر طے مار مار کر ادھ مو کر دیں، بھی تو یہ ایسی حماقت پر لاحول... لاحول... بلکہ لاحول ٹوڈی پاور آف ہنڈ ریڈ) جی ہاں مضمی صاحب کے ناول سے ہی چرایا ہے)

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک کسی نے میری پیٹھ تھپتھا کر مجھے خیالوں کے دریا سے باہر پنک دیا۔
 "کون ہے؟" مجھ جھٹکا کر مڑتے ہوئے بے ساختہ میری زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے، میری پشت پر ایک پستہ قد اور ناتواں جسم کے نہایت ہی بوڑھے حضرت اپنی دودھ میں ڈوبی ہوئی سفید داڑھی کی چونٹیوں پر موجود پتے ہوئے اپنے دو چار دانتوں سے مسکرا رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے سوال کیا، مگر جواب دینے کے بجائے وہ میرے والد صاحب کو شکاقتی نظروں سے دیکھنے لگے، گویا میں نے ان پر چوری کا الزام لگادیا ہو اور وہ والد صاحب سے میری شکایت کر کے میری حرمت کروانا چاہتے ہوں۔

"ہو اس بس؟" میں بھی والد صاحب کی جانب متوجہ ہوا، اور اس بار زرارعب جمانے کے لیے قصد انگریزی استعمال کی۔

"یہ تمہارے خالو جان کے والد صاحب ہیں۔" والد صاحب نے میرا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا، یہ والد صاحب کا پہلا اور آخری ڈائلاگ تھا جو وہ بخوبی بول چکے تھے۔

"ہاں تو یہ بات آنجناب خود ہی نہیں بتا سکتے تھے؟" من کی آواز دل کے گوشوں میں بڑی خاموشی کے ساتھ ابھری اور یک نخت غائب ہو گئی، اگر میں یہ بات زبان سے ادا کر دیتا تو ایک نئے فساد کے برپا ہو جانے کے امکانات روشن ہو جاتے، بوڑھے لوگوں کو ویسے بھی غصہ جلدی آ جاتا ہے۔

"تم اردو جانتے ہو؟" کیا ہی میٹھی زبان تھی، مخرج و تلفظ سے بھرپور... مگر الفاظ سننے میں پیوست ہو گئے، ان کے چہرے پر رقصاں مسکراہٹ کو بھی میں کوئی معنی نہ پہناسکا، خدا خیر کرے..... ان بزرگوار نے لب و دہن کو تکلیف تو دی۔

میں نے ایک نظر والد صاحب کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے، جیسے وہ ان بزرگوار کی بات نہ سمجھ سکے ہوں، میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا، کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جب میں نے پھر سے والد محترم کے چہرے کی طرف دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بذبان خاموش مجھے چپ ہی رہنے کا اشارہ کر رہے ہوں۔

میں نے ایک بار پھر من کی دنیا میں دوڑ لگائی..... "اردو اور میں..... یہ حضرت کیا پوچھ رہے ہیں... ہونہہ..... دو چار گھنٹیا سے مصنفین کو بڑھ کر اور تین چار بے وزن غریب لکھ کر ایسے لوگ خود کو بابائے سخن سمجھنے لگتے ہیں (یہ سوچتے ہی دل کو ایک گونہ اطمینان ہوا) بوڑھے ہیں اس لیے احترام واجب ہے، مگر ٹھیک تو کرنا ہی ہوگا۔

"جی یہ جو چند ہزار کتابیں آپ کے مقابل میز پر جلوہ افروز آپ کی قوت باصرہ نیز آپ کے شعور کو اپنی موجودگی کا ادراک کروانے کے لیے کوشاں ہیں، ناچیز کی غرق مطالعہ صفت کے باعث اسے حفظ ہیں، مزید یہ کہ بعض اثناء پر دازوں اور سخن و احباب کی محفل میں بندہ سماعت اردو زبان سے فیض یاب ہوتا ہے، اس لیے پہلے یہ بتائیے کہ

آپ کی قوت فہم اور ذوق ادب دل گداز نے بھی آپ کو ابن صفی کی معتد کتابوں کے مطالعے پر مائل کیا ہے؟ کیا آپ ابن صفی سے واقفیت رکھتے ہیں؟ "ناں ناں! آپ گھبراہٹ میں نہیں! سر کے اوپر سے گزر گئی ناں یہ اردو؟ کیا فرق پڑتا ہے، آپ کے لیے کچھ بھی نہیں... بھئی میں کسی سے کمزور پڑتا ہوں! یہ تو ان جناب کو اپنی باکمال اردو دکھانی تھی..... اور اب میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل نہیں دوڑ رہی تھی، جس میں طنز کے ساتھ ذہک اور مقابلہ کو احساس کمتری کا ادراک کرانے کے عناصر بھی مٹ گئی کر رہے تھے اور صفی صاحب کا نام نہلے پہ دہلا! مجھے یقین تھا انھوں نے صفی صاحب کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔

"ہا ہا ہا ہا ہا۔" انھوں نے میری طرف دیکھ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولے "برخوردار! ہم ابن صفی ہی نہیں بلکہ اسرار احمد سے بھی واقف ہیں۔"

محترم کے ان لفظوں نے میری بانجھوں کو چرتے ہوئے میرے دانتوں کے درمیان ایک بڑا سا شگاف کر دیا، جس کا نتیجہ میرے کھلے ہوئے منہ کے طور پر ظاہر ہوا، جس سے حیرت کی روشنیاں باہر جھانک رہی تھیں۔
 "تم جیسے آج کل کے سر پھرے لوٹے چار کتابیں پڑھ کر یوں ڈیٹیں مارنے لگتے ہیں جیسے تم سے بڑا کوئی اہل ادب ہی نہیں... تمہیں پتا بھی ہے ابن صفی کی کتابیں کیوں چلتی ہیں... نہیں پتا، کہو... کہو... اب بولتی کیوں بند ہو گئی، میں جانتا ہوں تمہارے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم ہوگا... بس اب مجھ سے بحث نہ کرنا، اب چپ رہو اور مجھ سے سنو۔"

بزرگوار غصیلے انداز میں کچھ دیر تک مجھے گھورتے ہوئے کچھ سوچتے رہے پھر جب بولے تو میرے بولتی ہی بند کر دی۔

"ہاں تو برخوردار ان کا مقصد اول عوام کے لیے ایسی کہانیاں پیش کرنا تھا جسے پڑھ کر وہ اس میں کھوجائیں، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی وہ اپنی ذہنی الجھنوں سے چھٹکارا پالیں، اور پھر اس لطافت کے بیچ میں اسرار کے وہ پردے بھٹاتے ہیں کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے، ان کی جدت اللہ اللہ! دعویٰ تو دیکھیے کوئی دو ناولوں میں بھی آپ کی سائنس ثابت کر دکھائیے، ناممکن! اور اس پر چار چاند لگاتی زبان و مضامین پر گیرائی، مزاح سے بٹنے تو رازدوں کے سائبر میں ڈوب جائیے، سنجیدہ ہونے تو علم کا وہ دریا بہا دیا جو آپ کو اپنے علم و فن کی عظیم گہرائیوں میں غرق کر دے گا، اس دلکش اسلوب کے درمیان اس طرح سے معاشرے کو جرائم سے بچنے کی ترغیب دیتے ہیں کہ اہل فن عیش عیش کر انھیں، خیر تم سے یہ پوچھتا تو بیکار ہی ہے مگر بتا دو تم انھیں کیسے جانتے ہو؟"

جن حیرت کی روشنیوں کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں وہ بتدریج اپنی پوری آب و تاب سے رواں تھیں... بس ان کے دہانے نے مزید وسعت اختیار کر لی تھی... مجھے کچھ کچھ سناؤ! تو دے رہا تھا، لیکن کان اور دماغ کے درمیان کی تمام راہوں پر حیرت کی ہڑتال کے باعث ذہن کچھ بھی سمجھنے بوجھنے سے عاری ہو گیا تھا، مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ مجھ سے زیادہ بھی کوئی ابن صفی صاحب کو سمجھتا ہے جانتا ہے۔

"اے لڑکے! انھیں سے پوچھ رہا ہوں، ابن صفی کو جانتے ہو... بتاؤ... جواب دو؟" ان کے ان لفظوں نے کان اور دماغ کے درمیان کی ہڑتال روکوائی اور معاملہ کچھ ہموار ہوا، میں بھونچکا سا ہو کر انھیں دیکھنے لگا، پھر ہمت کر کے ہکلا ہکلا کر بولنا شروع کیا۔

"د... د... دیکھئے... وہ... وہ میں نے ان کے سارے ناول پڑھے... ہیں... یعنی پسندیدہ مصنف... وہ مجھے ان کے بارے میں لکھنے کے لیے کہا گیا... یعنی کہ خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لکھنا... ہے۔" میرے یہ بے ربط جملے جو میں نے بڑی مشکل سے ادا کیئے تھے، انھوں نے اسے اپنی تیز کلامی

سے یوں باش باش کر دیا۔
 "کیا گہما؟ محسین لکھنے کے لیے کہا گیا ہے، وہ بھی ابن صفی کے بارے میں..... ہائے! وہ شخصیت جس کا نام 'اردو ادب آزادی کے بعد' 'سنت و رفتار' 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' جیسی مقبول عام کتابوں کی زینت بڑھا چکا ہے، جس کی قابلیت مولوی عبدالحق، مجنوں گورکھپوری، محمد حسن عسکری، امجد اسلام امجد جیسے معززین سے لوہا منوا چکی ہے اور مغربی شخصیات کا کیا کہنا... اگاتھا کرشی، کرشنیا اولیستر ہیلڈ اور فن محسین جیسے نامور اہل ادب جاسوسی ادب میں جن کے عروج پر قصیدے کہہ چکے ہیں، ابوالخیر کشفی نے جن کی عظمت کا اعتراف یوں کیا ہے:
 "میں نے بھی ابن صفی کے ناولوں کو کتابوں کے درمیان چھپا کر نہیں رکھا۔"
 تم ان کے بارے میں کیا لکھو گے؟ بتاؤ..... بس لکھ کر ان کا وقار گراؤ گے..... خبردار جو تم نے ان کی شخصیت اور فن پر کچھ لکھا تو..... کچھ لکھو گے؟"

یہ کہتے وقت وہ جس غصے میں تھے اور جس انداز سے آگے بڑھ رہے تھے..... مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اب گریبان پکڑ کر دو چار طمانچے ہی تو رسید کر دیں گے۔
 جی۔۔۔۔۔ وہ میں نے کلک..... کیا لکھا ہے!"

"ہاں ہاں! وہی پوچھ رہا ہوں کیا لکھا ہے؟ تم جیسے کل کے لوٹروں سے اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے، تم جیسے احمق اور نکلے کیا لکھیں گے بھلا.....؟ جن کو قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہیں، بولو..... بتاؤ..... جواب دو، اب خاموش کیوں ہو..... ہونہہ..... بڑے آئے ابن صفی پر لکھنے والے، تم اگر لکھو گے بھی تو کیا لکھو گے، زیادہ سے زیادہ دو چار بور کر دینے والے جملے لکھنے کے بعد اپنے پسندیدہ کردار کی حمایت شروع کر دو گے، ایک کردار کی برتری ثابت کرنے کے لئے دوسرے کرداروں کو نیچا دکھانا شروع کر دو گے، تم جیسے کم عقل یہ بھی نہیں سمجھتے، ایسے تم صفی صاحب کے کلام میں خامیاں نکالنے کی گستاخی کر رہے ہو..... مگر یہ یاد رکھو ان کی تحریک یا یہ ایک بہت بڑا امتیازی وصف ہے کہ ان کے تمام کردار ایک زندہ حقیقت معلوم ہوتے ہیں، مافوق الفطرت ہستی نہیں لگتے، ثبت ہو یا منشی ہر ایک کردار کا الگ مقام ہے، جن سے آج کا قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا، کون اسرار احمد کی غیر موجودگی کو بھر پائے گا، آج تک ان کی غیر موجودگی ادبی گوشوں میں سناٹے کا باعث بنی ہوئی ہے، خوش نگاری سے دوری، ایک رب کائنات کی وکیٹر شپ کی خواہش، سائنس کا بہترین استعمال، غرض یہ کہ ہر طرح کے ذوق کا لوازمہ کون فراہم کر پائے گا.....؟ بہت مشکل ہے اور صرف یہی نہیں ان کا قلم کبھی ملک کی طرح منقسم نہیں ہوا، یہی وجہ ہے جو ان کے مسلمان قارئین کے ساتھ ساتھ ان کے ہندو قارئین بھی قابل قدر تعداد میں ہیں۔"

"جی..... جی، واقعی میں بھی یہی کہوں گا کہ پوری دنیا میں ان کے فن کا لوہا ماننے والے ہزاروں لوگ موجود ہیں۔" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بدقت تمام اپنی زبان سے یہ جملے ادا کیئے، حالاں کہ اندر ہی اندر میرا دل ڈرا ہوا تھا۔

"انھیں صرف دنیا سے اپنے فن کا لوہا منوانا ہی نہیں آتا تھا بلکہ دنیا کو کوزے میں بند کرنے پر بھی مہارت رکھتے تھے، نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی انھیں کمال حاصل تھا، لاؤ اپنی بیاض مجھے دو، میں دیکھوں کیا لکھا ہے تم نے؟"

اس سے پہلے کہ میں احتجاج کرتا انھوں نے بیاض میرے ہاتھ سے چھٹ کر اس میں جلدی جلدی کچھ کھچانا شروع کر دیا، جی ہاں..... وہ لکھنا نہیں کھچانا ہی تھا! کیوں کہ اس قدر تیز رفتاری سے لکھا ہی نہیں جاسکتا، وہ میرے لکھے ہوئے کو پڑھ کر ساتھ ہی بڑا تے بھی جا رہے تھے۔ "لکھنے کا شعور ہے نہیں اور ڈٹیں مارنے کے انداز تو

دیکھو صاحب کے...!"

میں حیرت سے کبھی ان کو اور کبھی اپنی بیاض کو دیکھ رہا تھا، جو ہرگز رتے لمحے کے ساتھ ان کے جنبش قلم سے سیاہ ہوتی جا رہی تھی، جب وہ لکھ چکے تو بیاض میری طرف سرکا لی اور بولے۔

"لو اسے پڑھ لینا، تمہارے لیے نیک خواہشات....!" یہ ادھوا جملہ کہہ کر وہ برق رفتاری سے میرے کمرے سے نکل گئے، میں کہتا ہی رہ گیا۔ "یہ سب تو ٹھیک ہے مگر میرا قلم تو دیتے جائیے..... ابھی کل ہی خریدا تھا!"

مگر انہیں خیال ہی کہاں، وہ تو جا چکے تھے۔

میں نے مردہ دل سے بیاض دیکھی، ہانپکا خوشخط تحریر تھی، ذہن قبول کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا، لیکن دل عیش عیش کر اٹھا، شاید ہی میرے قلم نے کبھی اتنی عمدگی سے روشنائی بکھیری ہو، مگر آپ ہی انصاف سے بتائیے..... کچھ بھی ہو اس قلم کا اصل مالک تو میں ہی تھا نا.....! بھئی پورے ساڑھے تین روپے خرچ کر کے خریدا تھا، مانا ان کی تحریر خوشخط ہے جسے انھوں نے سلیقے سے استعمال کیا، مگر قلم کا یہ جبری انخوا میرے کلچے پر پھریاں چلا رہا تھا۔

میں نے دل کو تسلی دے کر ان کی تحریر پر پھر سے نظر ڈالی اور پڑھنے لگا، لکھا تھا..... "آدی کس قدر بے چین ہے مستقبل میں جھانکنے کے لیے، شاید آدی اور جانور میں اتنا ہی فرق ہے کہ جانور مستقبل سے بے نیاز ہوتا ہے اور آدی مستقبل کے لیے مراجعات ہے۔"

[سرنگا شعلہ]

یہ تو ابن صفی کے ایک ناول کا اقتباس تھا، اس کے آگے ایک مختصر سائنٹ لکھا تھا۔ "برخوردار.....! مذکورہ بالا اقتباس ان کی فنی مہارت اور ادبی قابلیت کا ادنیٰ سا شاہکار ہے، تم داستان لکھو گے تو حتی الامکان کوشش کرنا کہ ان کے اوصاف بیان کر سکو، کیوں کہ مرحوم کو ان کی خوبیوں سے ہی یاد کیا جانا چاہیے، مگر بیٹے وہ خود ہی اپنی داستان لکھتے تو کیا لکھتے؟..... شاید یہ لکھتے..... بائے...!"

"لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں

لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی ہی داستان"

[اسرار احمد۔ ابن صفی]

نہ جانے یہ اقتباس پڑھتے ہوئے میری آنکھوں کے کنارے کیوں بھیگ گئے...! آپ نہ سمجھیے کہ یہ میرے قلم کی آخری یادگار تھی، نہیں..... نہیں، یہ تو ابن صفی صاحب کے شعر کا کمال تھا..... جو دل میں جاگزیں ہوا تھا۔

"ہممم..... بالکل ٹھیک کہا... اتنے سے وقت میں بھلا کیا ہوگا؟ اب مجھے ابن صفی پر لکھنے کے لیے اور بھی وقت چاہیے۔" یہ سوچتے ہوئے ابن صفی صاحب کا مذکورہ بالا شعر پڑھا، دوسرا قلم نکالا اور مندرجہ ذیل سطریں لکھ کر بیاض بند کر دی۔

"اپنی کہانیوں کا غضب بھی تو دیکھیے

لکھوائی اس نے آپ پکٹی ہی داستان"

میری طرف سے انھیں کروڑوں محبتیں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خراج تحسین..... اللہ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے... آمین!

خاک میں کیا کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

شعرون علی چودھری

ابن صفی کی تعریف اور یہ عاجز؟ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے اور بامگ دہل اس کا اقرار بھی کرتا ہوں کہ جو ٹوٹی پھوٹی اردو مجھے آتی ہے اللہ کے کرم کے بعد ابن صفی کی دین ہے۔
کہانیاں پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا اور اکثر اس شوق کی تکمیل میں گھر کے کام کاج جو میرے ذمہ ہوتے تھے رہ جاتے تھے اور قبلہ والد صاحب کی تان کہانیوں پر ہی آکر ٹوٹی تھی اور خوب دھنائی ہوتی تھی، مگر ہم نہ باز آنے کہ تھے نہ آئے۔

عمران سے پہلی ملاقات مظہر کلیم کے کسی ناول کے توسط سے ہوئی، بس پھر کیا تھا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بی کام کیلئے جب قمر علیہ فال پنجاب کالج اسلام آباد کے نام نکلا (اباجی کو کسی نے رائے دی تھی کہ بڑے ہوؤں کو پنجاب والے سیدھا کر دیتے ہیں) تو ایک ایسے باب کا آغاز ہوا جو ایک لازوال عشق میں تبدیل ہو گیا۔
زیر اور خرم سے ملاقات ہوئی، ابجی ملاقات کیا ہوئی ہمارا اس پر اتفاق ہے کہ ہماری رو میں عالم بالا میں کہیں ساتھ ساتھ ہی تھیں اور جب ساتھ تھیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے شوق بھی ایک سے نہ ہوتے؟
زیر صاحب وہ شخصیت ہیں جنکے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ "عمران" کہ خالق ابن صفی صاحب تھے اور باقی سب ان کے پاؤں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔

بھہ، سچ تو یہ ہے کہ جب ہمیں ان کی یہ ہرزہ سرائی ایک آنکھ نہ بھائی اور ہم نے ان کے خوب لتے لئے، لیکن چونکہ وہ بھی ہمارے عالم ارواح کے محلے دار تھے سواگلے دن دل پہ ہاتھ رکھ کر (متم تمام دوست اپنی کتابوں کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے، مستعار دینا تو دور کی بات ہے) ابن صفی کے اپنے کلکیشن سے عمران سیریز کی ایک جلد اٹھا لائے، اور حکم فرمایا کہ پڑھ کر جواب دینا۔

جواب ہوتا تو دیتا.....! غالباً وہ ناول "قبر اور خنجر" تھا، بس پھر کیا تھا بلاتامل اعتراف خطا کیا اور گزارش کی کہ بھائی رجوع کی کوئی صورت ہو تو بتائیں؟
فرمایا ایک ہی صورت ہے کہ مکمل ایک سو بیس ناولز پڑھے جائیں، عرض کیا کہ کیا مستعار ملیں گی؟ تڑاک سے جواب دیا، ہمارا کام راستہ دکھانا تھا چلنا آپ کو خود ہے۔

اگلے ہی دن نہ صرف یہ کہ عمران سیریز بلکہ جاسوسی دنیا بھی خرید لی اور پڑھ کر ہی دم لیا، ایسا لگا کہ برسوں کے بیاسے کو سیر ہو کر خنڈا بیٹھا پانی میسر آ گیا ہو، اس بات کو قریب پندرہ سال ہونے کو ہیں لیکن ابھی بھی میرا یہ معمول ہے کہ تو اتر کے ساتھ ایک کہ بعد ایک کتاب پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں، اور جب آخری جلد ختم ہوتی ہے تو نئے سرے سے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

ابن صفی صاحب جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، بالعموم اردو ادب اور بالخصوص اردو ساری ادب ان کی خدمات کا تقاضا مقرر و ضرور رہے گا۔

"لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں

لیکن نہ لکھ سکے تھی اپنی ہی داستان"

(اسرار ناروی)

ابن صفی کی جادو بیانی

حمیرا ثاقب

ہم نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں ابن صفی کا چرچا سنا، ابو جان نے ان کی تمام کتابیں ہم بچوں کی دسترس میں رکھی تھیں، اردو سے محبت اور پڑھنے کی صلاحیت ہمیں ورثے میں ملی تھی، اس لیے جوں ہی پڑھنا آیا ہم نے ابن صفی کو پڑھنا شروع کر دیا۔

ہمارے ابو جان ہمارے بہت اچھے دوست بھی تھے، ہم نے ان کے ساتھ مل بیٹھ کر ابن صفی کو پڑھا، ڈسکس کیا اور سراہا، ہمیں آج بھی یاد ہے کہ ابو جان کو لاہور کے علاقے اقبال ٹاؤن اور اس کے گرد و پیش میں موجود تمام لائبریریوں کا پتا تھا، جہاں سے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ابن صفی کے ناول لاتے تھے، ناولوں کے آخر میں دی گئی فہرست کے مطابق جو ناول ہم نے پڑھا ہوتا، اس کا نام لکھ کر ابو جان کو دیتے اور وہ تلاش کر کے لاتے۔

ہمارا پورا خاندان ابن صفی کے قلم کا اسیر تھا، آج بھی ہم سوچتے ہیں تو بہت لطف آتا ہے، ابو جان کی فیکٹری میں کام کرنے والے تقریباً تمام ملازمین بھی ابن صفی کے دیوانے تھے، ان سب نے مل کر سیکریٹ سرورس بنا رکھی تھی، فیکٹری دانش منزل تھی اور ابو جان سر سلطان۔

ایک ملازم کے نسوانی خدو خال کی وجہ سے اسے جولیا کا نام دیا گیا اور اسی طرح سب نے اپنے پسندیدہ کردار بانٹ رکھے تھے، ان کی دل پسند تفریح فرصت کے اوقات میں عمران سیریز کے ڈائلاگ دہرانا اور مختلف مناظر کو عمل کرنا شروع ہوتا تھا۔

جب ہم اس بارے میں سوچتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سب ابن صفی کی جادو بیانی کے شکار ہوں، ایسا جادو جو سرچڑھ کر بولتا ہے اور جس کی تاثیر وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے کیونکہ کتاب میں لکھے جملوں اور حالات و واقعات کو لفظ بہ لفظ سمجھی یاد کیا جاسکتا ہے جب وہ ناول، کردار، واقعات اور مناظر آپ کے سر پر ہر وقت سوار ہوں، ورنہ تو نصیابی کتب بھی لفظ بہ لفظ یاد نہیں ہوتیں۔

اردو جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ابن صفی کے سحر آفریں قلم کے ہم ایسے اسیر تھے کہ کئی مواقع پر ان کے قلم سے نکلے ہوئے جملوں نے بہت یادگار صورت حال بنادی، ہم آج بھی جب اس چوٹیشن کو یاد کرتے ہیں تو ہمارے لب مسکرا اٹھتے ہیں۔

ہمیں یاد ہے جب ہم آٹھویں جماعت میں تھے تو ایک دن ہماری بہن کھانے کیلئے پلیٹیں رکھ رہی تھی، ہم نے اسے کسی بات پر تاؤ دلایا تو وہ غصے سے پھر گئی اور ہاتھ میں پکڑی آٹھ دس پلیٹیں ایک ساتھ گھا کر ہماری طرف ارسال کر دیں، اچانک عمران کی ریڈی میڈ کھوپڑی کی طرح ایک بات ہمارے ذہن میں کلبلائی اور ہم بجلی کی تیزی سے زمین پر بیٹھ گئے، نتیجتاً تمام پلیٹیں دھڑا دھڑساٹے موجود نشے سے جاگرا گئیں اور شیشہ چھناک سے زمین پر آگرا، واللہ یہ بالکل سچ ہے کہ عمران سیریز نے ہمیں بچالیا، ورنہ ہم یہ کہانی آپ کو مزے لے لے کر سنانے کے قابل نہ ہوتے۔

جب ہم نے مضمون لکھنا شروع کیا تو ہمارا خیال تھا کہ جس مصنف کو اب تک ہم نے بس پڑھا ہے اور پوری عقیدت سے پڑھا ہے ان کے بارے میں لکھنا شاید ہمارے لئے ناممکن نہ ہو پائے، بہت دنوں سے مضمون ادھورا پڑا تھا لیکن ایونٹ کی سب تحریریں پڑھ پڑھ کر ہمارے اندر بھی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا، اس لیے ہم نے بھی اپنے

احساسات کو لفظوں کا روپ دیدیا ہے۔

ابن صفی کے قلم کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، ان کی شاعری ہو یا طنز و مزاح پر مشتمل مضامین، عمران کی حماقتیں ہوں یا فریدی کی متانت، حمید کی شوخیاں ہوں یا قاسم کی بگڑی شین، قاف، ہر ہر موقع پر ان کے قلم کا میعار یکساں ہے، کوثر و نسیم میں دہلی اردو پڑھ پڑھ کر آج ہم اس قابل ہیں کہ لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ ہم پنجاب کے دیہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابن صفی کی کردار نگاری اتنی بھرپور ہے کہ وہ تمام کردار ہماری جیتی جاگتی دنیا کے باسی لگتے ہیں، ان کے بہت سے مکالمے ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکے ہیں، ان کی جغرافیائی معلومات اتنی کامل تھیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے جب ذرائع محدود تھے تو انہوں نے صرف اور صرف اپنے ہمہ جہت مطالعے سے ہمیں دنیا جہان کی سیر کیسے کرادی...؟ منظر نگاری اتنی عمدہ کہ شام کے کھٹ پٹے کا ذکر پڑھتے ہوئے روز روشن دھندلا جایا کرتا، سائنس اور ایجادات پر لکھا تو موجودہ زمانے کی ایجادات کو بیان کر دیا اور پڑھنے والا حیرت کہہیں ابن صفی سائنس دان تو نہیں؟

آخر میں ہم یہی کہیں گے کہ اردو ادب پر ابن صفی کا بہت احسان ہے کہ انھوں نے اپنے تابدہ قلم سے اردو کو نئی زندگی دی، بے مقصدیت اور فحاشی سے پاک، صاف ستھرا ادب دیا، جو قاری کو قانون و دوست و انصاف پسند بناتا ہے، اور اس کے کردار کی تصویر میں نمایاں رول نبھاتا نظر آتا ہے۔

ابن صفی نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کی تربیت میں اہم رول ادا کرتا رہے گا، رہتی دنیا تک ابن صفی کے قلم کی جادو بیانی قائم رہے گی، اردو پڑھتی پھلتی رہے گی اور انسانیت نازاں و فرحاں رہے گی۔

زاغوں کے نرغے میں ہیں عقابوں کے نشیمن

اسماعیل بن محمد

(معذرت! تحریر ہذا اصل موضوع "ابن صفی ایک عہد، ایک رجحان" سے ہٹ کر انشاء پر دازی کی طرف نکل گئی۔۔۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی تحقیقی مقالہ ٹائپ چیز ہوگی، لیکن اس کے لیے حوالہ جات درکار ہوتے ہیں جنہیں مہیا کرنا اس مختصر سے دورا لیے (ڈیڈ لائن) میں ناممکن تھا۔۔۔۔۔ لہذا دو چار موشگافیوں کے سوا کچھ نہیں کر سکا)

نقار خانے میں طوطی کی بھلا کون سنتا ہے؟ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔۔۔ اس پر غضب یوں ہوا کہ وقت نے ہم سے وقت یوں چھینا جیسے تیم کا مال چھینا گیا ہو۔۔۔ جیسا کہ حالیہ تقریب "ابن صفی ایک عہد، ایک رجحان" کے عنوان سے منعقد ہوئی اور ہر سیر کا سوا بلکہ ڈیڑھ سیر سامنے آیا، دل نے کہا کہ بھئی اسماعیل میاں! سنہری موقع ہے۔ کود بڑو، اور اپنا نام بھی لکھا ریوں کی صف میں درج کرواتے چلیو۔ مگر دماغ عالی نے تردید فرمائی۔۔۔۔۔ "رکو! گینڈوں کی لڑائی میں مینڈھوں کا کیا کام؟"۔۔۔ دل بھیانا راض ہوئے، کہ یہ محض اظہار عقیدت سے واسطے تھا۔ نام کا تھوڑی مقصد ہے، لہذا 26 جولائی سے پہلے پہلے۔۔۔۔۔ بات بہر حال عقل کل میں آہی گئی، ویسے بھی دل بھیانا راض نہیں کیا جاسکتا، ورنہ گلی گلی جوتیاں پٹختے پھرتے اور کہتے جاتے۔

"دل مرحوم کو خدا بخشے۔

ایک ہی نگہ سار تھا، نہ رہا۔"

چنانچہ آج پہلی ہی فرصت میں بمؤرخہ 25 جولائی، نالائق جب یہ سطور رقم کرنے بیٹھا ہے،

[illegible]

زراعت جوشی:

زارغ کوہی:

چہ، بے چارے پیشہ ور! لفظ کوہی سے ”سرز کہستانی“ یاد آتا ہے، یعنی سخت کوش، محنت مزدوری کرنے والے۔۔۔ ان سے ہمدردی کیجئے حضرات، وقت بڑی خال شے ہے۔۔۔ روزی کمانے کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا؟؟؟؟ سچی تو عقاب ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ۔۔۔ ”مجھے تو اپنے ان کماؤ پوتوں پر فخر ہے جو دوسروں کا ذریعہ معاش بن کر مجھی ایک اہم خدمت سرانجام دے رہے ہیں“۔۔۔

مرغ روحانی: (سبھی طور محاورہ تا مرغ ہی کہلا میں گئے)
تمام کالے پیلے اور نیلے عملیات کی کاٹ پلٹ کے ماہر۔

”روحانی عامل، مرہد کامل، گرو گھنٹال، پیر باکمال، علامہ حضرت مولانا ایکسٹو رحمۃ اللہ علیہ دامت برکاتہ؟“
 نامہ امیدی کفر ہے۔۔۔ آپ کے تمام مسائل اور پریشانیوں کا شافی علاج، پتھر دل محبوب آپ کے قدموں
 میں۔ (جولیانہ کے لیے خوشخبری بے جہیز)۔۔۔ شوہر کا غیر عورتوں میں دلچسپی لینا۔ (آہ رہے! بے چارہ سو پر
 فیاض)۔۔۔ اولاد کی بندش۔ (عمران کے ولد الحرام بچے کے لیے تازیانہ)۔۔۔ رشتے کا نہ ملنا۔ (سلیمان کے لئے
 درس عبرت)۔۔۔ سن پسند شادی (تنویر کا الہ)۔۔۔ طلاق میں رکاوٹ۔ (گرانڈیل قاسم کی چھٹکی
 بیگم)۔۔۔ کے لیے آج ہی تشریف لائیں اور من مانی مراد پائیں۔۔۔ ملنے کا پتہ: آستانہ عالیہ دانش منزل۔۔۔
 کچھ اس قسم کے اشتہار آپ کو سر بازار راغبیروں کا منہ چراتے ملیں گے۔۔۔ جی ہاں! یہ بصارت کا دھوکہ نہیں
 بلکہ روحانی زناغوں کے کالے علم کا کرشمہ ہے۔۔۔

زارع خطبی:

عموماً جنسی خطہ میں مبتلا ہوتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ان کے اندر ایک عدد ”راسپوٹین“ پوشیدہ ہو۔۔۔ (راسپوٹین۔ ایک روسی شیطان)۔۔۔ جب اسے آسودہ کر لیا تو دوبارہ پارسائی کے جامے میں چلے گئے، البتہ وہ جو اسے نہیں مانتے، بھل کر سامنے آتے ہیں اور رسوائی و حُکِ ہنسی کا سامان کرتے ہیں۔ بقول میر

”میر کا حال نہ پوچھو تم کہنے رباط سے پیری میں۔
رقص کناں بازار تک آئے عالم میں رسوائی ہوئی۔“

طرمخانی:

[illegible]

”افکار کی اقلیم وراثت ہے ہماری۔“

اور اس کے سوا ہم کو میسر نہیں کچھ بھی۔“

اور بے جا رہے، چہ!!!!

نیشمن ہی کے لٹ جانے کا غم ہوتا تو کیا غم تھا،

یہاں تو بیچنے والے نے گلشن بیچ ڈالا ہے“

ابن صفی سے ابن آس تک

ابن آس

کوئی نو برس کا تھا جب پہلی بار عمران اور ابن صفی کا ذائقہ منہ کو لگا..... وہ عمر ایسی نہیں تھی کہ پڑھنے والا یہ دیکھ کر کتاب ہاتھ میں لے کر لکھنے والا کون ہے.....!

ہم غریب آباد کی جھکیوں میں رہتے تھے، جولیاقت آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن کے ساتھ آباد تھیں، نوے فیصد جھکیوں میں مزدور رہائش پذیر تھے، میرے والد بھی ایک مزدور تھے، جیسا کہ مزدور گھرانوں میں بچوں کی زندگی ہوتی ہے، ویسی ہی ہماری زندگی تھی، کھانے کو مل جاتا تو سپنے کو نصیب نہ ہوتا، ڈھنگ کے کپڑے نصیب ہوتے تو پیروں میں چپل نہ ہوتی۔

غریب آباد کے سارے ہی بچے چیتھروں میں مل بڑھ رہے تھے، اپنی بھی یہی حالت تھی، ریلوے لائن کے پرے ایک باغیچہ تھا، جو شاید اب بھی ہے، زیادہ تر بچے اسی باغیچے میں مڈے اور بھمیریاں پکڑتے یا کتے مارتے یا بہت ہوا تو بچوں کے روایتی کھیل کھیلتے، اس ریلوے لائن کے ساتھ ایک چھوٹا سا ککڑی کا کیمین تھا..... اجو چچا کا کیمین۔

اجو چچا بہت کم پڑھے لکھے تھے، عمر اس وقت کوئی 80 برس تو رہی ہوگی، سارا دن کیمین میں آگے کو نکلے ہوئے تختے پر پہ بیٹھے رہتے تھے، جوزین سے کوئی دو فٹ اونچا تھا، کچھ برنیاں تھیں جن میں ٹافیاں، گولیاں اور بسکٹ وغیرہ ہوتے، وہ ان کے سامنے قطار میں دھری رہتیں اور کیمین کے اندر تین اطراف میں چھوٹے چھوٹے ریک تھے جن میں گرد آلود کتابیں بٹھسی ہوئی تھیں۔

ایک دن اجو چچا نے مجھے ریلوے لائن پر بیٹھے دیکھا، میں ایک برانا سا پھٹا ہوا ناول پڑھ رہا تھا جو ایک کھاڑی کے ٹھیلے سے لپکا تھا، وہ کوئی جاسوسی ناول تھا، شاید اکرم الہ آبادی یا منشی تیرتھ رام فیروز پوری کا کچھ اندازہ نہیں کیونکہ ناول کے ابتدائی صفحات پھٹے ہوئے تھے۔

اجو چچا نے مجھے آواز دے کر بلایا، اور پوچھا۔ "کیا پڑھ رہا ہے۔؟" میں نے کتاب ان کے سامنے رکھ دی، وہ الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، پھر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "پڑھ لیتا ہے اردو۔؟"

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

انہوں نے اپنے کیمین کی ریک سے ایک ناول نکالا اور مجھے دیتے ہوئے کہا:

یہ ترجمے مت پڑھا کر، یہ گندے ہوتے ہیں، یہ پڑھ۔"

میں نے دیکھا، اس کتاب پر عمران سیریز لکھا تھا شاید خوف ناک عمارت نام تھا۔

میں اس کتاب کو لے کر ریلوے لائن پر ہی بیٹھ گیا شام ہونے والی تھی، جب تک اندھیرا نہیں پھیلایا میں اس کتاب کو پڑھتا رہا اور ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا، کھانا پینا بھول گیا، کتاب تو خبر میری سمجھ میں پوری نہیں آئی،

بہت سی باتیں سر سے گزر گئیں، مگر جب تک پڑھتا رہا مزہ آتا رہا، چونکہ میں چھوٹی عمر میں قرآن پڑھ چکا تھا، اس لیے تیسری چوتھی کلاس میں ہی اخبار پڑھنے لگا تھا، بہت سے الفاظ اور جملوں کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا، مگر لفظ

درست پڑھ لینے کی عادت ہو گئی تھی۔

وہ پہلا ناول تھا جس کا ذائقہ میرے منہ کو لگا، بس پھر میں روز اسکو لے آتے ہی اجو چکا کے کہیں پر پہنچتا جو ہمارے گھر والی گلی سے نکلتے ہی ریلوے لائن کے ساتھ ہی تھا، ان سے ایک کتاب لیتا اور ریلوے لائن پر یا باغیچے کے کسی درخت کی اونچی اور موٹی ٹہنی پر بیٹھ کر مزے سے کتاب پڑھتا، درجنوں عمران سیریز پڑھ ڈالیں اور رفتہ رفتہ سمجھ میں بھی آنے لگیں، اور میری اردو بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئی۔

مزے کی بات یہ بھی کہ میں اس میں جو بھی نیا لفظ پڑھتا اس کا مطلب مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آتی، دو چار کتابوں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس لکھنے والے کا نام "ابن صفی" ہے اور اس کی کتاب میں جو نیا لفظ پڑھتا ہوں اس کے معنی فقرے کی مناسبت سے خود بہ خود سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

اجو چکانے مجھے سبھی کتاب کے پیسے نہیں مانگے، اصل میں وہ لائبریری نہیں تھی، اجو چکا کا کہیں تھا، جس میں وہ اپنی زندگی کے بچے مجھے دن گزار رہے تھے، یہ ان کی ذاتی کتابیں تھیں جن کی ان کے بیٹے اور بہو کے گھر میں جگہ نہیں تھی، جو اس کہیں کے چچے ہی تھا، (گھر کے دروازے کے ساتھ ہی کہیں تھا) اس لیے انہوں نے ایک کہیں بخوا کر اپنی کتابوں کو اس میں رکھ لیا تھا اور اسی کہیں کو اپنا گھر بنالیا تھا۔

عمران سیریز کے وہ ناول پڑھ کر ہی مجھے بڑھنے کا یہ پہلا شعور ملا کہ کتاب اس کے رائیٹر کو دیکھ کر پڑھنی چاہیے، مجھے ابن صفی بھا گیا تھا، جنھن ساتھ ستر فیصد کہانی سمجھ میں آتی تھی، مگر زبان دیوان اور کہانی کا بہاؤ مجھے اپنے ساتھ بھا کر لے جاتا تھا، اجو چکا کے اس کہیں میں کوئی چار سو کے قریب کتابیں تھیں، اور سب عمران سیریز تھیں، وہ ابن صفی کے عاشق تھے اور عمران سیریز کے دیوانے، ابن صفی کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں کی عمران سیریز تھیں ان کے پاس، جب ابن صفی کی عمران سیریز کے سارے ناول جوان کے پاس تھے سب پڑھ لیے تو انہوں نے مجھے جاسوسی دنیا کے ناول دینا شروع کر دیئے، مگر مجھے بالکل مزہ نہیں آیا، وہ میری سمجھ میں ہی نہیں آتے تھے، میں نے واپس کیئے تو اجو چکانے دوسرے ادیبوں کی عمران سیریز دینا شروع کر دیں، نجمہ صفی، ابن صفی، ابن صفی، ایچ اقبال، ایم اے راحت، اور نہ معلوم کون کون سے نام تھے، اس وقت یاد نہیں کہ اجو چکانے ان کے علاوہ کن ادیبوں کی عمران سیریز پڑھنے کو دیں، مگر سچ بات ہے مجھے کبھی ایب کی عمران سیریز پڑھنے میں مزہ نہیں آیا اور دس بارہ صفحے پڑھ کر ہی میں واپس کر دیا کرتا کہ مزہ نہیں آ رہا، تب اجو چکا مسکراتے اور کہتے:

"عمران سیریز صرف ابن صفی کو ہی لکھنا آتی ہے، باقی سب لوگ ان کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ابن صفی کوئی نہیں بن سکتا۔"

میں اس زمانے میں بہت سی کہانیاں خود بھی لکھ چکا تھا، غریب آباد کی جھکیوں میں سب کو ہی معلوم ہو چکا تھا کہ آس محمد مزدور کا بیٹا کہانیاں

لکھ لیتا ہے، اس وقت میرے دل میں ایک خیال آیا کہ میں بڑا ہو کر ابن صفی بنوں گا، یہ بچکانہ سا خیال تھا، آج کبھی کبھی یہ بات یاد آتی ہے تو ہنسی آ جاتی ہے۔

بہر طور، ابن صفی نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا، جتنی کتابیں اجو چکا کے پاس تھیں وہ سب میں نے پڑھ ڈالیں، ابن صفی کا عشق مجھے وہاں تک لے گیا کہ میں نے ان کی کتابیں دھونڈ دھونڈ کر جمع کرنا شروع کر دیں، (اس وقت تک میں کم سن ہی، مزدوری شروع کر چکا تھا، یہ کوئی 80 یا 81 کی بات ہے، مزدوری کے ساتھ ساتھ ٹھیلوں سے، کباڑیوں سے، کتابیں خرید خرید کر جمع ہونا شروع ہو گئیں، غالباً 82 میں، میں نے اور کئی ٹاؤن میں ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے کر "شانی لائبریری" کی بنیاد رکھی، ابن صفی کی تقریباً سبھی کتابیں میرے پاس موجود تھیں،

ابن صفی کے پرستاروں اور پڑھنے والوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔

وہ کتابیں پڑھنے اور خاص طور پر ناول پڑھنے کا دور تھا، (شاید اپنے اختتامی دور کی طرف بڑھ رہا تھا) میں ابن صفی کا دیوانہ تھا، مگر ان کی کتابیں اب کم ہی آتی تھیں، میری اپنی کہانیاں رسالوں اور ڈائجسٹوں میں شائع ہونے لگی تھیں، مجھے جب بھی دکان میں وقت ملتا میں ابن صفی کا کوئی ناول اٹھا تا اور پڑھنے لگتا، جاسوسی دنیا کے تمام ناول اسی دوران پڑھے تب اندازہ ہوا کہ عمران سیریز تو جاسوسی دنیا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔

اس دوران کا عمران سیریز کے ذریعے میں غیر ملکی سری ادب کے مصنفین "اے اے فیئر، اگا تھا کر سٹی، جیمس ہیلڈ لے چیز، مانک بریٹ، برام اسٹوکر، الیسٹر میک لین، ارل ایشٹیل، گارڈنر، پیٹرک ٹوئین، روز میکڈونلڈ، رچرڈ ایس آرتھر، کارٹر براؤن، مشل ایوالون، جان ڈی میکڈونلڈ، ایڈورڈ ایس آرتھر، برکلی گری، رائڈر ہیگرڈ، ڈان بیٹلانی، سیکس روہمر، ایڈ گرویل، جان ڈکن کار، برٹ ہالڈی، جین بروس، جان کریزی، ایڈورڈ ایس آرونز، نک کوری، مکی پھلین، ہلمیری دوگ، نجی سنکسٹر جیسے ادیبوں کے جاسوسی ناول پڑھ چکا تھا، جن کے تراجم اثر نعمانی، سراج الدین شیدا، طاہر رانا، الف ایم صدیقی، صدیق احمد، مسلم رحمانی اور کچھ دیگر لوگوں نے کیے تھے، (اثر نعمانی کے تراجم کی تو کیا ہی بات تھی، طبع زاد ناول کا گمان ہوتا تھا)

یہ سب نام لکھنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ابن صفی کو یوں ہی پسند نہیں کر لیا، جاسوسی ادب کے تمام سرخیلوں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ ابن صفی ان میں سے کسی سے کم تر نہیں، بلکہ کئی ایک سے تو بلاشبہ بالاتر ہیں۔
ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ تراجم کسی اللوجنوا دیب نے کیے ہوں اور ان کا تاثر اچھا نہ رہا ہو، جن لوگوں نے یہ تراجم پڑھے ہیں خاص طور پر اثر نعمانی مرحوم کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کیا کمال لکھنے والے تھے، بہر طور ابن صفی ان سب کو پڑھنے کے باوجود اپنا جادو جگانے میں اور اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب رہے، میں ان کا دیوانہ ہوتا چلا گیا۔

میری لائبریری سے کتاب لے کر پڑھنے والا اگر کوئی شخص ابن صفی کا کوئی ناول پڑھ کر کہتا کہ یار مزہ نہیں آیا مجھے مظہر کلیم کا ہی ناول دے دو تو یقین کیجیے میں اس سے جھکڑ پڑتا، اور کہتا کہ تمہیں پڑھنے کی تمیز ہی نہیں ہے اور اس کے بعد میں اس کا ہک کو بھگا دیتا، اور پھر کبھی کتاب کرائے پر نہ دیتا۔
بہر طور ابن صفی کو اتنا دیوانہ وار چاہنے کے بعد ایک دن مجھے خیال آیا کہ ابن صفی سے ملنا چاہیے، میں اورنگی ٹاؤن سے نکلا اور ڈھونڈتا ڈھونڈتا لیاقت آباد پہنچا، مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ابن صفی تو یہاں سے جا چکے ہیں اور ان کا انتقال ہو گیا ہے، آج سوئم ہے۔

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت میری کیا کیفیت رہی ہوگی، مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا باپ مر گیا ہے، میں چھوٹا سا تھا، بہت ڈھونڈا مگر مجھے
ان کا گھر نہیں ملا، میں اندر ہی اندر اپنی بد قسمتی اور بے بسی پر روتے ہوئے اورنگی ٹاؤن واپس چلا گیا، یہ تھا ابن صفی سے میرا تعلق۔

تین افراد کا خاص طور پر میرے لکھنے پر بہت اثر رہا، یا جن سے میں بہت متاثر رہا ان میں ابن صفی، اشتیاق احمد اور نجی الدین نواب صاحبان شامل ہیں، یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ آج یہ تینوں ہی اس دنیا میں موجود نہیں مگر تینوں کی لکھی ہوئی تحریروں ہماری قیامت تک رہنے والی ہیں۔

ابن صفی کو ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی نام نہاد ادب کے نام نہاد لکھاری ادب کا حصہ ماننے سے گریز ال رہے، حالاں کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی، (وقت نے ثابت بھی کیا، آج انہیں کوئی جانتا بھی نہیں،

جبکہ ابن صفی کو جاننے والے، پڑھنے والے مسلسل پیدا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے)

میں حکم کھلا اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ جو ادیب ابن صفی کو ادب کا بڑا نام نہیں مانتا اس کی اپنی ادبی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے، کوئی مانے یا نہ مانے میں ابن صفی کو ادب کا ایک اہم نام تصور کرتا ہوں، یہ ہمارے اردو ادب کی بدقسمتی ہوئی کہ ابن صفی کی تحریروں کو ادب کا حصہ نہ شمار کیا جائے، ابن صفی نے جو لکھا وہ خالصتاً ادب اور اردو لٹریچر کا خزانہ ہے، ابن صفی کی تحریروں کو ادب میں شامل کیے بغیر ادب کی تاریخ اور اردو لٹریچر کی کوئی حیثیت نہیں، جنہیں میری اس بات سے اختلاف ہے مجھے ان کی ادبی حیثیت سے ہی اختلاف ہے۔

ابن صفی آج بھی میری لائبریری میں موجود ہیں اور انہی کتابوں کے ریکس میں ہیں جہاں منٹو، بیدی، عصمت، انتظار حسین، انور سجاد، اسد محمد خان، بانو قدسہ، فرح العین حیدر، کی کتابیں موجود ہیں، انہی ریکس میں محی الدین نواب، علیم علیم، مشتاق احمد قریشی، شمیم نوید، شکیل عادل زادہ، انور علیگی، اظہر کلیم، ایم اے راحت کی کتابیں بھی موجود ہیں۔

جہاں تک ابن صفی کے کرداروں عمران اور فریدی کو عکس بند کرنے کا تعلق ہے، لوگ مانیں یا نہ مانیں، مگر میں ان کو عکس بند کرنے کے خلاف نہیں بلکہ حق میں ہوں، میں جانتا ہوں کہ ان کرداروں کو پورے کرنا کسی بھی اداکار کے لیے ناممکنات میں سے ہے، مگر یہ کوئی جواز نہیں ہے، دنیا کے ایسے بہت سے کردار ہیں جنہیں عکس بند کیا گیا ہے، جب کہ وہ ریڈر کے خیال پر پورے اتر ہی نہیں سکتے، لیکن انہیں فلموں اور ٹی وی کے ذریعے بلکہ کارٹون تک بنا کر پیش کیا گیا، اور ٹیلیس انہیں آج بھی مختلف اداکاروں کی شکل میں دکھاتی ہیں۔

عمران اور فریدی بھی ایسے ہی کردار ہیں، ان پر فلمیں بھی بنی چکی ہیں اور ڈرامے بھی، حتیٰ کہ ان کے تمام ناولوں کی کامس بھی بنانے کی ضرورت ہے یہ ہمارے لچر کردار ہیں، ان کو ہر شکل میں پیش کیا جانا چاہیے، بلکہ میں تو احمد صفی بھائی سے درخواست کروں گا کہ ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے تمام ناولوں کے "بچوں کے لیے ورژن" بھی لکھوائے جائیں (کسی اچھے اور مستند لکھاری کے ذریعے)

ابن صفی کے تمام ناولوں کے آسان لفظوں میں (چوتھی تا آٹھویں یا دسویں جماعت کے بچوں کے لیے) ایڈیشن تیار کیے جائیں، جیسا کہ دنیا کے ہر کلاسک ناول کو کیا جاتا ہے، خود میرے بچے اسکول میں شیکسپیر کے ڈراموں کا وہ ورژن پڑھتے ہیں جو بچوں کے لیے ایڈٹ کیا گیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے ناولوں کو بچوں کی عمری اور ذہنی سطح کے اعتبار سے متعلق نہ کیا جائے؟

ابن صفی کے بارے میں لکھنے بیٹھو تو قلم رکسنے کا نام ہی نہیں لیتا، یہ مجھے آج اندازہ ہوا، بہت سے موضوعات ہیں ابن صفی کے حوالے سے جن پر بات ہو سکتی ہے، جن لوگوں نے اس ایونٹ میں ابن صفی کے حوالے سے لکھا وہ کمال ہے، سچی بات ہے میں ان نابز ہستیوں اور قلم کاروں کے جیسا ایک بھی پیرا گراف لکھنے میں ناکام ہوں، بس جو مناسب سمجھا لکھتا چلا گیا۔

ویسے ابن صفی ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں، انہیں "سری ادب" کا بڑا قلم کار کہہ کر انہیں خانے میں بند نہ کیا جائے، جب بھی ابن صفی کا نام لکھا جائے تو انہیں "اردو ادب کا ایک اہم ادیب" لکھا جائے، ان کی تحریروں میں سری یا غیر سری ادب کے خانے سے بہت باہر کی چیز ہیں، پھر ان کی شاعری ان کی طنزیہ، مزاحیہ تحریروں، ان کے مضامین، ان کی شخصیت، ان کی صحافت، ان کی سائنسی سوچ جو بوجھ، ان کے خطوط، ان کی زندگی اور شخصیت پر لکھی گئی کتابیں، شکرال، پھر ڈائجسٹ، ابن صفی کی پیروی کرنے والے اور ان کے کرداروں پر لکھنے والے ادیب، ابن صفی کا انگریزی ترجمہ، ان پر ہونے والا تحقیقی کام، کیا کچھ نہیں ہے جس پر لکھا جاسکتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں میں، ان کی کہانیوں میں، ان کے کرداروں میں وہ تنوع ہے جس پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، اور لکھی جاتی ہیں، لکھی جانی رہیں گی، ان کے سیاسی شعور، ان کے فلسفے، پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، جس طرح کی رومانیت ان کے ناولوں میں ہے اس کی جھلک کہیں اور دکھائی نہیں دیتی، میری اتنی صحیفہ نہیں کہ ابن صفی پر کچھ لکھ سکوں، ہاں ابن صفی کے ایک ادنیٰ قاری اور ان کے ایک مبتدی کی صحیفہ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ ابن صفی جیسا نہ کوئی تھا، نہ کوئی ہے اور شاید آئندہ کوئی ہو بھی نہیں سکے گا۔

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و درپیدا"

جیسا شعر شاید ابن صفی جیسی ہستیوں پہ ہی خلق ہوا تھا۔

میر تقی نام ابن آس ہے، یہ نام اپنی قلمی تحریروں کے لیے میں نے نہیں رکھا، ایک ایڈیٹر (کاوش صدیقی) نے رکھا تھا، میں محمد اختر آس کے نام سے لکھا کرتا تھا، انہوں نے پوچھا "یہ آس کیا غلط ہے؟" میں نے کہا "نہیں، میرے والد کا نام ہے آس محمد۔" ایڈیٹر صاحب شاید میری طرح ابن صفی کے پرستار تھے، انہوں نے میری اگلی کہانی پر تحریر: "ابن آس" چھاپ دیا، یہ کوئی 86 کی بات ہے، اور تب سے اسی نام سے لکھ رہا ہوں، سچ بتاؤں، جب یہ نام مجھے ملا تھا تب میرے اندر ایک خوشی کا تاثر پیدا ہوا تھا کہ چلو میں ابن صفی تو نہیں بن سکتا، لیکن ابن صفی جیسا نام تو مل گیا، محبوب جیسا بن جانے کی کوشش ہی تو محبت کہلاتی ہے، اور محبت میرا پہلا اصول ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ آج میں جو دو چار فقرے لکھ لیتا ہوں یا دو چار فقرے پڑھ کے سمجھ لیتا ہوں، یہ ابن صفی کو پڑھنے کا اعجاز ہے، اگر انہیں پڑھا نہ ہوتا تو شاید لکھنے کے قابل ہی نہ ہوتا۔

مجھے ہنسی آتی ہے ان لوگوں پر جو ابن صفی کو پڑھ کر پڑھنے، لکھنے کے قابل ہوئے، وہ کہتے ہیں کہ ابن صفی کا ادب عالیہ سے کوئی تعلق نہیں، شرم بھی تو نہیں آتی ان لوگوں کو، ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے قریبی دوست بھی اذیت نہیں مانتے۔

لو یو ابن صفی، آپ زندہ رہنے کے لیے پیدا ہوئے تھے، اور امر ہونے کے لیے دنیا سے گئے، آج ابن صفی کی برسی ہے، اور برس کے برس یہ برسی یاد دلانی رہے گی کہ:

"کوئی ابن صفی تھا جو نہ ہوں سے مجھ نہیں ہو سکتا"

ابن صفی۔ ایک کردار ساز شخصیت

داور عزیز

آج بھی کوئی نہیں مانتا کہ میں نے ابن صفی کا پہلا ناول اس وقت پڑھا تھا جب میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا، ناول کا نام تھا سازش کا جال اور سن اٹھایا 1973۔

احوال کچھ یوں ہے کہ دادا جان مرحوم نے اپنے چاروں بیٹوں اور پھر اس پہلے پوتے کو ابن صفی زدہ کر رکھا تھا، سازش کا جال سے وہ سازش شروع کی کہ آج بھی اسی کا شکار ہوں، اندازہ ہے کہ ہر ایک ناول کوئی 35 یا 40 مرتبہ پڑھ رکھا ہے اور اس کے باوجود کہ یہ سلسلہ 1989 سے تو اتر نہیں پکڑ سکا، میں ابھی بھی سیر حاصل مقام نہیں پاسکا۔ بھلا سمندر بھی کوئی ختم کر سکا ہے؟ عمر کے ساتھ ساتھ ابن صفی کے ناول بھی نت نئے اسرار کھولتے رہے اور اندازہ ہے کہ یہ جن اب بوتل میں جانے والا نہیں، الٹا پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

ناول میں تو لازوال کردار ہوتے تھے مگر پیش رس میں خود ابن صفی صاحب موجود ہوتے تھے، پوری جاذبیت

کے ساتھ اور پورے پیغام کے ساتھ، مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ پیش رس ہی تھے جنہوں نے مجھے ابن صفی کا گرویدہ کیا تھا، ایسی گہری بات ایسے لطیف پیرائے میں کر جاتے تھے کہ اہل ادب انگشت بدنداں رہ جاتے، آج بھی ایک جملہ وہ سرور دیتا ہے کہ بڑے سے بڑا اور اونچا عارفانہ کلام بھی وہ تاثیر نہیں رکھتا، ایک صاحب کے سوال پر کہ آپ (ابن صفی) کس "ازم" کے قائل ہیں، کے جواب میں فرماتے ہیں:

"میں تو اللہ کی ڈکثیر شپ کا قائل ہوں، جس میں چوں و چراں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔"

حاکمیت اعلیٰ اور فلسفہ خداوندی پر اتنا مختصر مگر بھرپور تبصرہ میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔

اس پیچیدگی کی کردار سازی میں بیشتر حصہ ابن صفی صاحب اور ان کے کرداروں نے بھی ڈالا ہے جو وطن کی محبت سے سرشار اور طاغوت سے ہر لحظہ سر پیکار رہتے تھے، اللہ تبارک و تعالیٰ سے خصوصی عاجزانہ التماس ہے کہ ابن صفی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے..... آمین!

صرف اٹلی کوٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی آرزو کشاں کشاں کھینچ لائی اس بزم پر ستاراں میں، وگرنہ کہیں خوردہ طاق میں رکھے ٹٹماتے چراغ کا کیا ظرف، کیا حوصلہ کہ کرہ زمہریر کو بھی پکھلا دینے والے آفتاب کی مداح سرائی میں رطب اللسان ہو سکے۔

ابن صفی کے پیشرس کی دنیا

احتشام شاہ

کسی مشہور ہستی کا قول ہے کہ کچھ کتابیں پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں کچھ چبانے کے لیے، کچھ چبا کے نگلنے کے لیے، تو بلاشبہ ابن صفی صاحب کی تمام تصنیف کے لیے مؤخر الذکر کا گمان ہوتا ہے، ارے نہیں گمان نہیں ہوتا بلکہ ایسا ہی ہے۔

اکثر تحریر میں لوگوں نے الفاظ کی کم مانگی والی باتیں کہیں، میں خاموشی سے پڑھتا رہا اور حیرت زدہ بھی رہا، اتنے سیانے لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں، مگر اب جب اپنے سر پر یہ بار گراں آیا ہے تو محسوس ہو رہا ہے کہ واقعی کچھ ایسی ہی کیفیات ہو جاتی ہوں گی سچی کی، مگر خیر چھوڑیے۔

اب جب قلم اٹھا چکا تو رکھنے کی تاب بھی نہیں ہے، آخر کو اٹھایا کس کی مدح سرائی کے لیے ہے؟ بحیثیت احقر اعظم میں یہ خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہوں کہ میں ابن صفی کا ایک ادنیٰ سا قاری ہوں، میں کسی بھی دور میں ابن صفی صاحب کی شخصیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکا۔

مگر اس دل ناداں کا کیا کریں، بقول غالب:

"دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

اس درد دل کی دوا کیا ہے"

تو اس درد کی دوا یہ تجویز ہوئی کہ ہر حال میں ابن صفی صاحب کو خراج تحسین پیش کر کے ہی دم لیں گے۔

میں نصابی کتابوں میں گھر اہوا ایک کیڑا ہوا کرتا تھا، یعنی کورس بک ورک، لیکن اپنی باغیانہ طبیعت نے یہاں بھی کام کر دکھایا، میٹرک کے ایگزاس کے بعد ہم اپنی خالہ کے گھر پہنچے، جہاں اپنی عادت کے عین مطابق اور پر والی الماری نیچے اور نیچے والی اوپر کر دی، نتیجتاً ہاتھ آیا ماہنامہ جاسوسی؟ انجسٹ، پڑھتے رہے، کئی کہانیوں کو پڑھ کر لگا کہ یہ تو انگلش قلموں سے اخذ ہیں۔

مگر کیا کریں طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے، کچھ نہ کچھ پڑھتے رہنے کی عادت ایسی تو نہیں کہ آسانی سے چھوٹ

جائے، تو بھی پڑھتے رہے پڑھتے رہے، آخر ایک مرد مجاہد سے ملاقات ہوئی، ان کا نام تھا کاشف زیر اور کہانی کا نام تھا ”دشمن دوست“۔

آج بھی پوری تحریر یاد ہے، قیام تھوڑا سا تھا، اب اس کتاب کے؟ خیر پڑھ پڑھ کر، نئی نئی دریافتوں میں مزہ آنے لگا، آخر ایک روز قسمت نے یاد دہی کی، دستیاب دیکھیے کیا ہوا؟ بتاتے ہوئے تھوڑی ہچکچاہٹ ہو رہی ہے، وہ ایک ناول تھا، اس کے ٹائٹل ”سردوق“ پر لکھا تھا ”عمران سیریز“ اور مصنف کا نام بتانا ہی تو ہچکچاہٹ کی وجہ ہے، مصنف کا نام تھا مظہر کلیم، ناول جو پڑھنا شروع کیا تو ایسے مشغول ہوئے کہ کھانے پینے تک کا ہوش نہ رہا، وہ تو غیبت ہوا کہ بجلی بند ہوئی تو ہم نے اٹھ کر کھانا کھایا، ورنہ بھوکے پیاسے ہی پڑھتے رہتے۔

خیر سلسلہ چل لکھا، رزلٹ آنے تک میں خاصے ناول پڑھ چکا تھا، مزید بھی پڑھتا لیکن ایک پرانی بک شاپ جہاں سے میں آدمی قیمت پر ناول حاصل کرتا تھا، وہاں پر موجود ایک بزرگ اللہ ان کو جنت نصیب کرے، انہوں نے ہمیں ابن صفی صاحب کو پڑھنے کا مشورہ دیا اور ناول ”دردنوں کی ہمتی“ لاکے تھمایا۔

پڑھنا جو شروع کیا تو محسوس ہوا کہ یہ کیا؟ وہاں تو بھی ٹرائیں پی رہے ہیں، ڈانس کر رہے ہیں، نئے نئے جرائم کرنے کی سوچ رہے ہیں، زنا میں ملوث ہیں، بزدل بن گئے، خیر پیسے خرچ کیئے تھے پڑھنا تو تھا ہی، ویسے بھی میرے لیے یہ سب چیزیں تھوڑی عجیب تھیں، لیکن اصل عمران سے تو ہماری ملاقات ہی اس ناول کے ذریعہ ہوئی تھی۔

عمران بھی کیسا.....؟ بالکل ہماری طرح کا عام انسان، جس نے ایک جیب سے 250 گرام کا بم چھین کر سارے مخالفین کے پرچے نہیں اڑائے بلکہ خالی ہاتھ یا زیادہ سے زیادہ چانوروں سے لڑتا رہا، خیر اگلی دفعہ ناول لینے پہنچا تو بزرگ نے پھر ابن صفی صاحب کے ناول آگے رکھے، میں نے کہا بابا اٹھا لو یہ، ان ناولوں میں تو شرابی، زانی اور مجرم ہیں سب لوگ، میری بات سن کر بابا نے ایک جملہ کہا کہ ”بیٹا خود کو زرا اس دور یعنی جب برصغیر میں تقسیم کا واقعہ نہیں ہوا تھا میں تصور کر کے سوچو، کیا اس وقت کے حساب سے یہ ناول پاک نہیں؟“ اور ہماری بالائی منزل جھٹ سے اس نتیجے پر پہنچی کہ ہاں بات تو ٹھیک ہے۔

پھر جلد ہی یہ بات بھی مجھ پر واضح ہوئی کہ ابن صفی صاحب نے شرعی لحاظ سے فحاشی اور باقی گناہوں سے بالکل پاک و صاف ناول لکھے، جن برائیوں کا میں نے اوپر؟ کر کیا جو مجھے غلط محسوس ہوئیں، دراصل ان برائیوں سے ابن صفی صاحب نے دور رکھا ہے، یعنی ان کا؟ کر اس انداز میں ہوا ہے کہ انسان ان برائیوں کو برائی سمجھ کر ان سے نفرت کرے، نہ کہ خود بھی اس میں ملوث ہو جائے، بعض جگہ نا سمجھ آدمی پہلے تو یہی سمجھتا ہے کہ ان گناہوں یا برائی ہے کی ترغیب دی گئی ہے، مگر جب غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس برائی سے تو ابن صفی صاحب نے دور رکھا ہے، مطلب برائی کا انجام بھی ناول میں بتا دیتے ہیں کہ اس کا انجام برا ہے، یا بعض جگہ ناول کے کسی نہ کسی حصے میں برائی کے برے انجام کو بھی پیش کر دیتے ہیں، فرق صرف سمجھنے کا ہے۔

ناول کے خاص مرکز کی کردار یعنی ان ناولوں کے ہمارے ہیروز تو ان برائیوں کا کبھی سوچتے بھی نہیں اور نہ کبھی اس میں ملوث ہوتے ہیں، ہمیشہ بچ کر رہتے ہیں، اور نہ صرف بچ کر رہتے ہیں بلکہ ان گناہوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے دوسروں کو بھی ان سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

دراصل ابن صفی صاحب نے تو ناولوں، کہانیوں اور افسانوں وغیرہ کے ذریعہ معاشرے سے بے حیائی و فحاشی ختم کرنے کے لیے بڑا مثبت قدم اٹھایا تھا، جو کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی، آج اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ کام فلاں مصنف نے کیا تو یہ ان کی بھول ہے۔

فحاشی اور بے حیائی کے خلاف اٹھایا گیا ان کا یہ قدم اس سیلاب کو بہت حد تک روکنے میں کامیاب رہا، ان کے

ان پاک و صاف ناولوں کی بدولت دنیا فریدی اور حمید کی دیوانی ہوئی، اور ایسی دیوانی ہوئی کہ گناہوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے جرم سے بچنے کی دلی خواہش بھی لوگوں میں پیدا ہوئی۔

عظیم فریدی و حمید کی طرح ایک اور عظیم کردار عمران کو بھی ابن صفی صاحب نے تخلیق کیا، جو انہی خوبیوں کا حامل تھا جیسا کہ فریدی، مزاح میں حمید جیسا، چالاکی میں فریدی جیسا اور حماقت اس کا اپنا خاص وصف ہے، حالانکہ فریدی و حمید کو میں نے ابھی بہت زیادہ نہیں پڑھا، مگر ان کے بارے میں جتنا پڑھا اور جتنا سنا وہ سب مشترک طور پر میں عمران میں دیکھ چکا ہوں، ان سبھی کرداروں میں ایک دوسرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، وہ سب ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔

حقائق جاننے کے بعد اور بہت ساری غلط فہمیوں کے دور ہونے کے بعد اب میں ابن صفی صاحب کا ایک مستقل قاری ہوں، تعارف بہت لمبا ہو گیا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

میں یہاں ایک بالکل نئے موضوع پر بات کرنا چاہ رہا ہوں، جی ہاں..... بالکل! میں بات کرنا چاہتا ہوں ابن صفی کے پیشرسوں پر، وہ پیشرس جنہیں پڑھ کر لگتا ہے کہ میرے محبوب مصنف مجھ سے بات کر رہے ہیں، ایسے لگتا ہے کہ پیشرس کا صفحہ صرف میرے لیے لکھا گیا ہو، وہ صرف مجھ سے ہی مخاطب ہوں، اپنی ہر بات وہ مجھے بتا رہے ہوں، ابھی وہ ہم سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ بھائی 'سفید' کاغذ 'بلیک' ہونے کی وجہ سے مہنگے ملتے ہیں، اس لیے رنگدار ہی حاضر ہیں۔

کبھی جب وہ خوشگوار موڈ میں ہوتے ہیں تو ہلکا ہلکا مزاح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ناولوں کی قیمت پیسوں میں اس لیے لکھتے ہیں تاکہ تین روپے قیمت والے ناول صفر کے اضافے کے بعد گراں قیمت نظر آئیں، ان کا فلسفہ ہی نرالا ہے، 3 روپے قیمت والے ناولوں پر جب 300 پیسے لکھ دیکھتا ہوں تو ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے، میری کتب کی قیمت صفر کے اضافے کی وجہ سے سینکڑوں میں پہنچ جاتی ہے۔

بھی وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ حمید نے دو چار پائیاں نہیں بلکہ دو چار من پائیاں کھائی تھیں، ایسا محض کتابت کی غلطی کے باعث ہوا، ابھی وہ ہمیں بتا رہے ہوتے ہیں کہ میں تین سال کا عرصہ بیمار رہا ہوں اور میری بیماری کا لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اپنے پیشرس میں ہی انہوں نے ہمیں مختلف ابن خصیوں سے ملوایا، الغرض ان کی پیشریس جب بھی پڑھیں ہمیں گمان ہوتا ہے کہ ان کے روبرو بیٹھے انکی باتیں سن رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے محبوب مصنف کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے..... آمین۔

تجہ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح

سیدہ زکیہ سناہ

چشمہ علم و ادب، گوہر نایاب، عصر گزشتہ سے عصر حاضر اور آئندہ دور تک اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے والے محترم ابن صفی کی خدمات و محاسن پر قلم اٹھانا ایسا ہی ہے جیسے سمندر کو کوڑے میں بند کرنا یا سورج کو چراغ دکھانے کی ناکام کوشش کرنا۔

ابن صفی 26 جولائی 1928 کو ہندوستان کیصوبہ اتر پردیش کے شہر لہ آباد کے قصبہ نار میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام اسرار احمد اور ان کے والد کا نام صفی اللہ اور والدہ کا نام نصیراء لہبی آئی تھا۔

شروع میں انھوں نے طفعل فرغان کے قلمی نام سے طنزیہ و مزاحیہ کہانیاں لکھیں اور اسرار احمد کے نام سے شعرو شاعری کے میدان میں معروف ہوئے، وہ ایک انشاء پرداز شاعر اور ادیب تھے، جاسوسی ادب میں انہوں نے

ابن صفی کے قلمی نام سے شہرت پائی۔

ابن صفی کا شمار ان کیاب شہرہ آفاق ناول نگاروں، ادیبوں، شاعروں اور انشاء پردازوں میں ہوتا ہے جس کی فی زمانہ مثال ملنا مشکل ہے، اردو ادب ایسی کوئی دوسری شخصیت پیدا کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔

وہ 1952ء سے اردو کے پہلے جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے، اس دوران انہوں نے کئی سو ناول لکھے فریدی حمید، پر 125 ناول جبکہ عمران سیریز پر 120 ناول۔

ان کے شہرہ آفاق کردار کرل فریدی، کیپٹن حمید اور علی عمران کے بارے میں تو تقریباً سبھی لوگ جانتے ہیں، لیکن ان کے کچھ اور بھی ایسے کردار ہیں جن کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔

شارق، بشر جیل، ایریج اور عقرب کا کردار حالانکہ بہت کم ناولوں میں آیا ہے لیکن جتنا بھی آیا ہے وہ کردار نگاری کی مثال ہے، ان کا ایک کردار کرائم رپورٹر انور بھی ہے، جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اس کردار پر بھی انھوں نے چار ناول لکھے، بالترتیب ہیرے کی کان، تجوری کا گیت، آتشی پرندہ اور خونی پتھر۔

کرائم رپورٹر انور کا کردار منفرد اور شاندار ہونے کے بعد بھی قارئین میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکا، اس لئے ابن صفی نے اس کو فریدی کے ساتھ ضم کر دیا، اس طرح انور کا کردار ان چار ناولوں کے علاوہ دوسرے مختلف ناولوں میں بھی آتا رہا، ان مختلف ناولوں میں وہ فریدی کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، انور کی پارٹیا دست راست رشیدہ بھی اس کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے، پہلی مرتبہ انور اور رشیدہ، فریدی و حمید مشترکہ طور پر ناول بھیا تک جزیرہ میں نظر آئے تھے۔

بلاشبہ ابن صفی کو جاسوسی نگاری کا امام کہا جاسکتا ہے، ان کی حیثیت گلشن میں اس گلاب کی سی ہے جس کے بغیر چمن سونا سونا لگتا ہے، ان کے ناول انفرادی اہمیت کے حامل ہیں، ہر ناول اور اس کے پلاٹ پر ان کی گرفت سجد مضبوط ہوتی ہے، آغاز سے انجام تک یہ گرفت کہیں کمزور پڑنی دکھائی نہیں دیتی۔

جیسے جیسے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے اور انجام کے قریب پہنچتی ہے اس کی خوبصورتی دو چند ہو جاتی ہے، قاری ہر لمحہ تجسس میں مبتلا رہتا ہے، ہر گزرتے صفحہ کے ساتھ اس کی پچھنی بڑھتی جاتی ہے اور جب ابن صفی غیر متوقع طور پر چونکا دینے والے انداز میں مجرم کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو قاری حیران رہ جاتا ہے، اس دوران بھی کہانی میں ربط باقی رہتا ہے، کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا۔

ابن صفی کے کرداروں کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے ان کو اپنے قلم کی طاقت سے زندہ جاوید کر دیا، ناول پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے کردار ہمارے ارد گرد مجسم صورت میں متحرک ہوں، ان کے مستقل کرداروں میں فریدی، حمید، قاسم، نلیم، انور رشیدہ، عمران، ایکسٹو، جوزف، سلیمان، جولیا، اماں بی، ثریا، روشی، صفدر، صدیقی، تنویر، سر سلطان، ڈائریکٹر جنرل رحمان، انسپکٹر آصف، انسپکٹر جگدیش، فیاض، تھریسیا، سنگ ہی، فوج، وغیرہ ہیں۔

یہ ایسے شاندار کردار ہیں جن کی شخصیت کے سحر میں کھوکھڑے والا اپنے آس پاس سے بے خبر ہو جاتا ہے، ان کے مزاجیہ جملے پڑھ کر بے ساختہ تہقق لگانے لگتا ہے، ابن صفی کے طنز و مزاح میں ایک عالمانہ شان اور شوخی ملتی ہے، فقرے زیادہ طویل نہیں ہوتے کہ آدمی بور ہو جائے اور نہ ہی اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ مافی الضمیر بھی سمجھ میں نہ آ سکے۔

وہ اپنے ناولوں میں بے جا طور پر محاوروں کا استعمال نہیں کرتے، اور نہ ہی اردو کے متروک نیز عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ کا استعمال کر کے اپنی علیت کا سکہ بٹھاتے ہیں، ان کی تحریریں اس بات کی عکاس ہیں کہ انہیں

اپنے مذہب، تمدن، ثقافت، تہذیب اور اپنی قوم سے بیحد محبت ہے، انھوں نے اپنے ناولوں سے جہاں تک ممکن ہو سکا اصلاح معاشرہ کی کوشش جاری و ساری رکھی، کبھی پیار سے، کبھی ڈرا دھمکا کر تو کبھی طنز اور مزاح کے پیرائے میں لوگوں تک اپنی بات پہنچائی۔

آئیے نظر ڈالتے ہیں ان کے ناولوں کے کچھ چندہ اقتباسات پر جو ہمارے لئے مشعل راہ ہونے کے ساتھ ہی ہمیں بہت کچھ سوچنے و سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

وہ اپنی تہذیب، تمدن اور ثقافت کی تنزلی پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں:
 "ہم اردو کے اخبار نہیں دیکھتے، دیکھا کیجئے ایمان تازہ ہوتا ہے، ایک صفحہ پر درس قرآن پڑھئے، اور دوسرے صفحہ پر تنگی چھپکوں کی تصویریں بھی دیکھ لیجئے۔"

[ناول: بالکوں کی انجمن]

اسی قسم کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں:

ماہنامہ "نمر چکدار" جس کی دھوم سارے ملک میں تھی، وہ ادب و ثقافت کا علمبردار تھا، ادب کا علمبردار یوں تھا کہ اس میں فلم ایڈیٹریسوں کی کنزوریاں اچھالی جاتی تھیں اور ثقافت کا علمبردار اس لئے کہا جاسکتا تھا کہ سرورق پر کسی لنگوئی بند اسکرین چھپکی کی تصویر ہوتی تھی۔

[ناول: لڑکیوں کا جزیرہ]

اردو ادب میں دوسری زبانوں سے پلاٹ چوری کرنا اور پورے پورے ناول کرداروں کے نام بدل کر چھاپ لینا عام بات ہے، پبلشر اور مترجم حضرات اکثر ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، اس حوالہ سے ابن صفی کا ایک دلچسپ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"یہاں آکر بچھرتا رہا ہوں، ہالی ووڈ میں بہت اچھا تھا۔" حمید نے کہا۔

"وہاں کیا کرتے تھے؟"

"اردو کے سری ادب سے آئیڈیاز پار کر کے وہاں کے فلم سازوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتا تھا۔"

"تو کیا یہ کوئی اچھی بات تھی؟" نہانے کسی قدر ناگواری سے سوال کیا۔

"ہیلینس برابر کیا کرتا تھا اس طرح..... آخر اردو والے بھی تو انگریزی ادب پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں،

اب ان بے چاروں کو اردو تو آتی نہیں کہ خود ہی انتقام لے سکیں۔"

[ناول: سانپوں کے میسا]

ابن صفی پر جاسوسی ناول لکھنے کے شروعاتی دور سے ہی تنقید کی جاتی رہی ہے، بڑے بڑے چوٹی کے ادیب ان کی جاسوسی ناول نگاری سے نالاں تھے، وہ خود کو ادیب جبکہ ابن صفی کو "ادیف" کہتے آئے ہیں، حالانکہ وہ خود کسی قابل نہیں، خود کو اردو ادب کا ٹھیکیدار سمجھنے والے ایسے ہی خود ساختہ "ادیفوں" کا حال بذبان ابن صفی سینے:

"بھوک مجھے لنگھاتا دیتی ہے۔"

"ادیفوں کی سی باتیں کرنے لگے۔" فریدی مسکرایا۔

"خوب یاد دلایا، سنا ہے ادب میں جمود ہو گیا ہے؟"

فریدی کچھ نہ بولا، حمید بکٹا رہا، "میرا مقدر ہی خراب ہے، ابھی حال ہی میں افسانہ نگاری شروع کی تھی کہ یہ بری اطلاع ملی، کل شام ریڈیو پر چند جغادری قسم کے ادیب مع ایک محترمہ اردو افسانہ کے انحطاط کے اسباب تلاش کر رہے تھے، ایک بزرگوار بولے جاسوسی ناولوں کی وجہ سے لوگ مختصر افسانے سے بے توجہی برت رہے ہیں،

محترمہ حقارت سے ہنس کر بولیں اور یہ ناول بھی انگریزی کا چرہ ہوتے ہیں، میں نے دل میں کہا کہ محترمہ ہمارا مشاہدہ ہی جب انگریزی کا چرہ بنتا جا رہا ہے تو یہ ناول کیوں نہ ہوں، ویسے ان جغادری ادیبوں میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جو واشنگٹن، ارونگ کے انداز بیان اور جان رسکن کے طرز انتقاد کی نقالی کر کے جغادری ادیب بنے ہیں، بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ اگر وہ خدا کے وجود کے قائل ہوں تو خدا ان کی مغفرت فرمائے۔"

[ناول: اشاروں کے شکار]

ایسے بے مایہ اور کم ظرف ادیبوں پر طنز کرتے ہوئے ابن صفی ایک اور ناول میں کہتے ہیں:

"اردو کے جدید ترین ادیبوں میں سب سے ممتاز کون ہے؟"

"وہی جو سال بھر میں ساڑھے تین افسانے لکھ لیتا ہے، ڈیڑھ عدد غزلیں کہہ لیتا ہو اور ایک آدھ تنقیدی مضمون بھی لکھنے کی کوشش تو کرے لیکن زندگی بھر کامیاب نہ ہو سکے۔"

[ناول: الٹی تصویر]

جنسیت زدہ طوفانی عشق اور گھٹیا قسم کی محبت میں مبتلاء حضرات کے بارے میں ابن صفی کا یہ زبردست اقتباس پیش نہ کرنا زیادتی ہوگی:

"تمہارے شوق انتہائی عجیب و غریب ہیں، لیکن خطرناک بھی ہیں، تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

"ابھی دل نہیں چاہتا۔" فریدی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"کوئی ٹریجڈی۔" ڈی آئی جی مسکرایا۔

"نہیں صاحب..... مجھے کبھی ادنیٰ قسم کا جانور بننے سے دلچسپی نہیں رہی..... میں جنسیت کو سیدھا سادا مسئلہ سمجھتا ہوں جسے انسان جیسے سمجھدار جانور کے لئے اتنا پیچیدہ نہ ہونا چاہئے کہ وہ شاعری کرنے لگے۔"

[ناول: جنگل کی آگ]

بڑی حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم جن کو حکومتی پالیسی کا نام دیا جاتا ہے اور اس کی آڑ میں بڑی بڑی جنگیں برپا کر کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بہایا جاتا ہے انتہائی شرمناک اور گھناؤنا عمل ہے، حکومتوں کی ایسی جنگی پالیسیوں پر ابن صفی نے کچھ اس انداز میں چوٹ کی ہے:

"جب آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں اور جب کوئی قوم پاگل ہو جاتی ہے تو طاقت ور کیوں کہلانے لگتی ہے؟"

[ناول: انوکھے رقص]

خواتین کے معاملہ میں ابن صفی بڑا احساس دل رکھتے تھے، ان کے ساتھ کئے جانے والے معاشرہ کے برے سلوک پر ان کا دل کڑھتا تھا، وہ چاہتے تھے کہ خواتین بھی لکھ پڑھ کر آگے بڑھیں، مردوں سے ان کی صحیحیت کم درجہ کی ناہو، اور یہ سب اسلام کے بتائے ہوئے حدود کے اندر ہو، اسی ضمن میں انھوں نے اپنے ایک ناول میں کہا تھا:

"تمہاری اسلامی حکومت عورتوں کے لئے کوئی الگ انتظام کیوں نہیں کرتی، تمہیں مردوں کے دوش بدوش لانے کی کیا ضرورت ہے، ہم لوگ تو تنگ آ گئے ہیں اس زندگی سے، ہماری عورتیں اب صرف گھروں کی ذمہ داریاں سمجھانا چاہتی ہیں اور گھروں تک محدود رہنا چاہتی ہیں۔"

[ناول: لاش گاتی رہی]

حکومتی نظام کی نااہلی اور اس کی معاشرہ سے متعلق ذمہ داری میں بے اعتدالیوں اور خامیوں کی طرف توجہ دلا کر

اس سے ہونے والی عوام کو تکلیفات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"کرنل صاحب، آخر یہ جرائم اتنے کیوں بڑھ گئے ہیں؟"

"جھلاہٹ کی بنا پر۔" فریدی بولا۔

"میں نہیں سمجھا؟"

"آبادی بڑھ گئی ہے، وسائل بھی محدود ہیں اور چند ہاتھوں کا ان پر قبضہ ہے۔"

"جھلاہٹ والی بات تو رہی گئی۔"

"اسی طرف آرہا ہوں..... دولت مندوں کو مزید دولت مند بننے کی آزادی ہے اور عوام کو قناعت کا سبق پڑھایا

جا رہا ہے۔"

"ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے؟"

"چارہ ہی چارہ ہے، اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منھ موڑ لیا جائے، ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد

ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہو جائے گی، ضرورت ہے

کہ انھیں قناعت کا سبق پڑھانے کے بجائے ان کی 'خودی' کو ابھارا جائے جیسے بعض دوسرے ممالک میں ہوا۔"

"نہیں صاحب، خودی کو تو والوں ہی کی تحویل میں رہنے دیجئے۔" مینیجر ہنس کر بولا۔

فریدی بھی مسکرایا، چند لمحے خاموش رہ کر مینیجر نے کہا۔

"آپ تو انقلابی معلوم ہوتے ہیں کرنل صاحب؟"

"حدود اللہ میں رہ کر یقیناً انقلابی ہوں، اللہ کبھی اس پر برہم نہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مد نظر رکھ کر

اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کرے۔"

"بات تو سچی ہے جناب، ہماری تاریخ میں ایسے سربراہان مملکت بھی گزرے ہیں جو سر کے نیچے اینٹ رکھ کر

کھر دے فرش پر سویا کرتے تھے اور اپنے لئے کچل نہیں بناتے تھے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے ایک بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہیں کہ ابن صفی معاشرے کا درد رکھنے والے انسان

تھے، اس کے علاوہ وہ صلح پسند، ہمدرد، بااخلاق، اور متکسر المزاج بھی تھے، ان کی سادگی، صداقت اور شرافت مثالی

تھی، اردو ادب آج تک ان کے جیسا کوئی قلم کار پیدا نہ کر سکا۔

جب تک دنیا میں اردو اور اس سے متعلق لوگ موجود ہیں گے ابن صفی کا نام لیا جاتا رہے گا، اردو ادب کے

میدان کا یہ لکھاری 26 جولائی 1980 کو اپنے چاہنے والوں کو تنہا اور اکیلا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا، ایک

باب ختم ہو گیا ایک عہد تمام ہو گیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اللہ تعالیٰ ابن صفی کو رحمت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے..... آمین فتح آمین۔

ان کی رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان کی تحریریں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی گفتگو اور اپنی خوشبو سے اردو دنیا

کو معطر کر رہی ہیں اور ہمیشہ کرتی رہیں گی..... إِنْ شَاءَ اللّٰہ، ابن صفی کے یہ شگفتہ اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا

ہے جیسے وہ ہم سے ہمکلام ہوں۔

"مدقون ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح

کجکھو یا داؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
 ڈوب جائے گا کسی روز جو خورشید انا
 مجھ کو دوہراؤ گے محفل میں مثالوں طرح"

ابن صفی کے ناولوں کا جنون ثناء اللہ خان احسن

میں نے ابن صفی کو اس وقت پڑھا جب وہ اس دنیا میں موجود نہیں تھے، یہ ناول ہمارے گھر میں نہ جانے کب سے رکھے تھے، ہماری والدہ صاحبہ بتاتی تھیں کہ سن 1964-65 کے زمانے میں گھر میں یہ معمول تھا کہ رات کے کھانے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر وہ، ہمارے والد، ہماری خالہ اور خالو ابن صفی کا تازہ ناول لے کر بیٹھ جاتے۔

ان میں سے کوئی ایک فرد ناول بلند آواز سے پڑھتا جاتا اور باقی سامعین بن جاتے، ہر آدمی ہونے گھٹنے بعد چائے کا وقفہ لیا جاتا، اگر قاری پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ سنبھال لیتا، عمران، ایکسٹو، حمید، فریدی، قاسم کا منفرد اور دلچسپ انداز گفتگو اور اس کی بیوی کی نوک جھونک۔

سرسلطان، جولیا، کیپٹن فیاض، اور دیگر کرداروں کے بارے میں ہماری والدہ ہم کو اکثر بتایا کرتی تھیں، جن کو سن کر ہمیں بھی شوق ہوا یہ سب پڑھنے کا۔

ابن صفی صاحب عمران سیریز میں تلے ہوئے جھینگے بمعہ کافی اور ساڑ ڈینا فاش کا بہت ذکر کرتے تھے کہ یہ علی عمران کی مرغوب ڈش تھی، بعد میں ایک جگہ احمد صفی صاحب کے انٹرویو سے تصدیق ہوئی کہ واقعی یہ خود بھی ابن صفی صاحب کو پسند تھیں۔

اسی طرح ابن صفی صاحب نے عمران کو چیونگ گم کا عادی کردار بنایا تھا، جو ہر ذرا سی دیر بعد چیونگ گم کے پیکٹ سے چیونگ گم نکال کر چباتا تھا، بلکہ دوسروں کو بھی پیش کرتا تھا بطور خاص جولیا کو۔

فریدی کا سگار اور حمید کی فلرٹ بازیاں، اپنے قارئین کی اکثریت کو ابن صفی صاحب نے کریم کافی سے بھی روشناس کروایا۔

والدہ صاحبہ بتاتی ہیں کہ اس زمانے میں باقاعدہ بڑی بے چینی اور اشتیاق سے ان کے ناولوں کی آمد کا انتظار کیا جاتا تھا، اس زمانے میں تفریح کا ذریعہ یا تو فلم تھی یا ریڈیو، دن بھر گھروں میں ریڈیو بجاتا تھا، جس پر زیادہ تر اس زمانے کی مقبول فلموں کے گیت چلتے تھے، یا پھر لوگ ناول پڑھتے تھے کہ اس زمانے میں ڈائجسٹوں کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔

میں نے جب اپنے گھر میں رکھے اس زمانے کے ابن صفی کے ناولز کو پڑھنا شروع کیا تو ان کی قیمت ڈیڑھ روپیہ یا سو روپیہ لکھی ہوئی تھی۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس زمانے میں نہ ٹی وی تھا نہ انگریزی فلموں کی بہتات، نہ انٹرنیٹ لیکن پھر بھی ابن صفی نے جس طرح کا ماحول، منظر نگاری، سائنسی ایجادات، اور ایلیمینٹز وغیرہ کا بیان دیا ہے وہ آج کے جدید سائنس فکشنز اور فلموں کی فکر کا ہے، یہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔

ابن صفی کے ناول اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہیں کہ جس نے یہ نہ پڑھے وہ اردو ادب سے مکمل واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اگر آج کی نوجوان نسل ان ناولوں کو ماضی کی دقیا نوی سوچ کا حامل سمجھتی ہے تو یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

یقین کیجئے کہ ان ناولز میں آپ کو آج کی ہالی ووڈ فلمز کا قہرل، انتہا درجے کا سسپنس، ایکشن، کامیڈی، سائنس فکشن اور سنسنی ملے گی۔

یقیناً ابن صفی صاحب کی سوچ کو اللہ نے بہت ہی خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا، ورنہ ایسی سوچ اور تخلیق کی کم از کم میں نے کوئی مثال نہیں دیکھی۔

سرگزشت میں علی سفیان آفاقی کے مستقل سلسلے میں بھی ابن صفی صاحب کا اکثر ذکر ہوتا تھا، ایک واقعہ جو آفاقی صاحب نے تحریر کیا وہ شاید اداکار محمد علی کی زیبا سے شادی کا ہے جو خفیہ طور پر کراچی میں ابن صفی صاحب کے گھر انجام پائی تھی۔ واللہ اعلم۔

اللہ پاک ابن صفی صاحب کو غریقِ رحمت کرے..... آمین۔

ابن صفی اور ان کے ہم عصر ادیب سیف خان

اردو ادب شروع سے طبقاتی تقسیم کا شکار رہا ہے، یہاں ادیب ایک دوسرے کے "لکھے" کو ادا، دوم اور سوم درجے میں رکھتے ہیں..... ایسا سلوک دروہہ شاید ہی دنیا کے کسی اور ادبی طبقے میں پایا جاتا ہو، یہاں کچھ ادبی ٹھیکیدار نقد کی مخصوص عینک چڑھائے مخصوص تحریروں کو ہی ادب گردانتے ہیں۔

محترم انتظار حسین صاحب ایک مرتبہ بتانے لگے کہ ہندوستان کے شہر بھوپال کی ایک یونیورسٹی میں ایک ادبی تقریب کے دوران جب وہاں ایک پروفیسر نے مجھ سے ابن صفی کی بابت پوچھا تو میرے انکار کرنے پر وہ کافی حیرت زدہ ہو کر کہنے لگے کہ آپ نے اب تک کیونکر ابن صفی صاحب کو نہیں پڑھا؟

انتظار صاحب نے مزید اس پہ یوں روشنی ڈالی کہ ہمارے ہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ زیادہ چھپنے والے بیسٹ سیکر مصنفین شاید ادبی معیار پہ پورے نہ اترتے ہوں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسی سوچ مستقل بنیادوں پہ اور ہمیشہ رہے، ایک عرصہ گزرنے کے بعد نقادوں نے ابن صفی صاحب کے ناولز، ان کا اسلوب، بیانیہ اور کردار پر لحاظ سے ادبی معیار کا گردانا، اور اب یہ بلاتامل تسلیم کیا جاتا ہے کہ ابن صفی کی خدمات کا اعتراف اس طرح سے نہیں ہو سکا جس کے وہ حقدار ہیں۔

تھکیل عادل زادہ صاحب سب رنگ جیسے سدا بہار شمارے کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، انہوں نے برصغیر میں ڈائجسٹ انڈسٹری کو بلاشبہ ایک نئی جہت دی، ابن صفی صاحب کے فکر و فن کے وہ بہت دلدادہ ہیں، ایک نشست میں انہوں نے ابن صفی صاحب کی شخصیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ میرے اور جون ایلیا صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ ابن صفی ہمارے شمارے عالمی ڈائجسٹ میں لکھیں، کئی بار ہم نے اس بابت ان سے رابطہ کیا لیکن وہ ٹال دیتے، پھر ایک دن ابراہیم رضوی صاحب کے توسط سے میں اور جون صاحب ان سے ملنے فردوس کالونی گئے، ابن صفی صاحب البتہ رضوی صاحب کی وجہ سے مان گئے اور انہوں نے عالمی ڈائجسٹ کے لیے قسط وار کہانی

"اب تک بھی کہاں" لکھنی شروع کر دی۔

ابن صفی اور ان کی کہانی کے حوالے سے ہم نے کافی اشتہار لگائے تھے اور اس کہانی کی وجہ سے پرچے کی سرکولیشن بھی بڑھنے لگی، لیکن صفی صاحب نے دوسری قسط پہ ہی اچانک لکھنے سے انکار کر دیا، ان کی کافی منت سماجت کی لیکن وہ یہی کہہ کر انکار کرتے رہے کہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا، ہمیں وہ سلسلہ مجبوراً بند کرنا پڑا، اس کے بعد ظاہر ہے، ہمیں ابن صفی پر غصہ تھا، ہم جہاں بھی جاتے ان کی برائیاں کرتے۔

اور جب ایچ اقبال صاحب نے اپنے شمارے الف لیلی ڈائجسٹ کے "ابن صفی نمبر" کے لیے مجھ سے مضمون مانگا تو میں نے دل کھول کر ان کے خلاف باتیں لکھ دیں، وہ مضمون البتہ جب ایچ اقبال صاحب نے پڑھا تو شائع نہ کر سکے۔

ایک دن جب میں گھر پہ تھا تو اطلاع آئی کہ ابن صفی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، مجھے بڑی حیرت ہوئی اور بھاگ بھاگ دروازے تک پہنچا تو دیکھا وہ ڈھیر سارے کارڈز ہاتھ میں لیے کھڑے تھے، مجھے ایک کارڈ تھا کہ کہنے لگے..."دیکھو بھئی میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن کل میری بیٹی کی شادی ہے اور تمہیں ضرور آنا ہے، تم کو زیادہ تکلیف نہیں کرنی پڑے گی، بس یہ سڑک پار دوسری طرف سنگم شادی ہال تک آنا ہوگا۔"

فکلیل عادل زادہ صاحب کے بقول اس دن مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، ابن صفی صاحب نے اتنے خلوص سے وہ ٹکدر دور کیا کہ ایک عرصے تک شرمساری محسوس ہوتی رہی، اس ایک واقعے سے ابن صفی صاحب کی شخصیت، ان کے طور و اطوار اور دوسروں کے ساتھ تعلق و رابطوں کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

ایچ اقبال صاحب ایک عرصے تک الف لیلی ڈائجسٹ نکالتے رہے، انہوں نے چھلاوہ جیسا شہرہ آفاق ناول لکھا، بعد میں وہ جاسوسی ڈائجسٹ سے منسلک ہو گئے، اب تک وہ ہیں جڑے بیٹھے ہیں، ابن صفی صاحب کے بارے میں وہ کیا خوب کہتے ہیں کہ:

"اردو ادب کی تاریخ میں ابن صفی کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا، جبکہ ان لوگوں کے نام نہیں دکھائی دیں گے جنہوں نے ابن صفی کو تسلیم نہیں کیا۔"

ایک اور جگہ ایچ اقبال صاحب کہتے ہیں کہ:

"ابن صفی نے لوگوں کو اردو پڑھنے پہ مجبور کر دیا، ان کا اردو ادب پہ یہ بہت بڑا احسان قرار دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ناول کے ذریعہ لوگوں کو اردو کی طرف راغب کرتے رہے۔"

کمال احمد رضوی صاحب بھی سمجھتے ہیں کہ اردو ادب میں ابن صفی صاحب کو وہ مقام و پزیرائی نہیں ملی جتنی ملنی چاہیے تھی، ان کے بقول:

"جاسوسی و مسٹری رائٹنگ میں ان کے جوڈ کا مصنف نہ ان سے پہلے تھا نہ ان کے بعد کبھی آسکے گا۔"

خالد جاوید صاحب ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، افسانہ نگار ہیں ان کا شمار بھی ابن صفی صاحب کے چاہنے والوں میں ہوتا ہے، ایک تقریب میں ان کا کہنا تھا کہ "اردو ادب میں ابن صفی جیسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔"

ڈاکٹر شیر شاہ سید، معروف ادیب اور سرجن ہیں، سائنس ڈائجسٹ کے قارئین ان کے نام سے خوب واقف ہوں گے، وہ ہمیشہ اپنی پروفیشنل لائف کی لمبی ٹریس پر اپنے ساتھ ابن صفی کے ناول لے جاتے ہیں اور کئی بار پڑھنے کے باوجود مسلسل انہیں پڑھتے رہتے ہیں۔

ابن صفی صاحب کی مقبولیت کے حوالے سے ایک مرتبہ وہ بتانے لگے کہ آزاد کشمیر اور پشتونخوا میں آئے ہولناک زلزلے کے سلسلے میں ایک مرتبہ ہمیں مانسمہ اور پھر وہاں سے ایک دور دراز کے علاقے "بھفہ" جانے کا اتفاق ہوا، وہاں میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اتنے دور دراز علاقے کی لائبریری میں بھی ابن صفی صاحب کے تمام ناول موجود تھے اور لوگ انہیں پورے ذوق و شوق سے پڑھ رہے تھے۔

امجد اسلام امجد صاحب برملا کہتے ہیں کہ اردو ادب میں کوئی دوسرا ابن صفی پیدا نہیں ہوگا، انہوں نے اس دور میں مقبول عام جاسوسی ناول لکھے جن دنوں انڈیا پاک میں ایجنٹس اور پرائیوٹ ڈی ٹیکٹو کا تصور ہی نہیں تھا۔ ابن صفی صاحب کو اپنی مقبولیت کا بخوبی اندازہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ درویشانہ مزاج کے مالک تھے، انہیں پیسے کی پروا تھی نہ اپنی ذات پہ کوئی غرور، مشتاق احمد قریشی صاحب ان کے ساتھ کافی زیادہ وقت گزار چکے ہیں، ابن صفی صاحب کے اسی وصف کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے کبھی بھی پیسوں کے لیے نہیں لکھا، پیسے مل گئے تو ٹھیک، ورنہ کبھی پیسوں کا تقاضا کیا نہ کسی سے کبھی اس معاملے پہ ان کی تلخ کلامی ہوئی، درویش صفت آدمی تھے اس معاملے میں۔

تو ایسی شخصیت کے مالک تھے ہمارے ابن صفی صاحب، جن کے ہم عصر نثر سے کہتے ہیں کہ ہم ابن صفی کے دور میں رہ رہے تھے، آج اگر اردو ادب میں ابن صفی صاحب کے ادبی مقام کا تعین ہونے جا رہا ہے اور مختلف ادیب ان کی خدمات کا اعتراف کر رہے ہیں اور نئی نسل کو ابن صفی صاحب کی سدا بہار تحریروں سے روشناس کرا رہے ہیں، تو اس میں بہت بڑا حصہ ان کے صاحبزادے احمد صفی صاحب کا ہے، جو ہر فورم پہ ان کے لیے آواز اٹھاتے رہے ہیں، ابن صفی صاحب کے فنز کو البتہ اس کا کریڈٹ مزید جاتا ہے جو عمران سیریز پہ لکھنے والے دیگر رائٹرز کے مقابل سوشل میڈیا کے ہر فورم پہ ابن صفی کی شناخت اور پہچان سے لوگوں کو روشناس کراتے رہے ہیں۔

پرواز بلند ہے جس کے تخیل کی

سیدہ عطیہ حنا

کوئی بھی انسان پیدائشی فنکار یا تخلیق کار نہیں ہوتا، اس کے گھر اور آس پاس کا ماحول اس کی صلاحیتوں کو میسر کرتا ہے اور اس کے لئے راستہ بناتا ہے، علمی مجلسیں اور زندہ دل صحبتیں اس کے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں، اسے احساس دلاتی ہیں کہ وہ کبھی کچھ کر سکتا ہے کچھ بن سکتا ہے۔

ابن صفی کوئی گمنام شخصیت نہیں، ہر اردو پڑھنے والا ان کے نام سے ضرور واقف ہوگا، اور خاص طور سے وہ لوگ جن کو اردو ادب کے کرائم فکشن، سائنس فکشن، جاسوسی، طنز، مزاح، تجر، تجسس، پراسراریت و مہم جو یا نہ حالات و واقعات سے بھرپور لٹریچر پسند ہے۔

ابن صفی ایک بہترین شاعر، عمدہ طنز نگار اور باکمال ناول نگار تھے، ان کی شخصیت گویا ہمہ جہت تھی، وہ ہر میدان کے اچھے شہسوار تھے، ہر جگہ انھوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا، اور جیسی شہرت انہیں نصیب ہوئی ویسی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔

انھوں نے ایسے ایسے کردار تخلیق کئے جو لازوال و لاغانی ہیں، فریدی، حمید، قاسم، عمران، انور، رشیدہ، صفدر، جولیان، صدیقی، تنویر، خاور، جوزف، چوہان، ظفر الملک، جمسن، سلیمان، شارق، ایرج و عترب ان کے کچھ ایسے

ماہہ ناز کردار ہیں جو آج بھی اپنی تخلیق کے پہلے دن کی طرح جوان، زندہ دل، پر مزاح اور زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں..... اور اپنے ہر قاری کے ادبی ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔

ان کا ہر کردار ایک الگ رنگ میں نظر آتا ہے جو دوسرے کرداروں سے جدا ہوتا ہے اور یہی رنگارنگی ان کے ہر ناول کے لطف کو دو بالا کرتی ہے۔

ابن صفی کے ناول بچوں و جوانوں اور بڑھوں میں یکساں طور پر مقبول تھے اور آج بھی ہیں، لوگ ان کے ناولوں کا انتہائی بے مبری سے انتظار کیا کرتے تھے، آج ان کی وفات کے 37 برسوں کے بعد بھی یہ سب ناول نہایت ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں، قاری ایک بار جو ناول اٹھا لیتا ہے اسے ادھورا چھوڑے بغیر نہیں رکھتا، یہ ناول عجب سی مقناطیسی کشش کے حامل ہوتے ہیں۔

ابن صفی بنیادی طور پر ایک اچھے اور سخن ور شاعر بھی تھے، بقول استاد ابن صفی، صدر شعبہ اردو پروفیسر انوار الحق نے زمانہ طالب علمی میں ابن صفی کی شعر و شاعری سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ایک دن ان کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوگا، ان کے استاد کا کہا ہوا پورا ہوا مگر دوسرے انداز میں، ان کی شاعری مقبول تو ہوئی مگر محدود پیمانے پر، یعنی اپنے دوستوں کے ڈرائیونگ رومز تک، اور اب ان کے بے شمار چاہنے والوں کی زبان میں، نوٹ بکس اور ڈائریز میں۔

ابن صفی نے کبھی اپنے اشعار پر کسی سے اصلاح نہ لی اور نہ ان کا کوئی استاد تھا، پھر بھی آپ کی شاعری کے مضامین ایک کہنہ مشق شاعری کی طرح ہیں، ان کی نظموں اور غزلوں کی فرحت و تازگی الفاظ و معانی کی ہم آہنگی، اظہار و بیان کی رنگارنگی قاری کے دل میں لطیف و نازک احساسات پیدا کرتی ہے۔

ان کی غزلوں میں اتنی خوبصورتی اور جادو ہے کہ بے اختیار داد دینے بغیر نہیں رہا جاسکتا، ان کی غزلوں میں ایک بھی شعر آپ کو بھرتی کا نہیں ملے گا، ان کے کچھ اشعار تو گویا ان کی اپنی زندگی کے ترجمان ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

"میرے لبوں پہ یہ مسکراہٹ

مگر جو سینے میں درد سا ہے

اسی جگہ کیوں بھٹک رہا ہوں

اگر یہی گھر کا راستہ ہے

ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے

ابھی تو صبح کا حوصلہ ہے"

"بالآخر تھک ہار کے یاروں ہم نے بھی تسلیم کیا

اپنی ذات سے عشق ہے سچا، بانی سب انسا نے ہیں

تہائی سی تہائی ہے، کیسے کہیں کیسے سمجھائیں

چشم و لب و رخسار کی تہ میں ردحوں کے دیرانے ہیں"

میں نے ابن صفی کو اس وقت سے پڑھنا شروع کیا جب میرا شعور ابھی ناپختہ تھا، ان کے ناول کلی طور پر سمجھ میں نہ آتے تھے، مگر ان کے کردار عمران و سلیمان کی پر مزاح گفتگو، حمید و قاسم کی پر لطف باتیں اور شوخ و چنچل مکالمے بہت پسند آتے تھے، قاسم کا حمید کو غمید بھائی کہنا، اپنی بیوی کو چپائی پیغم و گلہری خانم کہنا بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتا

تھا۔

مجھے وہ وقت آج بھی یاد ہے جب میں نے ابن صفی کا پہلا ناول پڑھا تھا، گھر میں مختلف ناولوں اور کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر موجود تھے، پڑھنے پڑھانے پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی، لیکن کورس ورک کی وجہ سے عارضی پابندیاں ضرور عائد کی جاتی تھیں، ورنہ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف مطالعہ میں ہی مصروف رہتے۔

جی ہاں تو ہم نے ابن صفی کا جو سب سے پہلا ناول پڑھا وہ تھا گیارہواں زینہ، جو ہم نے اپنے بڑے بھائی اسد عادل سے بڑی منت سماجت کے بعد حاصل کیا، منت سماجت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کیونکہ اس وقت ہمارے امتحان چل رہے تھے اور ایسے مواقع پر کورس کے علاوہ ہر قسم کے مطالعہ پر سخت قسم کی پابندی عائد تھی۔

ناول کا نام بھلے ہی گیارہواں زینہ رہا ہو، لیکن وہ ہمارے لئے نئی دنیا میں قدم رکھنے کا پہلا زینہ ثابت ہوا، ایسی دنیا جس میں حمید کی شوخی و شرارت تھی، فریدی کا رعب و سنجیدگی تھی، خوف تھا، تجسس تھا، بلکہ ہر وہ چیز تھی جس کا ایک قاری متنی و متلاشی ہوتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کی جو خاص بات ہم نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ ناول دوبارہ، سہ بارہ پڑھنے پر بھی پہلی بار جیسا ہی لطف دیتے ہیں، ہم نے بار بار یہ بات محسوس کی ہے، اور سب سے خاص بات تو یہ ہے کہ عام ناولوں کی طرح یہ عربیانی اور فحاشی سے پاک ہوتے ہیں، ان کے کردار عورتوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرتے نظر نہیں آتے، مرکزی کردار فریدی اور عمران تو عورتوں سے کوسوں دور بھاگتے۔

ابن صفی اپنے کرداروں کی زبان سے ایسی باتیں کہلواتے دیتے ہیں جو قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں، ان کی تحریریں اس بات کی عکاس ہیں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن، مذہب اور وطن سے بہت محبت کرتے تھے، ان کے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے یہ چند جملے میری اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

"شراب آتم انہما اسی لئے کہلاتی ہو، یہ کہ اس کے استعمال کرنے والے ہر قسم کی خباثت اختیار کر سکتے ہیں"

[ستاروں کی موت]

"تمہارے ذہن میں قناعت کا تصور بہت ہی گھٹیا معلوم ہوتا ہے، قناعت سے شاید تم یہ مراد لیتے ہو کہ آدمی تارک الدنیا ہو جائے، ملے تو کھائے ورنہ فاقے کرے، حالانکہ قناعت کا مطلب یہ نہیں ہے، قناعت کا مطلب ہوس سے دامن بچانا ہے"

[ہولناک دیرانے]

"کیوں نہیں پیتے۔"

"اس لیے کہ مسلمان ہوں۔"

"تو مذہبی آدمی ہو۔"

"یہنا۔"

"کتنی بیویاں ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔"

[رلائے والی]

"کیا تمہارے پیغمبر کا پیام یہاں تک نہیں پہنچا؟"

"پیام پہنچانے والوں کو زیادہ تر اپنی پوجا کرانے کی فکر رہتی ہے، اس لیے وہ صرف اختلافی مسائل پر ایک دوسرے کو لکارتے رہتے ہیں۔"

[کالی کھکشاں]

ان کے ناول پڑھ کر شاید ہی کوئی نوجوان ایسا ہوگا جو فریدی اور عمران کی طرح نہ بننا چاہے گا، ان دونوں ہی کرداروں کے کارنامے اتنے زبردست ہیں کہ بے اختیار دل سے داؤ نکلتی ہے، ناول پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اپنے ان پسندیدہ کرداروں کے ساتھ مٹھشتی کر رہے ہوں، کبھی فریدی کبھی عمران کے ناول پڑھ کر عجیب سا لطف محسوس ہوتا ہے، واقعی ابن صفی جادوگر تھے جنہوں نے اپنی نوک قلم سے ایسے ایسے پتے تراش دیئے جو آج سب کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔

فریدی کا کردار بے حد مضبوط، مستحکم، رعب دار، سنجیدہ اور نرم مزاج ہے، مگر مجرموں غداروں اور وطن فروشوں کے لے بہت سخت مزاج ہے، انھیں سب خصوصیات کی بنا پر کیپٹن حمید اسے کرنل ہارڈ اسٹون کہتا ہے، ایسے نمائندہ کردار اب معاشرے میں ناپید ہیں۔

بنیادی طور پر فریدی محکمہ سراغ رسانی کا ایک انسپکٹر ہے، جس نے کئی ان سلجھے کیسوں کو سلجھایا اور کئی بین الاقوامی سازشوں کا پردہ فاش کیا، جس کی بنا پر اس کو اعزازی طور پر کرنل کا خطاب عطا کیا گیا، اس کے دست راست سارجنٹ حمید کو اس کا ساتھ دینے اور اپنی جان کی بازی لگا کر مجرموں کو گرفتار کرانے کے عوض کیپٹن کے اعزازی خطاب سے نوازا گیا۔

کیپٹن حمید اور فریدی سب سے پہلے ناول دلیر مجرم میں نظر آئے تھے، اس وقت دونوں کو ایک ساتھ کام کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا، اپنے ایک ناول ٹھنڈی آگ میں ابن صفی نے حمید کی زبانی یہ راز کھولا ہے کہ وہ پہلی بار کب اور کیسے فریدی سے ملا۔

کرنل فریدی کی اپنی ایک ذاتی فورس بھی ہے، جسے وہ بین الاقوامی معاملات میں استعمال کرتا ہے، اس کی یہ فورس بلیک فورس کے نام سے جانی جاتی ہے، اس فورس کی حقیقت کا علم کیپٹن حمید کو بھی نہیں ہے، ضرورت کے وقت اس فورس کے سمجھ کہیں نہ کہیں مل کر اس کی مدد کر دیتے ہیں، حمید کے کئی بار استفسار پر بھی فریدی نے اسے بلیک فورس کے متعلق کچھ نہیں بتایا، حمید صرف اتنا جانتا ہے کہ بلیک فورس فریدی اور صدر المملکت کے درمیان کا ایک راز ہے۔

فریدی ہی کی طرح عمران کا کردار بھی بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے، وہ دوہری شخصیت کا مالک ہے، بلکہ ایک نفسیاتی کیس ہے، جو خود کیس حل کرتا ہے، بقول ابن صفی اس کو نفسیاتی طور پر دوہری شخصیت کا شکار بنانے میں اس کے گھر اور مشن اسکول کی دوہری تربیت ہے، اسے گھر میں بتایا جاتا کہ خدا ایک ہے، جبکہ اسکول میں بتایا جاتا کہ خدا تین میں کا ایک ہے، اس طرح گھر اور اسکول کی تعلیم الگ الگ ہونے کی وجہ سے وہ دوہری زندگی گزارنے کا عادی ہوتا چلا گیا، ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کی عادت پڑ گئی، اسی لئے وہ عموماً سنجیدہ معاملات میں بھی سنجیدہ نہیں ہوتا۔

اس کی دوہری شخصیت اس کی عملی زندگی کے کارناموں پر بھی حاوی ہے، بظاہر وہ معصوم اور احمق سا نظر آنے والے بے ضرر سا انسان ہے، لیکن جب لوگ اس کا دوسرا روپ دیکھتے ہیں تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ وہی کھلنڈ راز

اور شرارتی عمران ہے جسے وہ بے وقوف بناتے اور مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

اس کا دوسرا روپ سنجیدہ اور سخت مزاج ایکسٹلو کا ہے، جس کی صرف آوازن کر اس کے ماتحتوں کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، جب وہ اپنے ماتحتوں سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ بات کرنے میں ہکٹانے لگتے ہیں، اس کے ہر حکم پر بلاچوں چراگے مکمل کرتے ہیں۔

شاید اسی لئے ابن صفی عمران کو اپنے ہر ناول میں ایک الگ ہی انداز میں پیش کرتے ہیں، کبھی کسی ناول میں وہ فقیر بن کر سر رکوں پر صدائیں لگاتا دکھتا ہے، کبھی عاشق بن کر سر پھڑواتا ہے، اور کبھی مظلوم شوہر بن کر دوسروں کی ہمدردیاں بٹورتا ہے، سچ کہا جائے تو عمران کی یہی ادائیں لاکھوں قارئین کے دلوں کو دھڑکن اور روح کو تازگی عطا کرتی ہیں۔

ابن صفی نے اپنے کرداروں کو زندہ جاوید بنا کر گویا آبِ حیات پی لیا کیونکہ جب تک انکے ناول پڑھے جاتے رہیں گے وہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں زندہ رہیں گے، ہم تمام قاری انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کے گناہوں کو بخش دے اور ان کو آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے..... آمین... تم آمین۔

ابن صفی عرفان نجمی کانپوری

ہر گلی افسردہ گلشن کی گل تر ہے اداس
موج دریا لیتی ہے سسکی سمندر ہے اداس
آسمان سے تاز میں ہر ایک منظر ہے اداس
اس طرح شہر ادب میں موت کی آندھی چلی
غمزدہ ہر شخص ہے رخصت ہوئے ابن صفی
ہاں وہی ابن صفی جو تھا مفکر فلسفی
گھر کا بھیدی، پھر وہی آواز، نیلی روشنی
اپنی ہر تخلیق میں دیتا تھا درس آگہی
طہر، جاسوسی، تجر، تہقے اور اضطراب
ایڈوچر، شاعری، سسپنس، رومان، انقلاب
دوہرا قتل، آتش بادل، اشاروں کے شکار
ایڈلاوا، پاگلوں کی انجمن، ہیروں کا ہار*
برف کے بھوت، ایش ٹرے پاؤز، چمکیلا غبار
ملک کی الفت ہے مگر عمران کا اغوا پڑھو
رعبت سائنس میں طوفان کا اغوا پڑھو
خونی ریشے، شاہی نقارہ، انوکھی رہزنی

پہلا شعلہ، نیکو کیسل، پراسرار انجی
 گیارہواں زینہ، عجیب آوازیں، ادھورا آدمی
 ہر شمارہ لازوال دے مثال و باکمال
 ہے اگر شک تو پڑھو الفانے، سازش کا جال
 کردئے ابنِ صفی نے مجرموں کے راز فاش
 زرد فتنہ، رانقل کا نفر، قاصد کی تلاش
 سایلوں کا کلراؤ، موروٹی ہوس، سائے کی لاش
 خوب ہے نا دیدہ ہمدرد، آہنی دروازہ بھی
 خون کا دریا ہے عمدہ رات کا شہزادہ بھی
 موت کا مہمان، خیر اندیش، کالی کھکھاش
 ٹھنڈا سورج، چینی روچیں، خطرناک اگلیاں
 تین سگی، جو تک اور ناگن، متحرک دھاریاں
 جو ہیں غدار وطن ان کا ہوا ہے آشفاق
 ڈیڑھ متوالے پڑھو یا پھر سمندر کا شگاف
 خوب بیگم ایکس نو، بیاسا سمندر بھی ہے خوب
 خوب سانپوں کا میسا، آدھا تیر بھی ہے خوب
 خوب ٹھنڈی آگ ہے، گیارہ نومبر بھی ہے خوب
 الفرض تعریف میں اس کی یہ کہتا ہے بجا
 آپریشن جرم کا ابنِ صفی نے کر دیا
 نازش اردو زباں، فخر زماں ابنِ صفی
 کس طرح ہوتیری عظمت کا بیاں ابنِ صفی
 تو رہے گا تا قیامت جاوداں ابنِ صفی
 اب کبھی نشہ تیرے فن کا اتر سکتا نہیں
 قول ہے عرفان بھی کا تو مر سکتا نہیں۔



ذوق آگہی

سباس گل

حمد باری تعالیٰ

رنگِ خوشبو صبا اور ہوا روشنی
میرے اللہ کی ہے ہر عطا روشنی
جس نے مجھ کو بلندی کے رستے دیئے
وہی میرے لیے رہنما روشنی
میری مٹی کو جس نے کندن کیا
وہ میرا مہربان وہ سدا روشنی
ہر مشکل کو آسان اس نے کیا
یا حکیم کا ورد تھا کہ تھا روشنی
تیرگی میں بھی اس نے اجالا کیا
وہ میرے لیے بن گیا روشنی
شکر کرنے کی توفیق عطا ہو مجھے
مجھ کو شب میں بھی مالک دکھا روشنی
یہ تیرا فضل ہے کہ میں ہوں نامور
اپنی رحمت سے گل کی بڑھا روشنی

سباس گل..... رحیم یار خان

غلاف خانہ کعبہ

❖ یہ ہر سال ذی الحج کے مہینے میں تبدیل کیا جاتا

ہے۔

❖ اس کی قیمت دو کروڑ ریال ہے۔

❖ اس کا وزن 670 کلو گرام ہے۔

❖ یہ خالص ریشم کے کپڑے کا بنا ہے۔

❖ اس کی تیاری میں 150 کلو گرام خالص سونا

چاندی لگتا ہے۔

❖ اس کا سائز 658 مربع میٹر ہے۔

❖ یہ 47 حصوں پر مشتمل ہے۔

❖ ہر حصہ 14 میٹر لمبا اور 95 سینٹی میٹر چوڑا ہے۔

❖ اس کو تبدیل کرنے میں 4 گھنٹے لگتے ہیں سبحان اللہ

سید ذیشان شاہ..... کراچی

کٹھن بیٹھے نوٹ لکے

❖ اگر آپ کا وزن زیادہ ہے اور لوگ آپ پر بٹتے ہیں
نیز آپ پتلا ہونا چاہتی ہیں تو نیوز جیمیل باقاعدگی سے
دیکھیں امید ہے وزن کم ہوگا۔

❖ اگر آپ کو خوش گوار خواب نظر نہیں آتے اور رگلتا
ہے تو سونے سے پہلے آئینہ ضرور دیکھیں، بھی ڈر نہیں لگے
گا۔

❖ اگر آپ چھوٹے بچے ہیں، گلی کا کوئی انکل یا بزرگ
آپ کو بلا وجہ ڈانٹتا ہے تو مسکرا کر ڈھیٹ بن کر ڈانٹ سنیں
اور ذرا دور جا کر کانوں سے ٹھونکال لیں۔

❖ اگر آپ بیٹھے خواب دیکھنا چاہتی ہیں تو سونے سے
پہلے آنکھوں میں چینی ڈال لیا کریں اس سے آپ کو بیٹھے
خواب نظر آئیں گے۔

❖ اگر آپ کے شوہر گھر سے زیادہ تر باہر رہتے ہیں
بلکہ اکثر راتوں کو بھی غائب ہو جاتے ہوں تو فکر نہ کریں
اپنے آپ کو خوش رہیں اور ہر وقت خوب بن سنور کر تیار
رہیں شوہر گھر آکر گھر پر رہنا شروع کر دیں گے۔

❖ اگر آپ کھانا بناتے ہوئے اکثر جلا دیتی ہیں اور گھر
والوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں تو گھبراہٹیں نہیں، جلے
ہوئے سالن کو برتاں لگا کر پیش کریں اس طرح کھر والوں
کی جلد بھی ختم ہوگی اور سالن کی بھی۔

❖ گھر میں رکھے ہوئے پودے اگر نہیں بڑھ رہے
تو کیا ہوا؟ دن رات ان کو پانی دیں اور ان کے پاس جا کر
ان کا نام زور زور سے لیں فوراً پڑھیں گے اور ان کا نام ہوگا
”مہنگائی“۔

بشارت شاہ..... میا نوالی

انمول موتی

❖ مومن وہ ہے جو خوشحالی میں شکر اور مصیبت پر صبر
کرتا ہو۔

❖ کسی تصویر کے اتنا قریب مت جاؤ کہ وہ دھندلی
نظر آئے۔

❖ حسن شکر میں پٹنی زہر ملی گولی ہے۔

❖ جب آپ ناکام ہو جائیں تو ناکامی سے ملنے والا
سبق نہ بھولیں۔

ماہ رخ شاہ..... جہلم

تین چیزیں

تین چیزیں پاک رکھو، جسم، لباس، خیالات۔
 تین چیزیں قابو میں رکھو۔ زبان، نفس، غصہ۔
 تین چیزیں یاد رکھو۔ موت، احسان، نصیحت۔
 تین چیزیں برداشت نہ کرو۔ ظلم، جھوٹ، فحاشی۔
 تین چیزیں باقاعدگی سے پڑھتے رہو۔ نماز، قرآن، درود۔

تین چیزیں دھیان سے اٹھاؤ۔ قلم، قدم، قسم۔
 تین چیزیں چھوئی نہ سمجھو۔ قرض، غرض، مرض۔
 تین چیزیں ایک بار ملتی ہیں۔ والدین، وقت، زندگی۔
 تین چیزیں حاصل کرو۔ علم، دعا، اعتماد۔
 تین چیزیں کبھی نہ ٹوڑو۔ دل، عہد، قانون۔
 تین چیزیں ذلیل کرتی ہیں۔ چوری، چغل، چالپوسی۔

فائزہ فاروق..... کراچی
 مشہور کہاوتیں
 اعمال کی آواز الفاظ سے بلند ہوتی ہے
 انتقام کی عمر سو برس کی ہو جائے تو بھی اس کے دانت دودھ کے ہی رہتے ہیں۔
 بہت بُرا ہے وہ آدمی جس سے آدمی ڈریں۔
 جب دوا دی آپس میں جھگڑیں سمجھ لو دونوں غلطی پر ہیں۔
 اعتماد دشمنی سے بچنے کی کوئی ترکیب نہیں۔
 خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔
 نور الہدی..... لاہور

باتیں یاد رکھنے کی
 خواب اور خوشبو دونوں ہی آزاد ہیں، دونوں قید نہیں ہو سکتے میرے خواب اور تمہاری خوشبو۔
 دنیا میں بہترین انسان وہ ہے جس کے لیے کوئی روئے اور بدترین انسان وہ ہے جس کی وجہ سے کوئی روئے۔
 درگزر کرنا اور معاف کرنا سیکھو کیونکہ تم بھی اپنے پروردگار سے یہی امید رکھتے ہو۔
 اے اللہ میں تجھ سے اپنے ظرف کے مطابق مانگتی ہوں تو مجھے اپنی شان کے مطابق عطا فرما۔

کتابوں کو زمین پر نہ گرنے دینا کیونکہ کتابیں انسان کو آسمان پر لے جاتی ہیں۔
 پرس افضل شاہین..... بہاولنگر
 باتیں جودل کو چھو جائیں
 وہ شخص کبھی محتاج نہیں ہوتا جو میانہ روی اختیار کرتا ہے۔

جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ لکھو تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کرو۔
 صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں مدد دیتا ہے۔
 اس دن پر آنسو بہا جو تیری عمر سے کم ہو گیا اور اس میں نیکی نہ تھی۔
 جس نے ایک اسکول کا دروازہ کھولا۔ اس نے ایک جیل کا دروازہ بند کر دیا۔

دردہ کلیم..... کراچی
 اللہ کے ذمے
 حضرت مبارک بن فضالہ ایک روز عباسی بادشاہ منصور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اس نے ایک مجرم کو قتل کرنے کا حکم دیا، مبارک فضالہ نے کہا۔
 ”امیر المؤمنین میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ”قیامت کی دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی سدا دے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے جن لوگوں کا اجر ہو وہ کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت کوئی کھڑا نہ ہوگا“ سوائے اس شخص کے جس نے کسی کو معاف کیا ہو۔“
 یہ سن کر منصور نے کہا ”اس شخص کو آزاد کر دو۔“

سائبرہ واعلیٰ..... مرغانی راجن پور
 مہکتی کلیاں
 میں اپنے حریفوں میں اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چارمنٹ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہوں (نپولین)۔
 عقل مند اور بے وقوف دونوں میں کچھ نہ کچھ عیب ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ عقل مند اپنے عیوب کو خود دیکھتا ہے دنیا نہیں دیکھتی اور بے وقوف اپنی عیوب کو خود نہیں دیکھتا دنیا دیکھتی ہے۔ (ڈاکٹر چارلز)۔

+ اللہ تعالیٰ ہمارے مقدر میں پھر لیے راستے لکھتا ہے تو ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔ (کیری یون)۔
 + جس کے پاس مضبوط قوت ارادی ہے وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بناتا ہے۔ (کوئٹے)۔
 + آدمی کی زندگی کا بہتر حصہ وہ ہے جس میں وہ اچھے کام کر کے بھول چکا ہوتا ہے۔ (دروڈزرتھ)۔
 + ایک کنجوس آدمی کی ذخیرہ اندوزی کا وہی حال ہوتا ہے جو شہد کی مکھوں کے جھتے کا، محنت کھیاں کرتی ہیں جبکہ شہدا دی حاصل کرتا ہے۔
 + کردار کے بغیر علم برائی کی طاقت بن جاتا ہے۔ (گردناک)۔

+ غصہ ہمیشہ حماقتوں سے شروع ہوتا ہے اور ندامتوں پر ختم۔ (ارسطو)۔
 + خاموش رہنا اور بے وقوف شمار ہونا بول کر تمام شبہات کو دور کرنے سے بہتر ہے۔ (برٹن شاہ)۔
 + ماں کا دل ایک ایسا بینک ہے جہاں ہم اپنی تمام پریشانیاں اور دکھ جمع کرا دیتے ہیں۔ (ڈی وٹ ٹانج)۔
 + ناکلہ نور..... کراچی

مختصر مگر پڑا اثر

امام ابن رہب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ ہیں فرماتے ہیں میں نے غیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کرتا اگلے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بابت نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی ہو گئی اور سزائیں بھی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔ ظاہر ہے جس چیز میں لطف محسوس ہو وہ سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کر دیا اور یہ سزا نفس کو شاک گزری اور یوں غیبت کے روگ سے نجات مل گئی۔

حسنہ بحر..... قصور

کھانے کا اسلامی طریقہ

① پہلے لقمہ برہم اللہ دوسرے سے قبل برہم اللہ الرحمن اور تیسرے سے پہلے برہم اللہ الرحمن الرحیم پڑھیے۔
 ② بسم اللہ زور سے پڑھیے تاکہ دوسروں کو بھی آواز آجائے۔

③ یاد اوجہ..... جو کوئی کھانا کھاتے وقت ہر نوالہ پر پڑھا کرے گا تو ان شاء اللہ اس کے پیٹ میں نور پیدا ہوگا اور بیماری دور ہوگی۔

④ مٹی کے برتن میں کھانا افضل ہے۔
 ⑤ سالن یا چٹنی کی پیلائی روٹی پر مت رکھیں۔
 ⑥ ہاتھ یا چھری کوروٹی سے نہ پونچھے۔
 ⑦ زمین پر دسترخوان بچا کر کھانا سنت ہے
 ⑧ ٹک لگا کر، ٹکے سر لپیٹے یا چوڑی مار کر کھانا مت کھائیے۔
 ⑨ اول آ خر نمک یا نمکین کھائیے اس سے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔

⑩ روٹی ایک ہاتھ سے نہ توڑیے کہ مغروروں کا طریقہ ہے۔
 ⑪ روٹی اٹے ہاتھ میں پکڑ کر سیدھے ہاتھ سے توڑیے سنت ہے۔
 ⑫ سیدھے ہاتھ سے کھائیے اٹے ہاتھ سے کھانا پینا لینا دینا شیطان کا طریقہ ہے۔
 ⑬ کھانا کھانے سے پہلے پھل کھائیے مفید ہے۔
 غلام فاطمہ..... سمبہریال

بچ جو دل کو بھاجائے

⑭ غلطی ماننے اور گناہ چھوڑنے میں کبھی دیر مت کیجیے کیونکہ سفر جتنا طویل ہوتا جائے وہی اتنی ہی دشوار ہوتی ہے۔
 ⑮ شکر ادا کرتے رہو اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔
 ⑯ زمانہ بڑے لوگوں کی برائی کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے۔

⑰ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ پریشانیوں میں گھرا ہونے کے باوجود ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھا جائے۔

⑱ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔
 ⑲ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں

انصاریؒ کے ہاں اس دن ایک سو اتنی آدمیوں نے کھانا کھایا۔

دلاور شاہ..... کراچی

○ امید ایک ایسا لفظ ہے جو دل کو تسلی دیتا ہے
○ امید ایک ایسا جگمگاتا جگنو ہے جو بھٹکے ہوئے

انسان کو حوصلہ دیتا ہے
○ امید انسان کی رگ رگ میں اس طرح دوڑتی ہے
جس طرح زعمہ انسان کے جسم میں خون دوڑتا ہے۔

○ امید ایک ایسی رہ گزر ہے جو انسان کو اس کی منزل کے قریب لے جاتی ہے۔

○ امید کے بل بوتے پر دنیا کا نظام چل رہا ہے
عائشہ اکرم..... دہاڑی

○ یقین کرنے کے بعد کسی جمعی ثبوت کی گنجائش نہیں رہتی۔

○ اپنے اندر اتنی بھاری خواہش نہ ڈالو جو اپنے بوجھ سے گرا دے۔

○ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ بے وقوف پر یقین اور اچھے پر شک کیا جاتا ہے۔

○ جھوٹ بولنے کے لیے شرمندہ ہونے کا حوصلہ چاہیے۔

مہوش نورین مشی..... جھنگ صدر



لیکن ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایک نہیں مانتے۔

○ ہر حال میں رب کا شکر ادا کرتے رہو بے شک خالق کائنات وہ جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے۔

○ ہماری ہر آرزائش کے پیچھے ہماری بھلائی پوشیدہ ہے کہ ہر آرزائش انسان کو کندن بناتی ہے اور نکھار پیدا کرتی ہے۔

○ ناکامی جرم نہیں مقصد کا پست ہونا جرم ہے۔
امداد علی..... گوجرانوالہ

حد سے بڑا گناہ
حضرت سعدی بیان فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں پڑھتا اور پڑھاتا تھا میرا ایک

ساتھی میرے حسن بیان اور نکتہ آفرینی کے باعث مجھ سے بہت حد کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے استاد محترم سے

کہا کہ فلاں شخص میرے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ وہ میرے کمال کے باعث مجھ سے حد کرتا ہے۔

استاد محترم نے یہ بات سنی تو خفگی کا اظہار فرمایا اور کہا۔ ”حیرت ہے تو اس کے گناہ سے تو آگاہ ہو گیا کہ وہ

حد کرتا ہے لیکن اپنے بارے میں تو نے سوچا کہ تو بھی غیبت جیسے گناہ کا ارتقاب کر رہا ہے اگر اس حاسد نے

دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنایا ہے تو دوسرے راستے سے تو بھی وہیں پہنچ رہا ہے۔

حکایات: بوستان سعدی
شاہ رخ علی..... میرپور خاص
کھانا

حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی دعوت کی اور صرف اتنا

کھانا پکوا یا جو کہ آپ دونوں کے لیے کافی ہو جائے۔ کھانے کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

”انصار میں سے تیس معززین کو بلا لاؤ“ جب وہ تیس کھانا کھا کر چلے گئے تو کھانا اتنا ہی موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ ”ساتھ آدی اور بلا لاؤ“

چنانچہ وہ بھی بلا لیے گئے پھر ارشاد فرمایا کہ ”ستر آدی اور بلا لاؤ“ وہ بھی آئے اور پیٹ بھر کر کھا گئے لیکن کھانا پھر بھی اتنا

ہی موجود تھا یہ دیکھ کر سب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر لی۔ حضرت ابو ایوب

خوش بوئے بدخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

میرا ہی نہیں عشق میں نقصان ہوا ہے
سب کا ہی یہاں چاک گریبان ہوا ہے
کہتے ہیں کہ آسیب محبت ہے وہاں پر
جس دل کا مرے عشق تو مہمان ہوا ہے
آئے وہ مرے پاس عیادت کے بہانے
کچھ ایسے شفا یابی کا سامان ہوا ہے
جو عشق کے دربار میں آتا ہے گداگر
وہ حسن کی اقلیم کا سلطان ہوا ہے
بدلا ہے کچھ ایسے ہمیں ہنگام جہاں نے
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران ہوا ہے
اک ٹو ہے جو کچھ اور حسین ہونے لگا ہے
اک دل ہے مرا عشق میں ہلکان ہوا ہے
وہ اور کسی اور سے الفت کو بھائے ؟
بس یونہی قمر تجھ کو یہ خلجان ہوا ہے
قمر آسی..... کراچی

آرزوئے گل

ہر کہانی سفر میں چھوڑ آئے
زندگانی سفر میں چھوڑ آئے
کچھ سنبھالا گیا نہ الفت میں
ہر نشانی سفر میں چھوڑ آئے
دیکھتے کیا ہو میرے چہرے کو
ہم جوانی سفر میں چھوڑ آئے
بھوک سے جب مرے تو یاد آیا
دانہ پانی سفر میں چھوڑ آئے
یاد رکھنے کو یہ بھی کافی تھا
رت سہانی سفر میں چھوڑ آئے

غم کا دریا تو دل میں ٹھہرا تھا
اور روانی سفر میں چھوڑ آئے
عشق میں ہم نے بار بار گواہی
خاک چھانی سفر میں چھوڑ آئے
غلام فرید گواہی.....

غزل

تلخی جب آگئی کہانی میں
مجھ کو مارا گیا جوانی میں
خط شکستہ، گلاب، اور آنسو
ہوں محبت کے ہر نشانی میں
چھوڑ جاؤں شہر خموشی سے
کیسے وہ کہہ گیا روانی میں
عکس تیرا نہیں رہا اس میں
آکھ سے بہہ گیا ہے پانی میں
میں ہوں، اور ہوں مدینے کی گلیاں
زندگی گزرے نعت خوانی میں
پوچھتے کیا ہو ناتواں دل کا
توڑا ڈالا ہے کھینچا تانی میں
امر ہو جائیں لمحے جیون کے
لٹے آئے وہ رت سہانی میں
کانٹے جھپٹے ہیں پھول چننے میں
ہم نے سیکھا ہے باغبانی میں
شہر میں ڈھونڈتا ہے مجھ کو اب
جس نے چھوڑا تھا بد گمانی میں
یاد کیا کچھ دلا گیا نہ وصال
اس کا ملنا گلی پرانی میں

احمد وصال.....

غزل

دیوار و در سے حوتی رمی گفتگو تمام
اپنی تو رائیگاں می گئی جستجو تمام
بکتے پہ آسمانی ہے جنسِ وفا مری

بازار میں ہیں بیٹھے لئے آبرو تمام
کیسے حضور۔ قلب کی دولت نصیب ہو
پڑھتے نماز عشق رہے بے وضو تمام
زخم اتنے دوستوں کی طرف سے عطا ہوئے
حسرت سے دیکھتے ہیں ہم کو عدو تمام
اسکی جدائیوں نے وہ گھاؤ ہمیں دیئے
ہو پائے زندگی میں نہ ہم سے رفو تمام
پھوٹے نہال ذات پہ جو غنچہ حائے ہجر
خون جگر سے پاتے رہے ہیں نمو تمام
تو نے نگاہ ناز سے ایسی پلائی سے
رندوں نے اپنے ہاتھوں توڑے سبو تمام
ہم پہ اداسیاں ہی مریم ہیں مہریاں
لوٹے یہاں غموں نے مرے رنگ و بو
تمام
مریم ناز..... ہارون آباد

غزل

مسلمہ یہ نہیں کہ میں نے تعلق قطع کر لیا ہے
مسلمہ یہ ہے کہ اس کا الزام اپنے سر لیا ہے
مسلمہ یہ نہیں کہ شعلوں سے حرارت لی ہے
مسلمہ یہ ہے کہ ہاتھوں میں انہیں بھر لیا ہے
مسلمہ یہ نہیں کہ مجھ کو وہ میسر نہیں ہے
مسلمہ یہ ہے کہ اس نے اجنبی خود کو کر لیا ہے
مسلمہ یہ نہیں کہ دنیا میری مخالف ہے
مسلمہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کا یقین کر لیا ہے
مسلمہ یہ نہیں جو بات وہ کہے سچ ہے فرح
مسلمہ یہ ہے کہ دل نے اس پہ اعتبار کر لیا ہے
فرح بھٹو..... حیدرآباد

غزل

کہ خواب دیکھنا بھی اک ہنر ہے کہتے ہیں
کہ چاندنی کی بھی تم پر نظر ہے کہتے ہیں
ہمارا حال جو ہم پر نہ کھل سکا ہے کبھی

ہمارے حال کی ان کو خبر ہے کہتے ہیں
ہولہ جب سے اندھیروں سے میل جول اپنا
کھن تو تب سے ہمارا سفر ہے کہتے ہیں
قضا نے شہر میں وحشت پھیلانے رکھا ہے
وہ زندگی کا مسافر کدھر ہے کہتے ہیں
کئے گی کیسے ہماری عمر وہاں پہ جاز
کہ برگ برگ جہاں بے ثمر ہے کہتے ہیں
فرخ جاز.....

غزل

نہیں لگتا تمہارے بن مرا دل
نہیں ہوتا مجھے دیدار حاصل
نہ پکڑو ایسے دامن ہر کسی کا
کوئی تو ایک دامن تمام کامل
جہاں پر خود بک جاتے ہیں منصف
وہاں پکڑے نہیں جا سکتے قاتل
کروں کیا میں بتا دے تو ہی مجھ کو
میں کیسے تیرے بن پاؤں گا قابل
کہاں ممکن جو تم کو بھول پائیں
نہیں رضوان ہو سکتا ہے غافل
ملک رضوان خان..... مندرہ، راولپنڈی

غزل

میری ہر ایک سوچ سے لپٹی تیری یاد
خوشبو بن کر مجھ میں مہکی تیری یاد
آنکھ میں بینائی بپتی تیری تصویر
دل کی ہر دیوار پہ لگی تیری یاد
ایک حصار میں مجھ کو باندھے رکھتی ہے
میرے چاروں جانب پھیلی تیری یاد
خوشی کے سارے رنگ مجھے دکھلاتی ہے
سرخ گلاب پہ بیٹھی تھلی تیری یاد
میرے جسم کے تانے بانے میں رہتی ہے
میری روح کے اندر سمٹی تیری یاد

چاند کی چاندنی جیسی ٹھنڈی میٹھی
سورج کی گزروں سی اعلیٰ تیری یاد
میرے ہر اک شعر میں ڈھلتا تیرا ذکر
میری ہر اک لقم میں لکھی تیری یاد
سے لیکر انت سے تک میرا ایک وظیفہ
تیری یاد بس تیری تیری تیری یاد
ناہید اختر بلوچ..... ڈیرہ اسماعیل خان

غزل

تو کیا یہ ملے ہے، کہ اب عمر بھر نہیں ملنا
تو پھر یہ عمر بھی کیوں، تم سے گر نہیں ملنا
یہ کون چپکے سے تنہائیوں میں کہتا ہے
جرے بغیر سکوں غم بھر نہیں ملنا
چلو زمانے کی خاطر یہ جہنم بھی سہ لیں
کہ اب ملے تو کبھی ٹوٹ کر نہیں ملنا
رو وفا کے مسافر کو کون سمجھائے
کہ اس سفر میں کوئی ہمسفر نہیں ملنا
جدا تو جب بھی ہوئے دل کو یوں لگا جیسے
کہ اب مجھے تو کبھی لوٹ کر نہیں ملنا
جیل..... دینی

برالہو لہو یا اللہ خیر

بتاد جرم ہی کیا تھا
انہیں مارا گیا کیونکر
بڑے معصوم مسلمان پر
بہت مظلوم مسلمان پر
جو تم نے ظلم ڈھائے ہیں
خدا غارت کرے تم کو
تمہارا وقت اب آیا ہے
نا حق جو خوں بہایا ہے
خدا انصاف کرتا ہے
وہ بدلہ لے گا مسلم کا
جہیں برباد کر دے گا

نشاں باقی نہ رہے گا

سید زویب حسن زویب

غزل

بزم ادب یوں چھوڑ کر گیا وہ
لوح و قلم سرگوش کر گیا وہ
آج غلوت غم سے نکل گیا وہ
مجھے خانہ بدوش کر گیا وہ
چپ رہ کر دھوکا دے گیا وہ
مجھے ڈوبتے دیکھ کر گیا وہ
چشمِ نم سے فریاد پڑھ گیا وہ
ادھار نہیں رکھا بدلہ چکا کر گیا وہ
کچھ اس طرح آنکھ ملا گیا وہ
جیسے جانے کا بتا کر گیا وہ
کامران اک عمر گزار گیا وہ
زندگی کا تجربہ دے کر گیا وہ

کامران مغل..... کراچی

سانپ سیرمی

یہ جو سانپ سیرمی کا کھیل ہے ابھی ساتھ
ہی تھے دونوں ہمو

وہ بھی ایک پہ میں بھی ایک پہ

اسے سیرمی ملی وہ بڑھ گیا!

مجھے رستے میں ڈس لیا میرے بخت کے

سانپ نے!

بڑی دور سے لوٹنا پڑا چوٹ نصیب کی کھا

کے!

وہ نانوے پہ پہنچ گیا میں دس کے پھیر

میں گھر گیا!

اسے ایک چاہئے تھا سو نہیں ملا میں بڑھتے

بڑھتے بڑھ گیا!

بس اک چوکے کی بات تھی!

مگر اس سے جیت میری مات تھی!

میں نے جان کے گوٹ غلط چلی اور سانپ
کے منہ میں ڈال دی!
یہ پیار بھی کبھی سوچتا سانپ سیزمی کا
کھیل ہے

ناصر محمود..... ہانگ کانگ
غزل

فرات ذات سے جب انتقام لیتا ہوں
لہو سے پیاس بجھانے کا کام لیتا ہوں
میں عاجزی کے پروں سے اڑان بھرتا ہوں
میں لامکاں کی خیر صبح و شام لیتا ہوں
جہاں کی چشم رعوت پہ خاک ڈال کے میں
فقیر رو سے دعا سلام لیتا ہوں
تیز دیر و حرم جوم ہے محبت میں
جو مگرنے لگتا ہے میں بڑھ کے تمام لیتا ہوں
سجا گیا ہے جو آنکھوں میں خواب صبح نجیب
دیے جلاتا ہوں جب اس کا نام لیتا ہوں
سید نجیب علی شاہ..... اسلام آباد

بہاریں
بہاریں مجھ سے کہتی ہیں
محبت ذوق ہے جاناں
دقا پھر مجھ سے کہتی ہے
محبت شوق ہے جاناں
حیات نے پھر کہا مجھ سے
محبت فوق ہے جاناں
مبا پھر یوں اٹھی
محبت طوق ہے جاناں
مرا مسلک تو کہتا ہے
محبت اک عبادت ہے
نہیں منزل یہاں جس کی
یہ اک ایسی ریاضت ہے
یہاں جو سر کٹاتے ہیں

وہی منزل کو پاتے ہیں
کسی کی کب یہ سنتے ہیں
کسی کو کب سناتے ہیں
محبت روگ ہے جاناں
عجب اک سوگ ہے جاناں
گلے جس کو لگاتا ہے

اے سولی سجاتا ہے
تمہیں اس کی خبر کیا ہے
کسی کی اک نظر کیا ہے

سید اقبال حسین شاہ

غزل

کب مریضانا محبت نے شفا پائی ہے
انکے حے میں تو تا عمر کی تنہائی ہے
اس تعلق نے بہت نام دیا ہے مجھ کو
انکے ہونے سے ہوئی میری پذیرائی ہے
میں نے کچھ اپنے رویے کو بدل ڈالا ہے
اسکے لہجے میں بھی اب تھوڑی چٹک آئی ہے
رات بچپن کی کوئی چیز پرانی دیکھی
زندگی آج تیری یاد بہت آئی ہے
اسکے انداز زمانے سے جدا لگتے ہیں
جان لیتی ہے میری اسکی جو انگڑائی ہے
بعد اسکے تو نظر کچھ بھی نہیں آتا اب
وہ جو چمچڑا تو گئی آنکھ کی مینائی ہے
اس جدائی کی روایت کو ختم کر دو اب
لوٹ آؤ کہ ہماری جان پہ بن آئی ہے
شیخ طلحہ.....



مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر 4

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز
اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی
مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور خشک گرواس کے کھلونے بنے
بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر..... وہ کسی کامرید ہو گیا.....!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی





”کون ہے یہی؟“

”کون ہے وہی؟“

ایک ساتھ دو آوازیں بلند ہوئی تھیں ایک مکان کی دوسری منزل سے اکرم عرف اکو کی جو بیرے کے ساتھ پہرے پر مامور تھا اور دوسری مرشد کی کنگان نے بھی فوراً بھونکنے شروع کر دیا تھا۔

”دروازہ کھول شاہ زادے!“

جواب میں سنائی دینے والی بلند اور پاٹ دار آواز پردہ سبکی چونک پڑے۔ مرشد فوراً ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو رستم لہوری کو بالکل دروازے کے سامنے کھڑا پایا۔ اس کے عقب میں اس کے چند کارندے بھی موجود تھے۔

”رستم لالا! اس وقت اس طرح اچانک..... خیریت تو ہے نا؟“

مرشد نے کسی قدر تعجب سے پوچھا۔ رستم لہوری کی آمد قطعی طور پر غیر متوقع تھی۔ وہ تو کبھی بیٹوں بعد ہی ادھر کارخ کرتا تھا۔ اکثر اوقات مرشد ہی اس کے ڈیرے پر چکر لگاتا تھا۔

”سب خیریت ہی ہے شاہ زادے بس دل کیا اور اٹھ کر چلا آیا۔“

رستم نے آگے بڑھ کر مرشد کو بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

”تو تو ہو گیا ہے بھگا“ آج تین ہفتے ہو گئے اور تجھے اپنے لالا کا خیال نہیں آیا کہ شکل ہی دکھائے سو میں چھاپا مارنے آ گیا۔“

”مگر..... اس وقت!“ شاید رستم کے جواز پر مرشد کی تفسی نہیں ہوئی تھی۔

”چھاپے تو ایسے بے وقعتے ہی ہوتے ہیں نا۔“ یہ نصیر تھا عقب میں سات بندے اور تھے۔ سبھی مرشد کو سلام کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ چبوترے کی طرف بڑھے۔ سادان اور مراد پہلے ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

رستم نصیر مرشد اور سادان تو چبوترے پر بیٹھ گئے جب کہ مراد کی علیک سلیک کے بعد تین بندوں کو ساتھ لے کر اندرونی طرف چلا گیا۔ چبوترے کے ارد گرد فوراً ہی تین چار چار پائیاں نکال کر بچھا دی گئیں۔ اوپری منزل سے اکو اور

شیر بھی اتر آئے اور مرشد کے مزید تین ساتھی جو دوسری منزل پر سو رہے تھے وہ بھی فوراً انچروں پر پانی کے چھیننے مار کر رستم لہوری کے گھٹنے چھونے کی غرض سے چلے آئے۔ وہ لوگ لیچے آئے تو رستم کے دوا دی غیر محسوس سے انداز میں اوپری منزل کی طرف چلے گئے۔

مراد اکو اور جعفر کو ساتھ لے کر ناسٹے پانی کے انتظام کے لیے نکل گیا۔ باقی چار پائیاں پر مسلط ہو گئے۔ بظاہر وہ لوگ خود کو مطمئن ثابت کر رہے تھے مگر مرشد نے محسوس کر لیا کہ وہ کچھ جو کئے ہیں اور جو دہندے جھٹ پر گئے تھے انہیں بھی مرشد نے ٹھکے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”جوانوں نے رات بھر جاگایا ہے..... ہیں۔“

رستم نے جگ گلاس اور بوتل کو دیکھ لیا تھا۔

”بس چہل پنے کا موڈ ہو گیا تھا۔“

عورت اور شراب دونوں چیزیں مرد کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں عورت گھٹنوں سے لے کر ہنسی ہے تو شراب کم بخت کلیجہ کھا جاتی ہے۔“

مرشد نے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا اس کا رکھا ہوا گلاس دیسے کا دیا بھر رکھا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھالیا اور ایک شہر جیسے خود بخود اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

پیتا ہوں اس غرض سے کہ جل جائے جوانی واللہ کسی شوق کے مارے نہیں پیتا! گھٹنوں میں تو ہمیشہ سریار ہے کالا مگر یہ کلیجہ..... یہ کم بخت خون بن کر منہ سے باہر آ جائے تو شاید سینے میں کچھ ٹھنڈک اتر آئے۔“

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

”تو نے کسرت وغیرہ چھوڑ رکھی ہے؟“

”نہیں، بس ایک وقت..... صبح یا پھر شام میں۔“

”زندگی تو بس جوانی کا نام ہے شاہ زادے! اسے موت تک قائم رکھا جاسکتا ہے لیکن اسے سنبھال کر لگایم دے کر نہ رکھا جائے تو یہ بس چند سال کی ہوا ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد بندہ فارغ..... لہذا اس کی قدر کرو..... کلیجہ خون کرنے میں تو کوئی وقت نہیں لگتا۔“ رستم نے لاچا تھوڑا آہستہ ہوئے گاؤٹکے سے ٹیک لگالیا۔ نصیر سادان کے ساتھ کسی بات میں مگن تھا اور ان کے

والا ہے۔“
رستم بغور مرشد کے چہرے کو دیکھ رہا تھا مگر اس کا چہرہ بالکل سیاہ تھا۔
”تو یعنی تم اپنی فوج کے ساتھ مرشد کا پجاؤ کرنے کے لیے پہنچے ہو۔“
”نہیں..... گھوڑے کی طبیعت درست کرنے کے لیے آئے ہیں۔“

”گھوڑا.....“ مرشد نے ہٹکارا سا بھرا۔ ”کالے کے کتوں کی تو سمجھاتی ہے کہ وہ کھل چھترول کر داکر گئے ہیں مگر گھوڑے کے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھا ہے..... اسے کیا تکلیف ہے۔“

”کالے خان کا بھائی اور اس کے کچھ مزید بندے گھوڑے سے جا ملے ہیں اور گھوڑا تو تیرے لیے عرصے سے دل میں کدورت رکھتا ہے۔ وجہ تو جانتا ہی ہے۔“

”ہاں! وہ بھی اپنے چیلوں سمیت ادھر سے جوتی کھا کر گیا تھا مگر شاید کسر باقی رہ گئی۔ عقل نہیں آئی اسے..... مزید سیوا خاطر چاہتا ہے وہ۔“

”ذمن کو ہمیشہ خود سے زیادہ سمجھنا چاہیے مرشد اور پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے تو گھوڑا ویسے ہی کافی زور پکڑ چکا ہے۔ رانا سرفراز اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔“ نصیر نے سنجیدگی سے کہا۔ رانا سرفراز سے مرشد بھی واقف تھا۔ وہ شیخ پورہ کا رہائشی تھا اور پنجاب اسبلی میں ممبر تھا۔ خاصے اثر و رسوخ والا بندہ تھا وہ۔

”گھوڑا اور دشمن۔“ مرشد کے چہرے پر بد مزگی کے تاثرات پھیل گئے۔

”حد کرتے ہو لاا نصیر! اب گھوڑے جیسی چیزوں کو دشمنوں میں شمار کرنا ہوگا..... دشمنی کا بھی کوئی معیار ہوتا ہے۔ ایسے شہدوں سے اپنا کیا واسطہ بھلا۔ باقی اگر وہ آجاتا ہے تو اچھا ہی ہوگا پہلے وہ یہاں کی ساری گلیوں میں بھجرا کرے گا اس کے بعد اسے تھ پہنا کر رانا سرفراز کے ہاں بھیج دوں گا۔ ذرا بھی عقل نام کی چیز اس رانا کے پاس ہوئی تو خود ہی گھوڑے کی پشت سے ہاتھ ہٹالے گا وہ۔“

”میں نے دلاؤ کو بھیجا ہے نا گھوڑے کی طرف..... سمجھ داری سے کام لے گا تو شرارت سے باز رہے گا، نہیں تو پھر دیکھ لیں گے اسے۔“

باقی کارندے اور مرشد کے ساتھی آپس میں کب شپ کرنے لگے تھے۔ مرشد اور رستم کے درمیان یونہی بے مقصد سی باتیں ہو رہی تھیں۔ صحن میں صبح کی سپیدی اتر آئی تھی؛ پھر بیرونی دروازے سے مراد لوگ اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ناشتے کے برتن بھاڑے اور شاپرز وغیرہ اٹھار کئے تھے۔ اندر آئے ہی وہ لوگ فوراً سب کے سامنے ناشتہ چانے لگے۔

رستم لہوری نصیر مرشد سادوں اور مراد چہوترے پر ہی بیٹھ گئے۔ مراد نے خوب اچھا انتظام کیا تھا۔ سری پائے نہاری دمی پرائے! کو تین چار بندوں جتنا کھانا لے کر چھت پر چلا گیا اور مراد جب چہوترے پر بیٹھا تو دوزیدہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں مرشد سے مخاطب ہوا۔

”پانچ چھ بندے باہر بھی ہیں..... انہوں نے نہ تو ناشتہ قبول کیا اور نہ ہی اندر آنے کو تیار ہوئے! ان کا کیا؟“

”کہاں؟“ مرشد نے مختصر اپو چھا۔

”تین باہر گلی میں ہیں اور دو ادھر..... گلی کی ککر پر۔“

”ٹھیک ہے..... ان کی ٹینشن مت لو وہ فی الوقت ڈیوٹی پر ہیں۔“ مرشد زیر لب مسکرایا تھا۔

”کیسی ڈیوٹی؟“

”جب لالا پردہ رکھ رہا ہے، نہیں بتانا چاہتا تو پوچھ بھی مت۔“

مرشد ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مراد نے ایک نظر رستم اور مرشد کی طرف دیکھا اور خاموشی سے کھانے لگا۔ ناشتہ سبھی نے خوب سیر ہو کر کیا، اس کے بعد رستم نے مرشد اور نصیر کو ساتھ لیا اور ایک اندرونی کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں صرف لکڑی کا ایک شیخ دو کرسیاں اور ایک چار پائی رکھی تھی۔ رستم چار پائی پر بیٹھ گیا جبکہ مرشد اور نصیر کرسیوں پر..... چند لمحوں کے درمیان خاموشی رہی پھر مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلو لا! بہت ہو گئی اب دل کا بوجھ اگل بھی دو۔ کب تک داڑو تیلے نگر دو بائے رہو گے۔“

”خبر لٹی گئی کہ یہاں دو گروہ حملہ آور ہونے والے ہیں۔

کچھ بندے کالے خان کے اور باقی اجو گھوڑے کے مشنڈے..... سنا ہے کہ گھوڑا خود ان سب کے ساتھ آنے

مراد اور شبیر چپوترے پر بیٹھے تھے ان کے ساتھ دو بندے رستم لہوری کے بھی موجود تھے۔ جعفر اور او کو کیاں سنبھالے صحن کے آدھے حصے میں بنائے گئے اکھاڑے کوتاہ کرنے میں مصروف تھے اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر جگت بازی بھی کر رہے تھے۔

مرشد کے پہنچنے ہی رستم کے بندوں نے چپوترہ چھوڑ دیا۔

”آج تو کھوڑے گدھے سب بیچ کر سوئے ہوا استاد! ظہر کی نماز بھی نہیں پڑھی۔“ مراد فوراً چکا تھا۔ مرشد اس کے قریب ہی ٹانگیں لٹکا کر چپوترے پر ٹپک گیا۔

”ساون کدھر ہے؟“

”وہ بھی ابھی جا گا تھا۔ منہ بھی نہیں دھویا اور نکل گیا! اپنی گلابو کی طرف! کہہ رہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گلابو مجھے یاد کر رہی ہے۔“

”یہ گلابو کچھ زیادہ ہی سوار نہیں ہوتی جاری اس کے دماغ پر؟“

”ہوتی جا نہیں رہی..... ہو چکی ہے۔“

”بس کر مراد! کیوں الزام لگا دے ہے اس غریب پر۔“ جعفر کسی ایک طرف رکھتا ہوا بولا۔

”اپنے ساون کے دماغ پر سوار نہیں وہ..... ساون اس کمینے کے دماغ پر چڑھا ہوا ہے۔ ساون تو اپنے گھر چکر لگانے گیا ہے استاد۔“

جعفر بات کرتا ہوا چپوترے کی طرف آیا تو اکسل اور دلشاد (رستم کے حواری) قہقہے اٹارتے ہوئے اکھاڑے کی طرف بڑھ گئے۔

”اجازت ہے نا استاد۔“

دلشاد نے مرشد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ مرشد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مراد کو مخاطب کیا۔

”کیوں ہر وقت فضول کی باتیں کرتا رہتا ہے تو؟“

”پتا نہیں پھر گھر ہی گیا ہوگا میرے سامنے تو گلابو ہی کو یاد کر رہا تھا۔“

”لالا کہ باقی تین بندے کدھر ہیں؟“

”ایک چھت پر اور دو باہر ادھر..... چاہے گوگے کے تھڑے پر بیٹھے ہیں۔“ شبیر نے جواب دیا تو جیسے مراد کو بھی یاد آیا۔

رستم نے نصیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر کھوڑا شریف کی خدمت میں اتنی بیچ دیا تھا تو پھر ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ دلاور کی کھوڑے کی طرف بھیجنے والی بات شاید مرشد کو ابھی نہیں لگی تھی۔

”یہ بات تجھے سمجھا تھا تو مشکل ہے۔ تیری عمر میں میں بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ ضدی، جذباتی، بالکل اکھڑ مزاج، جوانی کے خون کی تاثیر ہی الگ ہوتی ہے بندے کو ہر مشکل ہر مسئلے کا ایک ہی حل سمجھاتا ہے بازو کی طاقت مگر بازوؤں کی طاقت سے زیادہ طاقت ہوتی ہے انسان کے دماغ میں..... جسے عقل کہا جاتا ہے لیکن عقل بھی آتے آتے ہی آتی ہے ابھی تو نے خود ہی کہا تھا نا کہ دشمنی کا بھی کوئی معیار ہوتا ہے تو بس اسی طرح مجھ کے کھوڑے جیسے لوگوں سے کسی سڑک چوراہے پر دنگل کرتا ہم لوگوں کو چٹا نہیں۔“

وہ تینوں کچھ دیر مزید وہیں بیٹھے بات چیت کرتے رہے۔ ان کے وہیں بیٹھے بیٹھے دلاور بھی پہنچ گیا۔ وہ گرم جوشی کے ساتھ مرشد سے ملا تھا رستم کی سوالیہ نظروں پر اس نے بتایا کہ اس کی بات کھوڑے کی سمجھ میں آگئی ہے اور اب وہ ادھر کو منہ نہیں کرے گا ساتھ ہی اس نے کالے خان کا بھی بتایا کہ اس نے بھی فون پر اپنے بھائی اور کھوڑے کو منع کیا ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی قدم انہی نہ اٹھایا جائے اور یہ کتا آج شام تک کالے خان خود بھی واپس پہنچ جائے گا۔

یعنی فی الوقت فساد مل گیا تھا مگر رستم لہوری ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک وہیں موجود رہا اور جب جانے لگا تو مرشد کے منع کرنے کے باوجود اپنے پانچ بندوں کو وہیں چھوڑ گیا۔

رستم کے جانے کے بعد مرشد دوسری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اسے ذرا بھر بھی کوئی فکر یا پریشانی نہیں تھی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا شراب بھی کچھ زیادہ ہی پی تھی سو وہ پوچھل طبیعت کے ساتھ بستر پر دراز ہوا اور کچھ ہی دیر میں اپنے گرد و پیش سے خبر ہو گیا، پھر جس وقت اس کی آنکھ کھلی اس وقت عصر کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں سرقد رے بھاری تھا کچھ کسکندی سی طاری تھی فجر اور ظہر کی نمازیں بھی آج قضا ہو گئی تھیں۔ لہذا اس نے غسل کر کے سب سے پہلے نماز ادا کی اور پھر زینے اتر کر نیچے چلا آیا۔

’اوائے ہاں! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا‘ یہ چکر کیا ہے استاد۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہی..... ان کی یہاں موجودگی اور استاد ستم کا اس طرح پہنچنا کیا رولا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں۔“

”چلو عام ہی سہی پتا تو چلے۔“

”للا لا کا خیال ہے کہ کالے خان کے لوگوں کی طرف سے انتقامی کارروائی ہو سکتی ہے۔“

”اوواہ بھی! تو ان زخموں کے لیے استاد چل کر یہاں تک پہنچا حد ہے۔“

”ان سب کے لیے تو ہم دو چار ہی کافی تھے۔“

شیرے نے فوراً اظہار کیا تھا۔

”مرشد استاد! کہو تو ان کے ڈیرے پر جا کر کھڑا آویں سب کو؟“ جعفران کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

”لخت ڈالو۔“

”کل پانچ جنے جوتے کھا کے گئے ہیں اور آج باقیوں کو خارش شروع ہو گئی۔“

”کہا ہے نامی ڈالو کوئی اور بات کرو۔ بلکہ لنگوٹ کسو اکھاڑہ تازہ ہو چکا ہے۔“

مرشد نے بے پرواہی سے کہا اور پھر سب حسب معمول باری باری تیاری کر کے زور آزمائی اور کسرت میں مشغول ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح مرشد نے ایک ایک دو دو کو پچھاڑا اور ہاتھ پاؤں جھاڑتا ہوا اکھاڑے سے نکل گیا۔

”تم لوگ جاری رکھو! اذان ہونے والی ہے! میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔“

اس کے ساتھی جانتے تھے کہ مغرب کی نماز مرشد نے کہاں پڑھنی ہے۔

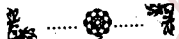
مرشد نے نہا کر لباس تبدیل کیا..... اتنے میں مغرب کی اذان شروع ہو گئی اور وہ مکان سے نکل کر عموماً وہ صبح سے رات تک تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگردو تین بار گھر کا چکر ضرور لگایا کرتا تھا کمر آج سارا دن وہ یہیں موجود رہا تھا۔ اسے اپنی باجی امی کا خیال آیا تو سینے میں وہی مخصوص رخ کی جلن جاگ اٹھی جو بچپن سے اس کے ساتھ ہی پروان چڑھی تھی۔

”پتا نہیں آج دن میں اماں نے دوا بھی کھائی ہوگی یا نہیں۔“

اس نے سر جھکا اور اپنے شناساؤں کے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

حسب سابق اس کے ذہن میں یہی تھا کہ سب سے پہلے چپ چاپ اماں کو دوا کی خوراک کھلاؤں گا اس کے بعد چھت پر جا کر نماز ادا کروں گا اور کچھ دیر وہاں کی کھلی اور شفاف آب و ہوا میں بیٹھ کر فضا کی وسعتوں کا نظارہ کروں گا۔ وہ یہی سب سوچتا ہوا حسن آرا کے کمرے تک پہنچا تھا۔

پھر جب دروازے کے سامنے لکتا ہوا باریک پردہ ہٹاتے ہوئے وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا بے اختیار ٹھٹھک گیا۔ اس کے بالکل سامنے ہی ایک ایسا انوکھا اور غیر متوقع منظر تھا کہ اس کے پاؤں قائلین پر جم کر رہ گئے۔ آنکھیں جھپکنا بھول گئیں اور وہ کسی پتھر کے بت کی طرح وہیں کھڑے رہ گئے۔



حجاب بی بی کے لیے زندگی ایک بھیانک خواب بن کر رہ گئی تھی۔ ایک ایسا بھیانک خواب جس کا دور دور تک انت دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نزہت بیگم جن ارادوں کا اظہار کر گئی تھی وہ حجاب کے نزدیک زندگی اور موت سے بھی بدتر تھے۔ آنے والی رات اور متوقع ذلت کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ حجاب کے نزدیک ایسی کسی صورت حال سے گزرنے کی بجائے مرجانا لاکھ درجے بہتر تھا۔ خود کشی حرام سہی مگر حجاب کے نزدیک ان لمحوں میں یہ حرام کاری اس سلوک سے تو افضل تھی جو کہ نزہت بیگم آج کی رات اس کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ خود پر ٹوٹنے والا قہر اور سبھی اذیتیں اب تک وہ برداشت کرتی آئی تھی۔ اب جو صورت حال بن گئی تھی اس نے جیسے خود بخود حجاب کو اس فیصلے پر آمادہ کر لیا تھا کہ یہاں غنڈوں کے ہاتھوں پامال ہونے کی بجائے حرام موت مرکز جہنم کی آگ میں جل لینا زیادہ بہتر رہے گا۔ اسی خیال کے تحت اس نے پورے کمرے کا چھپی طرح جائزہ لیا کہ کوئی ایسی چیز دستیاب ہو جائے جس سے وہ خود کو ختم کر سکے مگر کمرے میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ اسے کھولنا یا توڑنا ناممکن نہیں تھا ایک روشن دان

نزہت بیگم کا لہجہ انتہائی سرد تھا مگر حجاب یوں ساکت بیٹھی رہی جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔
”پہن انہیں۔“

حجاب پر پوری طرح روشن تھا کدرات بے شک گزر چکی ہے مگر مصیبت نہیں پہلے وہ چوہدریوں جیسے خوشی جانوروں کے کھجے میں تھی تو اب گویا خون آشام بلاؤں کے زرنے میں۔

”میں نے کہا ہے انہیں پہن۔“
”میں ایسا نہیں کروں گی۔“

حجاب کا جملہ مکمل ہوتے ہی نزہت بیگم نے اسے ایک زور کی لات رسید کی اور وہ پہلو کے بل گر پڑی۔
”نہیں پہنتی تو نہ پہن رات کا ادھار ابھی چلتا کرتے ہیں۔“

نزہت بیگم نے زہر خند سے کہا پھر ہاشو سے مخاطب ہوئی۔

”ہاشو! کل تو کہہ رہا تھا کہ تو اکیلا ہی اس کی طبیعت بحال کر دے گا چل..... شروع ہو جا..... تو اس کی طبیعت بحال کر میں اور عشرت ادھر بیٹھ کر براہ راست ساری نشریات دیکھیں گے۔ آ عشرت! ادھر بیٹھ کر تماشا دیکھتے ہیں۔“ آخر میں اس نے عشرت جہاں کو مخاطب کیا اور دیوار کے ساتھ موجود دمہری پر بیٹھ گئی۔ عشرت نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ جب کہ ہاشو بھوکے نظروں سے حجاب کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔

”میں تو کل سے اشارے کا منتظر تھا بائی جی! اس کی عزت شرم کا جنازہ لٹکے گا تو یہ کوئی بات سننے ماننے کی۔ پھر ٹھنڈی خود ہی پہنے گی اور بھرا بھی کرے گی۔“ ہاشو نے قمیص اتار کر پینک پر اجماع دی۔ حجاب پہلے فرش پر ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور پھر تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہنے لگا تھا کہ زندگی کے بدترین لمحات آن پہنچے ہیں۔

عقب میں دیوار تھی سامنے کمرے کا دروازہ جو چوہٹ کھلا ہوا تھا مگر دروازے اور حجاب کے درمیان ہاشو حائل تھا۔

”چل میری نعل کی گڈی! خود ہی ادھر پینک پر آ جا ورنہ زیادہ تکلیف اٹھانا پڑے گی تجھے..... چل شاباش۔“

تھا اور وہ اتنی بلندی پر تھا کہ اول تو وہاں تک پہنچا نہیں جاسکتا تھا اور بالقرض اس تک رسائی ہو بھی جاتی تو اس میں موجود موٹی سلاخوں کا کوئی حل نہیں تھا۔ وہ پوری طرح بے بس اور لا چار تھی۔ حالات کے رحم و کرم پر تھی اور جب انسان خود کو مکمل طور پر بے بس اور مجبور پاتا ہے اسے کوئی آسرا سہارا کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا اور وہ خود کو بایوسی کی دلدل میں دھنسا ہوا محسوس کرتا ہے تو ایسے میں خود بخود سے خدا کا خیال آتا ہے حجاب بھی بے اختیار اسے پکارنے لگی کہ اور کرم بھی کیا کئی تھی!

شام کے بعد رات آئی اور وقت جیسے جیسے آگے رہ سکتا رہا حجاب کا خون خشک ہوتا رہا۔ اس کی ساتمیں پوری طرح باہر کی آوازیں کی طرف متوجہ رہیں۔ مگر صرف موسیقی کی مخلوط مدھم آوازیں تھیں جو کمرے کے اندر پہنچ رہی تھیں۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ جیسے ہی کوئی آئے گا وہ اس سے بھڑ جائے گی۔ نوچ لے گی دانٹوں سے پوٹیاں اڑھیز دے گی مرنے کی حد تک مدافعت کرے گی مگر رات لحد لحد سکڑتی رہی اور کمرے کے قریب کوئی آہٹ سنا نہیں دی کوئی اس طرف نہیں آیا وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہوتی رہی ایک بل کبھی اس کی آنکھ نہیں لگی اور آخر کار صبح ہو گئی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی کل دوپہر سے اس نے کچھ نہیں کھا یا پیتا تھا اور نہ ہی اسے ایسی کوئی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

صبح کے بعد سورج بلند ہوتا ہوا اپنے عروج پر جا پہنچا قریب قریب دوپہر کا وقت تھا جب دروازے کے باہر آہٹ بلند ہوئی حجاب اس وقت پینک سے کمرے کے فرش ہی پر بیٹھی تھی۔ اس کی تمام حیات فوراً سے پیشتر دروازے کی جانب مبذول ہو گئی۔

زنجیر ہٹنے کی آواز سنا لی دی۔ دروازہ کھلا اور نزہت بیگم کی کریمہ صورت اندر دو آئی۔ اس کے عقب میں عشرت جہاں اور بد صورت ہاشو بھی موجود تھا۔

نزہت بیگم نے ایک زرارہ کر دیکھا، کٹھنر وڈ کی جوڑی پینک پر اسی جگہ پڑی تھی جہاں کل اس نے بیٹھی تھی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی اور ٹھنڈا ٹھنڈا حجاب کے سامنے کر دیئے۔

”لے پہن۔“

ہاشو نے حجاب کے سامنے رکھے ہوئے پٹک کی طرف آنکھ کا اشارہ کر کے اوپاشا نشانہ اعداز میں کہا۔

”دیکھو! تم لوگوں کو خدا رسول کا واسطہ ہے مجھے یہاں سے جانے دو میں..... میں بھی یہ سب نہیں کر سکتی اور..... اور اگر تم لوگ نہیں مانتے تو میں موقع ملتے ہی اپنی جان دے دوں گی..... بارڈالوں کی خود کو کمر لائی زندگی نہیں گزاروں گی۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو..... جانے دو مجھے۔“

بات کرتے کرتے حجاب کی آنکھیں ابھرا گئی۔ وہ عقب میں دیوار سے جا لگی تھی دل و دماغ میں گھبراہٹ اور خوف نے ایک ہیجان برپا کر ڈالا تھا۔

اوپے کچھ نہیں ہوتا سب ٹھیک ہو جائے گا تو ادھر آ۔“

ہاشو نے آگے بڑھ کر حجاب کو بازو سے دبوچ کر اپنی طرف کھینچا تو حجاب نے اس کی کلائی میں اپنے دانت گاڑ دیئے ہاشو کے حلق سے سسکاری سی نکل گئی۔ حجاب کے بازو سے اس کی گرفت ختم ہوئی تو اس نے دوسرے ہاتھ سے حجاب کو چپا سے دبوچا اور پیچھے کر پٹک پر دھکا دے دیا۔ حجاب کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ اس نے تڑپ کر پٹک سے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا مگر ہاشو نے دوبارہ اسے بالوں سے دبوچا اور ایک زوردار پھیر اس کے منہ پر سید کر دیا۔ وہ دوبارہ پھینچی ہوئی پٹک پر الٹ گئی اگلے ہی پل وہ پھڑک کر سیدی ہوئی تو منہ پر ایک اور زوردار ضرب پڑی۔

ہاشو پر پوری طرح جنون سوار ہو گیا تھا وہ غصے میں بول رہا تھا حجاب کو گندی گالیاں دے رہا تھا۔

”بیاری کی زبان تجھے سمجھ نہیں آئی..... اب تجھے سیدھے طریقے سے سمجھاتا ہوں۔“ حجاب کی دونوں ٹانگیں اپنے گھٹنوں کے درمیان جکڑتے ہوئے ہاشو نے ایک ہاتھ سے اس کی ایک کلائی دبوچ لی اور دوسرا ہاتھ اس کے گریبان پر ڈال دیا۔ غالباً وہ جھٹکا دے کر اس کا گریبان پھاڑنا چاہتا تھا حجاب کے لیے وہ بڑے قیامت خیز لمحات تھے۔ اس نے اپنے آزاد ہاتھ سے فوراً ہاشو کی کلائی تھامی اور اپنے گریبان پر موجود اس کے ہاتھ کے انگوٹھے پر اپنے دانت جما دیئے۔ اس کے دگ وپے میں دوڑتی تمام وحشت اور ہیجان اس سے اس کے دامنوں میں سمٹ آیا تھا۔ لاکھ ضبط

کے باوجود ہاشو کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ انگوٹھے میں اترنے والی اذیت نے ایک ذرا تو اس کے حواس مختل کر کے رکھ دیئے۔ حجاب کے گریبان سے اس کی گرفت از خود ختم ہو گئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے حجاب کے چہرے پر مکر سید کرنے کی کوشش کی، ٹھیک اسی وقت حجاب نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں اپنی تمام قوت صرف کر ڈالی ہاشو کا توازن کچھ گڑبڑا یا اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر حجاب کے گھٹنوں کی اضطرابی مگر شدید حرکت نے اسے دھکا سا دیا اور وہ سنبھلنے سنبھلنے پٹک سے نیچے لڑھک گیا۔

حجاب بجلی کی سی تیزی سے تڑپ کر پٹک کی پانچٹی کی طرف ٹھٹکی آگے صرف تین چار قدم کے فاصلے پر دروازہ تھا مگر یہ گویا صدیوں کا فاصلہ تھا، لیکن صورت حال کی سنگینی نے اس کے وجود میں بھی برقی رو دوڑا دی تھی۔ اس نے پٹک ہی سے دروازے کی سمت جست لگائی تھی۔ نزہت بیگم کی ہتھکڑیاں ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی مگر الفاظ سمجھ نہیں آئے ہاشو بھی سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر نزہت بیگم اور ہاشو ایک ساتھ عقب سے اس پر بھینے ہاشو کا ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا تو اس کے حلق سے بے ساختہ ایک دہشت زدہ چیخ نکلی۔ ایک تیز چرچر..... کی آواز ابھری اور اس کی ٹھیکس کا بازو کندھے سے آستین تک اوڑھنا چلا گیا۔ نزہت بیگم اور ہاشو آپس میں الجھ کر گرے تو برق رفتاری سے آگے بڑھتی ہوئی حجاب ڈگمگا کر دروازے سے جا لگرائی لیکن نہ تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور نہ دروازی کی ٹکر سے چہرے پر کٹنے والی چوٹ کو محسوس کیا۔ اگلے ہی پل وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے دوڑی تھی۔ احساس اس وقت ہوا جب اس نے خود کو اس مختصر سے صحن سے آگے موجود طویل برآمدے میں پایا۔ تین چار دروازے تھے اور بائیں ہاتھ ایک راہداری عقب میں قریب آئی ہاشو اور نزہت بیگم کی غیر انسانی آوازیں جو بالکل اس کے سر پر بجھ آئی تھیں۔ کسی بھی لمحے ہاشو کا پیچہ اسے عقب سے دبوچ سکتا تھا۔ حجاب کے پاؤں اسے راہداری کی طرف بھگالے گئے۔ اس کی دہشت زدہ چیخیں اور نزہت بیگم دہاشو کی آوازیں پورے گھر میں گونج اٹھیں۔

حجاب نے دوڑتے ہوئے دیکھا کہ راہداری کے سامنے کی سمت سے ٹکفٹہ بانو اور ایک پستہ قامت شخص نمودار ہوا جسے وہ پہلے بھی ایک دوبارہ دیکھ چکی تھی۔ وہ دونوں اسی سمت آرہے تھے اور عقب سے ہاشواور نزہت بیگم دوڑتے آرہے تھے۔

”اے ٹکفٹہ! چھو پڑنا ڈرا اس کتیا کو۔“

نزہت بیگم کی تیز پکار اس کی سماعت سے لگرائی۔ ٹکفٹہ اور وہ اچھوٹا سا لڑکا انسان فوراً چوکس ہوتے دکھائی دیئے۔ حجاب اس صورت حال پر کچھ مزید حواس باختہ ہوگئی واحد یہی ایک راستہ اس کے سامنے تھا اور یہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ انیس تیس قدم کی اس راہداری کو وہ آدھے سے زیادہ طے کر آئی تھی کہ اچانک راہداری میں بائیں ہاتھ موجود ایک کمرے کے دروازے سے ایک گھبراہٹی ہوئی سی عورت نکل کر اچانک اس کے سامنے آگئی۔

گھبراہٹی ہوئی سی یہ صورت بھی اس کی نظر آشنا تھی۔ کل جس وقت اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اس وقت یہ عورت برآمدے میں کھڑی دکھائی دی تھی اور غالباً اسی نے مرشد نامی غنڈے سے ہاشو کی جان چھڑائی تھی۔ حجاب کو اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا وہ بے اختیار اس عورت کے عقب میں سٹ گئی۔

”خالدہ جی! مجھے بھلیاں آ..... آپ کو آپ کے رب کا واسطہ رسول کا واسطہ مجھے بچالیں۔“

”کک..... کیا بات ہے؟“

”ہائی جی..... ہٹ جاؤ۔“

”اندر جا حسن آرا پکڑ لے ہاشو اس حرام کی جی کو۔“

ہاشواور نزہت بیگم ہر پہنچ چکے تھے۔

”خدا کے لیے مجھے بچالیں..... یا اللہ۔“

حجاب کی حالت اور دلدرد آہ و بکا پر حسن آرا کا دل مل کر رہ گیا۔

”رک جاؤ ہاشو۔“

حسن آرا نے حجاب کی طرف بڑھتا ہوا ہاشو کا ہاتھ درمیان ہی میں تھام لیا۔ حجاب بے اختیار دو قدم مزید پیچھے ہٹ کر کمرے کے اندر سرک گئی۔ دروازے کے بالکل سامنے حسن آرا موجود تھی۔

”ہائی جی! تم ایک طرف ہو جاؤ۔“

”میں نے کہا رک جاؤ۔“

ہاشو نے پیش قدمی کی کوشش کی تو حسن آرا کچھ مزید دروازے کے سامنے جم کر کھڑی ہوگئی۔

”خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو!“

”ہائی جی!“

”حسن آرا تو ہٹ جا سامنے ہے ہاشو! چلیا سے کھینچ کر لا اس..... (نا قابل اشاعت) کو“ نزہت بیگم نے قریب پہنچتے ہی حسن آرا کو بازو سے پکڑ کر دروازے کے سامنے سے ایک طرف ہٹانا چاہا تو حسن آرا نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔

”پیچھے ہٹو ہاشو۔“ اس نے ہاشو کے برہنہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیچھے کی طرف دھکیلا تو وہ متذبذب سے انداز میں نزہت بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے زخمی انگوٹھے سے خون رس رہا تھا اور چہرے پر غصہ و غضب رکھا تھا۔

”حسن آرا! میں کہہ رہی ہوں تو ایک طرف ہو جا۔“

نزہت بیگم نے دوبارہ حسن آرا کا بازو تھامنا چاہا مگر حسن آرا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”رک جاؤ اماں! بات کیا ہے کیوں اس لڑکی پر ظلم ڈھاری ہو تم۔“

حسن آرا کے لہجے میں سخت ناگواری تھی۔ پہلے حجاب کی حالت زار اور اب ہاشو کو دیکھتے ہوئے پوری صورت حال خود بخود اس پر واضح ہو چکی تھی۔

حجاب نے اضطرابی انداز میں اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ واحد یہی ایک دروازہ تھا جس کے سامنے یہ بیمار صورت کمزور سی عورت کھڑی آنے والی خون آشام بدردحوں کو باہر ہی روکے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس عورت اور حجاب کے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ تھا اور درمیان میں ایک باریک سفید ریشمی پردہ۔ کسی بھی لمحے ہاشو اور نزہت بیگم اس عورت کو ایک طرف دھکیل کر اندر آسکتے تھے۔ حجاب کا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا ہو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وجود پر لرزہ سا طاری تھا پاؤں ننگے تھے اور وہ ٹھیس کے سمنے ہوئے بازو کو سمیٹ لپیٹ کر اپنے برہنہ بازو کو ڈھانپنے کی ناکام لاشعوری کوشش

کر رہی تھی۔

”تجھے اس سے کیا؟ تو اندر جا کے آرام کر، ہٹ سامنے سے۔“

”میں نہیں ہوں گی، تم مجھ سے بات کر، پہلے مجھے بتاؤ سمجھاؤ کیا ہے یہ سب، کیوں ایسا کر رہی ہو تم۔“

”دیکھ حسن آرتو اپنی گزار اپنی بھوک ہمارے معاملات کے بیچ مت آ، میں کیا کر رہی ہوں، کیوں کر رہی ہوں، اس کے لیے میں تجھے جواب دہ نہیں ہوں، نہ تو ایسی جواب طلبی کا حق رکھتی ہی اس حرف زد کو باہر نکال اور جا کر اپنے بستر پر آرام کر، نکال اس کو۔۔۔۔۔۔ ہٹ۔“

پھر وہ ہاشو کی طرف متوجہ ہوئی۔

”منٹوس صورت، تو یوں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ اندر سے کھینچ کر نکال لا اس اتھری ٹھوڑی کو۔“

”خالد تو اس کی حمایتی کیوں بن رہی ہے تو ایک طرف ہو جا۔“

شگفتہ نے آتے ہی اس کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ دوسرے بازو سے فوراً زہرت بیگم نے اسے تھام لیا اور ہاشو چھپاک سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

”ہمیں۔۔۔۔۔۔ خدا کے لیے نہیں۔۔۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔۔۔۔۔۔ جانے دو مجھے۔“

ہاشو کے اندر آتے ہی حجاب بری طرح گھٹکیانی تھی۔ حسن آرانے خود کو چھڑا جاتا تو عشرت جہاں آکر اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گئی۔

”شگفتہ! چھوڑ مجھے۔“

”پاگل مت بن حسن آرا! تو اس معاملے سے الگ رہ۔“

زہرت بیگم نے دانت پیسے تھے۔

ہاشو کے اندر آتے ہی حجاب ٹوٹ کر کئی قدم پیچھے ہٹتی چلی گئی، مگر ہاشو نے لپک کر اسے بالوں سے دیوچ لیا۔

”خدا کے لیے کوئی تو میری مدد کرے۔“ حجاب مطلق کے بل چیخ اٹھی اس کی دل خراش چیخ پر حسن آرا کو اپنا دل کٹا ہوا محسوس ہوا اس کے دیک زوہ اعصاب اور کمزور دل کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اس نے ایک زور کے جھٹکے سے اپنے بازو چھڑائے اور عشرت جہاں کو دھکیلیے

ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو آئی۔ وہ تینوں اسے پکڑتی

پکارتی رہیں، مگر حسن آرانے فوراً آگے بڑھ کر ہاشو کی کمرے پر دو ہتھڑے سید کیے۔

”چھوڑ دے اسے ہاشو! میں کہتی ہوں چھوڑ اسے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ ہاشو حجاب کو بالوں سے پکڑے دروازے کی طرف گھٹینا چاہ رہا تھا حسن آرانے جھپٹ کر اسے بالوں سے دیوچ لیا۔ ہاشو کی گرفت حجاب کے بالوں سے ختم ہوئی

تو زہرت بیگم اور شگفتہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ حسن آرانے فوراً سے پیشتر ایک قدم آگے بڑھا کر شگفتہ کے منہ پر ٹھانچہ سید

کیا اور زہرت بیگم کو دھکا دے کر حجاب سے دور کر دیا۔ فوراً ہی وہ بازو پھیلا کر حجاب کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی۔

”بس۔۔۔۔۔۔ بہت ہو گیا، اب کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھا تو میں کسی کالی خانہ میں کر دوں گی منہ بوجھ لوں گی میں۔“

حسن آرا کے چہرے اور لب و لہجے میں ایسی تپش تھی جو ایک دفعہ تو ان چاروں کو ٹھنکا گئی۔ حسن آرا کا یہ روپ، یہ تیور ان بھی کے لیے بالکل نئے تھے۔ ان میں سے کسی کو کبھی اس سے اس درجہ سخت اور شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ تینوں

کینہ تو زنگیوں سے حسن آرا کو گھور رہے تھے ان کا بس چلتا تو حسن آرا کو بھی دھکا کر رکھ دیتے مگر ایک مشترکہ خیال ان تینوں کے لیے جیسے نا دیدہ زنجیر بن گیا تھا اور وہ تھا مرشد کا خیال۔

”حسن آرا! تو پاگل ہو گئی ہے کیا۔“ زہرت بیگم نے جھلاہٹ سے کہا۔

”پاگل تو تم لوگ ہو چکے ہو اماں! کیا گاڑا ہے اس لڑکی نے تمہارا کس بات کی دشمنی نکال رہے ہو تم سب؟“

”اس کلمو ہی نے کس کا کیا گاڑا ہے یہ تو نہیں جانتی بہتر یہی ہوگا کہ تو درمیان سے ہٹ جا۔۔۔۔۔۔ نہ اپنے لیے مصیبت کھڑی کر اور نہ ہمارے لیے۔“

”اماں! تو اس چھو کر کے بدلے اس حسو کی بات طے کر لے آگے اور اسی کو روانہ کر دے سب کی جان چھوٹ جائے گی۔“

شگفتہ نے زہرناک لہجے میں کہا تو عشرت جہاں نے فوراً اسے جھڑک دیا۔

”تو اپنا منہ بند رکھ کوئی ضرورت نہیں تجھے درمیان میں بولنے کی۔“

شگفتہ نے ایک نظر ناگوار عشرت جہاں پر ڈالی اور غصے

سے پاؤں پختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اچھو دروازے میں کھڑا اپنی موٹی موٹی آنکھیں پٹپٹا پٹپٹا کر سب کچھ دیکھ کر رہا تھا۔

حجاب کسی کیم سن پچی کی طرح حسن آرا کے عقب میں سبھی سبھی کھڑی تھی۔

”یہ دشمن داری کا شکار لڑکی ہے حسن آرا! اور اس کے دشمن بہت با اثر بہت با اختیار لوگ ہیں۔ وہ اتنے طاقت ور اتنے اتنا پرست اور خاتم لوگ ہیں کہ اگر ہماری طرف سے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تو وہ دن و نائے ہم سب کو زندہ جلا جائیں گے۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا خود پر نہیں تو کم از کم ہم سب پر ترس کھا۔“

نزہت بیگم نے لہجے میں نرمی پیدا کر لی تھی۔

”تم نے ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی معاملہ طے ہی کیوں کیا تھا۔“

”تو کیسے لوگوں سے معاملات کروں میں؟ یہ کوئی دربار مزار یا مدرسہ نہیں ہے کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو؟“

جو بھی ہو..... میں یہ سب نہیں دیکھ سکتی..... میرے دل و دماغ میں اتنی تاب نہیں ہے۔“

”تو پھر تو کسی جگہ ایسے ماحول میں رہ کیوں رہی ہے؟ کیوں مرشد کی بات مان کر کسی پرسکون اور پرسن جگہ پر نہیں چلی جاتی؟“

”میری مٹی جو یہیں کی ہے۔“

حسن آرا کے لہجے میں یکا یک آزر و گی حمل آئی۔

”یہیں پیدا ہوئی ہوں..... یہیں مردوں کی۔“

”تو نہیں مرے گی حسن آرا! تو ہم سب کو مردائے گی اپنے ساتھ ساتھ تو ہمارے ساتھ بھی دشمنی کر رہی ہے۔“

”دیکھ حسن آرا! تو اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جیتی آئی ہے تجھے اماں یا کسی نے بھی کبھی کسی بات پر مجبور نہیں کیا کسی نے تیری زندگی میں مداخلت نہیں کی پھر تو کیوں دوسروں کے معاملات میں دخل دے رہی ہے۔ کیوں دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہے؟“

عشرت جہاں نے بھی نرمی اختیار کر لی تھی۔

”میں کسی کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کر رہی، بس میرے لیے یہ شور شرابا یہ ظلم مار پیٹ قابل برداشت نہیں میں یہ سب نہیں دیکھ سکتی۔“

”ہم بھی یہ سب نہیں چاہتے، مگر یہ لڑکی ہماری مجبوری اور اپنی قسمت اپنی مصیبت کو ماننے، سمجھنے کو تیار ہی نہیں تو پھر اور کیا طریقہ اختیار کریں ہم۔“

”بالکل..... تو خود اس سے پوچھو کہ دیکھ لے ہم سب نے باری باری کتنا سمجھایا ہے اسے کہ نہ تیرے پاس اور کوئی راستہ ہے نہ ہمارے پاس کوئی چارہ لیکن اول لڑکی ڈھیت اور ضدی ہے اس حقیقت کو قبول کرنا چاہتی ہی نہیں یہ۔“

نزہت بیگم نے لہجے میں کچھ مزید نرمی سمولی۔

”اسے سوچنے سمجھنے کا وقت تو دو اماں! زبردستی تو کوئی طریقہ نہیں ہے کچھ بھی سمجھانے کا۔“ حسن آرا کی بات پر نزہت بیگم اندر ہی اندر دانت تین کر رہ گئی۔ اس نے یوں حسن آرا کی طرف دیکھا جیسے اس کی عقل پر ماتم کرنے کا سوچ رہی ہو۔

”جاؤ ہاشو تم.....“ حسن آرا کی بات پر ہاشو نے فوراً نزہت بیگم کی طرف دیکھا۔

”حسن آرا.....“

”تم بھی جاؤ اماں!“ حسن آرا نے نزہت بیگم کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”یہ فی الوقت یہیں میرے پاس رہے گی میں اس کی ذمہ داری قبول کرتی ہوں ابھی تم لوگ جاؤ میں کچھ دیر میں آتی ہوں پھر بات کرتے ہیں اس موضوع پر۔“

عشرت جہاں ہاشو اور نزہت بیگم نے باری باری ایک دوسرے کی صورت دیکھی پھر نزہت بیگم کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ کر عشرت جہاں اور ہاشو وہاں سے چلے گئے اچھو بھی ان کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

”چل پھر میرے ساتھ ہی چل تو دروازہ باہر سے بند کر دیتے ہیں۔“

”نہیں ابھی کچھ دیر میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ سر میں شدید درد شروع ہو چکا ہے میرے..... تم بے فکر ہو کر جاؤ یہ یہیں ہے میرے پاس۔“

نزہت بیگم چند لمحوں کھڑی رہی پھر جاتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے میں جا کر انتظار کرتی ہوں۔“

وہ بھی کمرے سے نکل گئی تو حسن آرا حجاب کی طرف متوجہ ہوئی جو اس کے عقب میں کھڑی سسک رہی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ کے گوشے سے خون رس رہا تھا۔ دائیں

آنکھ کی بڑی پر ہلکا نیلگوں ہلائی نشان بنا ہوا تھا اور اس سے نیچے اس کی خوبصورت اور نازک سے گال پر انگلیوں کے نشان چھپے ہوئے تھے۔ حسن آرانے ہاتھ بڑھا کر حجاب کا سر اپنے کندھے پر رکھا تو حجاب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے روز کی مسلسل عذاب ناسی کے بعد حسن آرا کی صورت ایک مہربان اور ہمدرد کے ہونے کا احساس یکایک ہی اس کے اندر جیسے ایک سیلاب لے آیا تھا۔ وہ حسن آرا کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”خاندانہ..... مجھ پر..... رحم کریں..... مو..... مجھے بچالیں یہ..... یہ لوگ..... اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

حسن آرا آہستہ آہستہ اس کی کمر تھپک تھپک کر اسے حوصلہ اور دلدادہ دیتے ہوئے اپنے پلنگ تک لے آئی۔

”بیٹو یہاں..... بالکل بے فکر ہو جاؤ میں ہوں نا۔“

حجاب کو پلنگ پر بٹھا کر اس نے ایک طرف الماری سے اپنا ایک شلوار سوٹ نکالا اور حجاب کو تھما دیا۔

”اس پردے کے پیچھے غسل خانے کا دروازہ ہے تم کپڑے بدل لو میں اتنے میں نماز پڑھ لوں۔ پھر آرام سکون سے بیٹھتے ہیں۔ پریشان ہونے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ سمجھ گئیں؟“

حجاب بس آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی پھر اس نے کمرے کے کونے میں چھت یا فرش تک لٹکتے اس پھورے رنگ کے بھاری پردے کی طرف دیکھا اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر اس طرف بڑھ گئی۔ دروازے کی طرف ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرہ تھا اور اس کے سامنے کی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ حجاب وہ دروازہ کھول کر غسل خانے میں داخل ہو گئی۔

حسن آرا نامی یہ عورت فی الوقت تو اس کے لیے خدا کی طرف سے غیبی مدد بن کر ظاہر ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی بخونی اعزازہ ہو گیا تھا کہ کم از کم یہاں کے لوگوں پر وہ اثر و رسوخ بھی رکھتی ہے۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ خبیث عورتیں حتیٰ کہ وہ جنگلی سور نما انسان ہاشو بھی اس کے سامنے جبکہ کا شکار رہا تھا اور زہمت بیگم بھی اس کے ساتھ محتاط سے لب و لہجہ کے ساتھ بات کرتی رہی تھی۔ اب ایسا کیوں تھا؟ اس حسن

آرا کی یہاں کیا حیثیت؟ کیا مرتبہ تھا؟ اس کا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

حجاب کو یہ عورت دلے بھی یہاں موجود باقی عورتوں سے خاصی مختلف سی دکھائی دی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ خراٹ پٹا، وہ مکروہ تاثر نہیں تھا جو یہاں کی باقی عورتوں کے چہرے پر اسے دکھائی دیتا رہا تھا۔

اطمینان کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں تھا، پھر بھی غسل اس نے پوری تسلی سے کیا اور پھر جب کپڑے تبدیل کر کے واپس کمرے میں پہنچی تو حسن آرا پلنگ پر بیٹھی دکھائی دی۔ پلنگ کے سر پائے ہی مصلّا دھر دکھائی دے رہا تھا۔ غائبانہ نماز پڑھ چکی تھی۔

”آؤ..... آؤ ادھر آ جاؤ۔“ حسن آرا نے فوراً اسے پکارا تھا۔

”میں بھی نماز پڑھ لوں.....؟“

حجاب نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا، یوں جیسے کسی جرم کی اجازت مانگ رہی ہو۔

”کیوں نہیں ضروریہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ حسن آرا نے خوش گوار لہجے میں کہا اور فوراً سر ہانے سے مصلّا اٹھا کر حجاب کی طرف بڑھا دیا۔

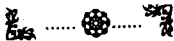
”قبلہ اس طرف ہے۔“

حسن آرا نے اسے سمت سے آگاہ کیا۔ اور وہ مصلّا بچھا کر کھڑی ہو گئی، آج کئی روز بعد اسے نماز پڑھنا نصیب ہو رہا تھا۔ اتنے روز کے وقفے سے پہلے کی آخری نماز اس نے عشاء کی پڑھی تھی۔ اسے گھر اپنے بڑے میں اور اتنے دنوں کے بعد آج عصر کی نماز وہ ایک کوٹھے پر ادا کرنے کھڑی ہوئی تھی، حسن آرا کے کمرے میں۔

مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ نماز اور دعا کے بعد دل کو قدر سے شغف اور اطمینان کا احساس ہوا، اس نے مصلّا واپس حسن آرا کے حوالے کیا اور اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟“ حسن آرا نے مشفق لہجے میں سوال کیا اور ساتھ ہی بی بی نے حجاب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”جی! حجاب۔“



مغرب کا وقت ہونے کو تھا..... نزہت بیگم کے کمرے میں اس کی دونوں بیٹیاں عشرت جہاں اور سندس جہاں کے علاوہ حسن آرا بھی موجود تھیں۔ گزشتہ آدھ پون گھنٹے سے ان کے درمیان بات چیت جاری تھی، موضوع حجاب کی ذات تھی۔

حسن آرا حجاب کی زبانی اس کی ساری چٹا تفصیل سے سن چکی تھی۔ یہ جان کر کہ وہ ایک نجیب الطرفین سید گھرانے سے تعلق رکھتی ہے حسن آرا کی تو روح ہی فنا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک طویل مدت سے اپنے دل میں سادات کی بے انتہا عزت و تکریم رکھتی تھی۔ سادات سے اسے غیر معمولی حد تک عقیدت سی تھی اور اس غیر معمولی عقیدت کی وجہ وہ غیر معمولی ہستی تھی جو اس کی زندگی کا محور و مرکز تھی۔ برسوں بیت چکنے کے باوجود آج بھی جو اس کے جسم و جاں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جسے ایک لحظے کے لیے بھی وہ بھی فراموش نہیں کر پائی تھی اور آج بھی وہ ہستی حسن آرا کی پہلی اور آخری ترجیح تھی۔

”حسن آرا! جو تو کہہ رہی ہے وہ کبھی نہیں ہوگا، کسی صورت نہیں ہوگا۔“ نزہت بیگم بول رہی تھی۔

”میری عمر گزر چکی میری ماں اور نانی بھی یہیں بھسم ہوئی مگر میں یہاں ختم نہیں ہونا چاہتی، مجھے جیتے جی یہاں سے جانا ہے، اپنا بڑا ہا پارولنا نہیں چاہتی میں اور اس کی واحد صورت یہی ایک ہے..... یہ لڑکی..... حالات اور قسمت کا پھیر ہے سب یہ لڑکی ذمہ دار نہیں تو ہم بھی کب ذمہ دار ہیں وہ اپنی جگہ مجبور ہے تو ہم بھی اپنی جگہ مجبور دلا چاہیں۔“

”اماں ٹھیک کہہ رہی ہے جسٹ! یہ بازار اور یہاں کا دھندا زوال پذیر ہے، ایک موقع مل رہا ہے تو ہمیں یہ ضائع نہیں کرنا چاہیے، جاگیر دار نے زبان دی ہے تو وہ ضرور پوری کرے گا، بہتر ہے کہ ہم سب عقل مندی سے کام لیں تو ذرا سوچ تو سہی تین کنال کی عالی شان کوٹھی..... ایسے موقعے روز روز تھوڑے ہی ملتے ہیں بھلا۔“ یہ سندس جہاں تھی۔

”میں نے کہا تو ہے کہ میں خود اسے سمجھاؤں گی۔“ حسن آرا کا لہجہ تھکا ہوا اور کمزور تھا۔

”اتنا وقت نہیں ہے حسن آرا وہ سمجھائے سے سمجھنے والی چیز بھی نہیں ہے میں مغز مار کے دیکھ چکی ہوں وہ لاتوں کی

بھوت ہے باتوں سے نہیں سمجھے گی۔“

”میں باتوں ہی سے سمجھا لوں گی تم دیکھ لینا، صرف دو دن صبر کرلو۔“

”تو کیوں بے وجہ سروردی پیدا کر رہی ہے، کیوں بحث کیے جا رہی ہے تیری کوئی سگے والی تو وہ ہے نہیں جو تجھے اتنی تکلیف ہو رہی ہے اپنے معاملے میں تو نے من مانی کر لی، ایک نکلے کا فائدہ نہیں دے سکی اب مزید تو جینا حرام مت کر ہمارا۔“ بے زاری اور سختی تو جیسے نزہت بیگم کے حلق تک بھرا آئی تھی۔

”بات بات پر طعنے مت دیا کرو اماں! کوئی ایک آدھ بار نہیں بیسیوں بار میں نے محفل میں رقص کیا ہے تمہارے لیے یہ کیا کرتی تھی اور کتنے سال گاتی رہی ہوں، کس کے لیے؟ تمہارے لیے تمہاری ضرورت اور خوشی کے لیے اب اگر میرا سانس ہی میرا ساتھ نہیں دیتا تو میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔“

”ہاں! دس بیس محفلیں کر کے بڑا تیر مارا ہے تو نے پتا نہیں وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جب اس نحوست زدہ میرا رشد.....“

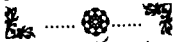
”اماں.....“ حسن آرا ایک بہ یک اس زور سے چیخی کہ نزہت بیگم اپنی بات درمیان میں ہی بھول گئی، حسن آرا کے چہرے پر رشد یدرخ اور آنکھوں میں غصے کی آگ روشن تھی، اس کے بعد وہ ہاں رکی نہیں اٹھی اور تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔ نزہت بیگم عشرت اور سندس حسن آرا دو رمشہد سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالینے کے متعلق صلاح مشورہ کرنے لگیں اور حسن آرا جتنی طرف صحن میں نکل آئی، اس کے دل میں بیسیوں سی انٹنے لگی تھیں، نزہت بیگم کا جملہ ادھورہ رہ گیا تھا مگر حسن آرا جانتی تھی کہ نزہت بیگم کیا کہنے والی تھی وہ ادھورا جملہ بھی اس کے دل میں کسی تیز دھار خنجر کی طرح اتر کر رہ گیا تھا۔ دل و دماغ تو پہلے ہی بری طرح الجھے ہوئے تھے، حجاب پر گزر چکنے والے ظلم اور اس کو آگے پیش کرنے والے حالات کے تصور نے حسن آرا کو بری طرح فکر پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں، نماز کا وقت بھی گزرتا جا رہا تھا مگر حسن آرا کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں واپس جائے وہ مظلوم و معصوم لڑکی تو پہلے ہی

فرعونیت کے پیش نظر بھی حسن آرا کی سمجھ میں۔ یہی آ رہا تھا کہ جو سنگین صورت حال وہاں پیدا ہو گئی تھی وہ یقیناً خرابی کا باعث بنی ہوگی اور عین ممکن تھا کہ جاگیرداروں نے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑا ہو۔

وہ بھلتی رہی اور اس کا دماغ جمع نفی میں مصروف رہا۔ اگر وہاں کوئی زندہ باقی ہے بھی تو حجاب وہاں پہنچ کر بھی غیر محفوظ ہی رہے گی..... جاگیرداروں کی دسترس میں انہی کی سلطنت میں انہی کے رحم و کرم پر..... اور اگر اسے کہیں اور پہنچایا جائے تو کہاں..... کیسے؟ اور بالفرض اسے کسی طرح یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا بھی دیا جائے تو؟ اس کے بعد.....؟ ایسے میں جاگیرداروں کی اندمی انا ان کے انتقام کا رخ کس کی طرف ہوگا یہ بھی واضح اور روشن تھا۔ ایسے میں مرشد اور جاگیرداروں کا ٹکراؤ لازمی تھا اور حسن آرا اچھی طرح جانتی تھی کہ مرشد لڑ کر مر جانا تو پسند کر لے گا مگر اپنی باجی امی کی توہین یا فرعونوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنا کبھی بھی اور کسی بھی صورت گوارا نہیں کرے گا۔

شدید ابھرنے کے باعث حسن آرا اپنی پیشانی مسلتی ہوئی صحن کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر فرش ہی پر بیٹھ گئی۔ کچھ بچائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہنی کشش کسی کنارے نہیں لگ رہی تھی۔ کیا کیا جانا چاہیے اور کیا نہیں..... اس حوالے سے وہ فی الوقت کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔



چار قدم کے فاصلے پر بالکل سامنے ہی قالین پر مصلا بچھا ہوا تھا مگر توبخ کے برخلاف مصلے پر اماں نہیں کوئی اور ہی بیٹھا تھا ایک لڑکی..... اس کا بایاں رخ ہی سہی مگر وہ پوری طرح نظر نا آشنا تھا اور..... اور وہ نماز پڑھ رہی تھی۔

مرشد نے ایک عجیب خوشگوار حیرت کو محسوس کیا وہ متعجب سا دروازے کے بیچ میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے وجود پر موجود جامنی رنگ کے اس سنوت کو مرشد کی آنکھوں نے فوراً پہچان لیا جامنی دوپٹے کے ہالے میں جھلک دکھلاتا وہ آدھا چہرہ تو جیسے آدھے سج کی صورت کرے میں روشن تھا۔ ایک سنجیدہ سی سادگی جیسے اس چہرے کے خال و خد ہی کا حصہ تھی۔ آنکھ کے قریب ایک نیلگوں نشان تھا اور نیچے ہونٹ پر بھی ہلکا سا درم موجود تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سر جھکائے تقدے کی حالت میں

بری طرح ڈری سہی ہوئی تھی اور حسن آرا اسے مسلسل حوصلے دلا سے دیتی رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ واپس کمرے میں اس کے سامنے جائے تو بالکل مطمئن اور پرسکون ہڈو وہ ہیں صحن میں آہستہ قدموں سے ٹپکنے لگی۔

اس نے کہنے کو تو زہت بیگم سے کہہ دیا تھا کہ دو دن صبر کرو میں اس لڑکی کو سمجھا لوں گی، یعنی اسے طواغیت قبول کر لینے پر آمادہ کر لوں گی مگر وہ حقیقت اس کے دل و دماغ میں ایسا کوئی خیال تک نہیں تھا۔ وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا اس بات سے متعجب صرف اتنا تھا کہ دو دن کی مہلت مل جائے وہ ایک طرح سے اس نے حاصل کر بھی لی تھی، لیکن اب اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس دوران کیا کرے؟ دو دن تو یونہی گزر جائیں گے اس کے بعد؟

ایک بار تو اس نے سوچا تھا کہ مرشد کے ذریعے حجاب کو اس کے گھر اس کے درمیان تک پہنچا دے مگر فرمایا اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک پھینکا۔ حجاب نے بتایا تھا کہ وہ نندی پور گاؤں کی رہنے والی ہے اور اس پر اس کے گھرانے پر قہر ڈھانے والے اور اسے اس کو غصے پر لا پھینکنے والے وہاں کے جاگیردار ہیں..... چوہدری فرزند علی اور اس کا باپ جاگیردار اکبر علی خان حجاب کے منہ سے نندی پور کے جاگیردار گھرانے کا ذکر سننے ہی حسن آرا بری طرح چونک پڑی تھی اور اسی وقت سے اسے گہری فکر مند ی اور پریشانی نے آ لیا تھا۔

جاگیردار اکبر علی سے وہ بہت اچھی طرح آشنا تھی اور یہ آشنائی بہت پرانی تھی۔ اس خاندان کی قوت و اختیار اور کمینہ حسلی کو وہ خوب جانتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ لوگ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں اور کچھ بھی کر گزرنے کی طاقت رکھتے ہیں، مرشد کو ایسے زہریلے اور با اختیار لوگوں کے مقابل تو کیا لانا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے ویسے ہی اس معاملے سے بالکل بے خبر کرے گی اور اس مسئلے کا کوئی دوسرا حل کوئی دوسرا ذریعہ نکالے گی..... پھر ساتھ ہی یہ سمجھن بھی تھی کہ حجاب کے اغوا کے بعد وہاں..... نندی پور بس نجانے کیا ہوا..... جتنا حجاب کی زبانی اسے معلوم و اتھا اور جو حالات حجاب کو درپیش تھے ان سے تو یہی اندازہ دتا تھا کہ اس کے بھائیوں اور باپ کو جاگیرداروں کے ماننے بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی ہوگی جاگیرداروں کی

بیٹھی تھی۔

اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بھویں اچکا کر کھر دے سے انداز میں سوال کیا۔

”جی میں..... وہ..... خال.....“

وہ صرف ہٹکا کر رہ گئی۔ مرشد کو اندازہ ہو گیا کہ لڑکی کا حلق خشک ہے اور وہ اس سے خوف زدہ بھی ہے۔ مگر کیوں؟ مرشد کے لیے تو وہ قطعی اجنبی تھی وہ تو اسے دیکھ ہی پہلی بار ہاتھ پھر بھلا وہ اس سے کیوں اتنی دہشت زدہ تھی؟ نجانے کیوں یکا یک ہی مرشد کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لڑکی اپنی جگہ ڈری ہوئی ہرنی کی طرح کھڑی سراسیمہ نظروں سے مرشد نامی اس غنڈے کو دیکھ رہی تھی جو نجانے کس نیت سے کمرے میں کھس آیا تھا۔

مرشد چند لمحے کھڑا سے گھورتا رہا پھر دو قدم مزید آگے بڑھا تو لڑکی بے اختیار چیخے ہٹ کر دیوار سے جا ملی۔

”خال.....“

اس کے حلق سے اچانک نکلنے والی چیخ نما پکار پر مرشد نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ مزید دہشت زدہ دکھائی دینے لگی تھی۔ مرشد نے ہٹکتے ہوئے قالین پر بچھا مصلّا اٹھایا اور لڑکی کو گھورتا ہوا خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ برآمدے کی طرف تھا جس کے کونے میں چھت پر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ یہ لڑکی کون تھی اور یہاں کیا کر رہی تھی؟ یہ بات کچھ دیر بعد یا جمع معلوم ہوئی جانی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور سیدھا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ زینے طے کرتا ہوا وہ چھت پر پہنچا اور اپنی مخصوص جگہ پر مصلّا بچھا کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا..... اسی مصلے پر کچھ دیر پہلے وہ روشن چہرے والی لڑکی بیٹھی تھی..... وہ جس کی آنکھ کے قریب رخسار کی ہڈی پر نیکیوں نشان تھا اور سرخ انگور جیسے ہونٹ کا ایک گوشہ درم زدہ تھا۔

مرشد نے پھر اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور اپنا دھیان نماز کی طرف لگایا۔ رکوع کے بعد وہ جگہ سے اٹھ گیا تو دو شفاف چمک دار سراسیمہ آنکھیں اس کے دماغ میں روشن ہو گئیں۔

مرشد نے خاصی کوشش کی مگر وہ ڈھنگ سے نماز ادا نہیں کر پایا، دھیان بار بار ہٹتا رہا..... وہ چہرہ..... وہ آنکھیں بار بار اس کے پردہ تصور پر چمکتی رہیں۔ نماز کے بعد وہ عادت کے مطابق وہیں بیٹھا رہا مگر نجانے کیوں اس

مرشد نے آج سے پہلے تک یہاں صرف اپنی باجی امی ہی کو نماز پڑھتے دیکھا تھا یا پھر وہ خود تھا۔ باقی سب تو یونہی تھے..... گیارہویں شریف داتا صاحب کا عرس اور محرموں کی رسم بھانے والے..... مگر آج یہاں اس کے سامنے ایک تیسری اجنبی شخصیت اپنے اطراف سے بالکل غافل خدا کے حضور سر جھکائے بیٹھی تھی۔

پھر اس لڑکی نے آہستہ سے سلام پھیرا اور کچھ دیر تک ویسے ہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ سر کچھ مزید جھک گیا تھا۔ پھر ایک آہ نما سانس لیتے ہوئے اس نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھولتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ بھی شاید اسے دروازے میں کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس ہوا..... اس نے چونک کر گردن موڑی اور مرشد کو یک ٹک اپنی طرف گھورتے پا کر بری طرح گھبراہٹ کا شکار ہو گئی مرشد نے دیکھا کہ ایک ہی لمحے میں اس لڑکی کے چہرے آواز کھوں میں کتنے ہی رنگ گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ سراسیمگی، اندیشے، گھبراہٹ، پریشانی، وہ گڑبڑا کر ٹہکی اور اضطرابی انداز میں چند قدم پرے ہٹ گئی۔ وہ اس غنڈے بد معاش کو فوراً پہچان گئی تھی۔

مرشد سرتاپا بخور اس لڑکی کا جہانزہ لیتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا یا لڑکی اچھی صحت اور اچھے قد کاٹھ کی مالک تھی وجود انتہائی موزوں اور متناسب، چھوٹے چھوٹے سے نرم و نازک ہاتھ، بڑے کشادہ پیشانی، شفاف اور چمک دار آنکھیں، جن میں اس وقت خوف اور وحشت چمک رہی تھی۔ چہرے کی بناوٹ انتہائی دلکش اور صاف گور اپنا رنگ۔

اس پہلی بھر پور نظر میں ہی مرشد کو اندازہ ہو گیا کہ یہ روح تو کسی اور ہی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لڑکی کے چہرے اس کی آنکھوں..... اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مرشد کے اندر کہیں گہرائی میں ایک عجیب سمجھ میں نہ آ سکنے والی پہل سی عبادی۔ ایک جھنجھلاہٹ سی بھی جو برق رفتاری سے اس کے اندر بیدار ہوئی تھی مرشد کو پہلے تو کچھ الجھن ہوئی اور پھر ایک عجیب سی گھبراہٹ اس کے دل میں دھڑکی۔

”کون ہے تو؟“

لڑکی کا خیال وہ ذہن سے نہیں نکال پایا، آخر وہ جھنجھلا کر اٹھا اور مصلا تہ کر کے نیچا تر آیا۔

اس نے سوچا تھا کہ جا کے براہ راست اس لڑکی سے پوچھ لے کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں ہے؟ مگر نیچے برآمدے میں ہی اس کا سامنا اچھوسے ہو گیا، اچھو کے ہاتھ میں کاغذ میں لپیٹے ہوئے پان کے پتے دکھائی دے رہے تھے۔

”ادھوڑے کی شکل والے خچر!“

مرشد اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ ”اماں کے کمرے میں یہ پتلا کون ہے؟“

”وہ..... وہ ہے ایک لڑکی۔“

اچھو نجانے کیوں مرشد کے اس سوال پر پریشان سا ہو گیا۔

”ہے کون؟“ اس نے انگلی سے اچھو کے ماتھے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو بتائیں۔“

”کب سے یہاں ہے؟“

”ہفتہ ہونے والا ہے۔“

”کون لا پائے اسے یہاں؟“

”یہ بھی پتا نہیں۔“

”اسے یہاں کسی نے مارا بیٹا بھی ہے؟“

”وہ..... وہ شاید..... ہاشو خان کے ہاتھ پر کاٹا تھا اس لڑکی نے..... مرشد بھائی تم ہاشو سے پوچھ لو تا اسے ساری باتوں کا پتا ہوگا۔“

اچھو غائب اپنی جان چھڑاتا چاہتا تھا۔

”یہ پکڑو۔“ مرشد نے مصلا اس کے منہ پر چٹخا۔

”یہ جا کے اماں کو دے۔“

مصلا اس کے حوالے کر کے مرشد وہاں رکائیں، سیدھا باہر آیا اور اپنی بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ بازار اور بالا خانوں کی تمام روشنیاں جل چکی تھیں۔ معمول کی روٹی شروع ہو چکی تھی اور اور گرد ساز عدوں کی سازوں سے جھیمڑ جھاڑی آوازیں بھی ڈوب ابھر رہی تھیں۔ کچھ ہی فاصلے پر چاچے کو گے کا کھوکھا تھا اور اس کے برابر فضلو تھائی کا کھجور جس پر اس وقت ساون اور مراد بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ مرشد انہی کی طرف بڑھ گیا۔

”چاچا! تین پیپسی کھول دے.....“ مرشد ساون اور مراد کے برابر بیٹھے پریشہ گیا۔

دائیں ہاتھ وہ..... سامنے بیٹھک کا دروازہ تھا اور دروازے کے باہر جعفر اور اکو کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔

”سنا ہے موالی پھر واپس آ گیا ہے۔“

مراد نے کہا۔

”کدھر سے سنا ہے؟“

”یہ ابھی چاچا جی بتا رہا تھا۔“

”عصر کی اذان کے وقت یہیں بیٹھا تھا بیٹھے پر۔“

چاچا نے تین بوتلیں لاکر ان کے درمیان رکھ دیں۔ ایک ٹھوڑی مٹی اور ایک ریڈیو لیے بیٹھا تھا، جتنی دیر بیٹھا ریڈیو سے ہی الجھا رہا، ریڈیو کچھ بولا نہ وہ خود پھر خاموشی سے اٹھا اور ادھر کو سیدھا ہی نکل گیا، پہلے سے کچھ کمزور نظر آ رہا تھا۔

دو گاہک آئے تو چاچا بات کرتے ہوئے اپنی جگہ جا کھڑا ہوا۔

”جب تک ادھر رہے خیر خبر رکھنا اس کی..... اپنے پر ذمہ داری بنتی ہے۔“ مرشد نے کہا تو ساون اور مراد دونوں نے گردن ہلا دی۔

موالی کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا اس بارے میں یقینی طور پر تو کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، بس رنگ برنگی باتیں ہی تھیں، اس کا ذہنی توازن بھی درست نہیں تھا۔ مرشد اسے بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا، وہ فقیروں ملکوں کے سے انداز میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا رہتا تھا، یا تو بالکل صم گم اور چپ چاپ یا پھر بغیر وقفے کے بے ٹکان بولتا ہوا..... انداز اور رنگ ڈھنگ ایسے ہوتے تھے کہ بازار والے اسے موالی مانگ کہتے لگے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی نواب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا مگر یہاں کی کسی طوائف کے چکر میں پڑ کر پھیل کر نکال ہوا اور پھر بالکل ہو گیا۔ کچھ کا ماننا تھا کہ وہ کسی دوسرے شہر کا بدعاش تھا، یہاں کی ایک طوائف کے عشق میں جلا ہوا اور ہوش دھوا اس لانا بیٹھا، تب سے یونہی دیوانوں کی طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔

مرشد کو کو عمری ہی سے اس کے ساتھ ایک ترجمان ملا گاؤ رہا تھا۔ بعض اوقات وہ ہفتوں غائب رہتا، نجانے کدھر چلا

بھی وہ چوکی تھی، جس وقت وہ سر جھکائے بیٹھی اپنے متعلق تفصیل بیان کر رہی تھی تب اس نے حسن آرا کے چہرے کے بنتے بگڑتے تاثرات تو نہیں دیکھے تھے البتہ اسی دوران جب وہ غیر محسوس سے انداز میں پلنگ سے سرک کر نیچے قائلین پر اتر بیٹھی تو حجاب چونک پڑی تھی۔ اس کے بعد سے حسن آرا کا اس کے ساتھ بات چیت کا انداز بھی کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ مگر حجاب نے زیادہ غور نہیں کیا تھا، ویسے بھی وہ تو اپنے کھر ٹھنڈے چھینے میں لگی ہوئی تھی مگر اس بار وہ بے ساختہ بول پڑی۔

”خالہ؟ آپ..... یوں نیچے کیوں بیٹھ رہی ہیں..... یہاں..... اوپر بیٹھیے نا۔“
 ”نہیں، میں بس یہیں ٹھیک ہوں۔“
 ”ایسے کیسے بھلا۔“

حجاب پلنگ سے اترنے لگی تو حسن آرا نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
 ”آپ بیٹھیے، یہیں بیٹھیے آپ۔“
 حجاب نے دیکھا کہ حسن آرا کے چہرے پر نفاہت کے اثرات پھیلے ہوئے تھے۔

”نہیں خالہ..... مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ..... آپ ادھر اوپر بیٹھیں، نہیں تو مجھے بھی نیچے اپنے برابر بیٹھنے دیں۔“

”ایسا مت کیجیے میں تو پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں، مجھے مزید گناہ گار مت کریں، آرام سے بیٹھیں آپ، میں ٹھیک بیٹھی ہوں باقی سب پریشانیاں بھی ذہن سے جھٹک دیں۔ میں انہاں کو اچھے سے سمجھا آئی ہوں اب آپ کو کوئی تنگ پریشان نہیں کرے گا۔“ حجاب متذبذب سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ گزشتہ کچھ دنوں میں کیا کچھ نہیں ہوا تھا، اس کے ساتھ..... مسلسل مار پیٹ..... غلیظ گندی گالیاں..... تذلیل ہی تذلیل، مگر اب..... اب یہ تھکی ٹوٹی سی عورت اور اپنے ساتھ اس کا یہ ناقابل یقین رویہ..... وہ حیران پریشان سی بیٹھی حسن آرا کی طرف دیکھتی رہی۔

”کیا اب وہ مجھے یہاں سے جانے دیں گی؟“
 حجاب کے انداز میں ہلکا ہٹ اور بے یقینی سی تھی۔
 ”کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟“
 ”واپس..... آپ..... اپنے گھر۔“

”کیا وہاں پہنچ کر آپ جاگیرداروں کی دسترس سے محفوظ ہو جائیں گی..... سب کچھ پہلے جیسا ہوگا وہاں؟“
 حسن آرا کے سوال پر حجاب کو چپ لگ گئی، حسن آرا مزید بولی۔

”جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں ہندی پور میں بڑی خرابی ہوئی ہوگی اور خدانہ کرے..... خدانہ کرے..... مگر حالات و واقعات یہی کہتے ہیں کہ آپ کے گھر والے خیر و عافیت سے نہیں ہوں گے..... ایسے میں آپ کا واپس اسی جگہ جا پہنچنا کسی صورت بھی آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگا، لہذا آپ ٹھوڑا حوصلے اور صبر سے کام لیں، میں ایک آدھ روز میں کسی طرح وہاں کے حالات معلوم کرانی ہوں، اور آپ کے گھر والوں تک آپ کی یہاں موجودگی کی اطلاع پہنچاتی ہوں، خدا بہتر کرے گا۔ تب تک آپ بے فکری سے یہاں آرام کریں..... آپ اب یہاں بالکل محفوظ ہیں۔“

”یعنی..... یعنی آپ کسی کو میرے گاؤں بھیجیں گی؟“
 ”ہاں جی! کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“
 ”کب..... کب تک؟“
 حسن آرا نے ایک ذرا سوچا۔

”کل صبح ہی کسی کو روانہ کرنی ہوں۔“
 ”آپ..... آپ سچ کہہ رہی ہیں نا خالہ؟“
 حجاب کو یقین نہیں آ رہا تھا وہ بنو حسن آرا کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سامنے بیٹھی یہ خوبصورت مگر مر جھائی ہوئی سی عورت سچ میں اتنی مہربان اور ہم درد طبیعت کی مالک ہے یا اس کے ساتھ کوئی نیا ڈرامہ شروع کیا گیا ہے، کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق..... جس عزت و احترام سے وہ حجاب کے ساتھ پیش آ رہی تھی وہ بھی حجاب کو حیرت اور الجھن میں ڈال رہا تھا۔

”ایک آدھ روز میں آپ کو خود ہی یقین آ جائے گا۔“
 ”خالہ! میرے بابا سائیں یا میرے کبھی بھائی تک ایک بار اطلاع پہنچادیں، میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

”نہیں، نہیں احسان کیسا بھلا! اپنی عاقبت سنوارنے کی کوئی کوشش کسی دوسرے پر کوئی احسان تھوڑی ہوتی ہے۔ میں تو خوش بخت ہو گئی ہوں کہ مجھے یہ موقع مل رہا ہے یہ تو

میرے رب کی مجھ پر کرم نوازی ہے کہ آپ کو کسی مشکل سے نکالنے کے لیے اس نے مجھ نصیب جلی کوچتا مجھے ذریعہ بنارہا ہے۔“

”آپ یہاں کے باقی لوگوں سے کتنی مختلف ہیں۔ بالکل الگ حراز ہے آپ کا سب سے کب سے یہاں ہیں آپ اور..... اور آپ یہاں پہنچی کیسے؟“ حسن آرا کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ کسسا کر رہی تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے سے کچھ ٹیکسٹس نکالیں اور انہیں دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”میں تو جنم جنم سے یہیں ہوں، یہیں پیدا ہوئی تھی میری ماں اور ماں کی ماں بھی اسی مٹی سے اُسی مٹی میں پھر یہیں ختم ہوئیں۔“

حسن آرا نے ایک طرف پڑی تپائی سے جگ اٹھا کر گلاس پانی سے بھرا اور دو گولیاں منہ میں ڈال کر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ دو تین گھنٹ پینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

”یہ نرہت بیگم میری سگی خالہ ہے اسی نے پالا ہے مجھے میری ماں کو خدا نے جو فرائض اور ذمہ داریاں سونپی تھیں ان میں آخری ذمہ داری مجھے جنم دینے کی تھی سو وہ مجھے پیدا کرتے ہی زندگی کی قید سے آزاد ہو گئی بالکل جوانی کے دنوں میں مر گئی تھی وہ۔“

حسن آرا نے پٹنگ کی سر ہانڈی سے تکیہ نکاتے ہوئے حجاب کو مخاطب کیا۔

”آپ ادھر ٹیک لگالیں۔“

”آپ یوں نیچے بیٹھی ہیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا خالہ۔“

”مجھے تو عادت ہے..... سکرمیں دور در ہوتا ہے اس لیے اکثر یہیں نیچے ہی سوتی ہوں سکون اور آرام ملتا ہے۔“

”تو پھر میں بھی نیچے ہی بیٹھتی ہوں۔“

حجاب نے ایک بار پھر پٹنگ سے اترتا چاہا تو حسن آرا نے دوبارہ ٹرپ کر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”نہیں، نہیں، ایسا مت کریں آپ خدا کے لیے یہیں بیٹھیں بلکہ ادھر تکیے کے ساتھ ٹیک لگالیں۔“

حسن آرا نے باقاعدہ اسے بازو تھام کر تکیے اور سر ہانڈی کے ساتھ ٹیک لگوا دی۔

”آپ بہت تھکی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں آرام

کریں میں آپ کے پاؤں دبا دیتی ہوں۔“ حسن آرا نے حجاب کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ ٹرپ اٹھی۔

”خالہ! یہ..... کیا کر رہی ہیں؟“

”آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں جو میرا فرض بنتا ہے۔ میرے لیے سعادت کی بات ہے۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ! کیوں اتنے عزت و احترام سے پیش آرہی ہیں مجھے..... مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔“

”اس میں شرمندگی کی بھلا کیا بات ہے اور آپ کا احترام و ادب تو مجھ پر واجب ہے۔ آپ سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہیں۔ رحمتہ للعالمین سے نسبت ہے آپ کو..... آپ کا احترام اور خدمت نہیں کروں گی تو خدا کے حضور کیسے پیش ہو سکوں گی آپ کے قدموں میں تو میری نجات ہے۔“

حجاب اپنی جگہ سائیکس بیٹھی حیرت زدہ نظروں سے حسن آرا کی صورت دیکھ رہی تھی۔

”میں نے پانی سب کو بھی بتایا ہے۔“ حسن آرا اپنی رو میں بول رہی تھی۔ ”بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے سب کو مگر ان کے دلوں پر پوری طرح سیاہی پھر چکی ہے عقول پر پردے پڑ چکے ہیں یا..... یا پھر آپ کی تم گساری اور خدمت کی سعادت خدا تعالیٰ صرف میرے حصے میں ڈالنا چاہتا ہے مگر..... میں تو خود گناہ زادی ہوں..... خود گناہ گار ہوں پھر بھی اگر یہ میرے حصے میں آئی ہے تو اسے صرف خدا کی کرم نوازی ہی کہہ سکتی ہوں میں۔“

حسن آرا بول رہی تھی کچھ عجیب سی کیفیت میں جا پہنچی تھی وہ اور یہ بات حجاب نے بھی بخوبی محسوس کی۔ حسن آرا بولتے بولتے ذہنی طور پر جیسے کہیں دور جا پہنچی تھی اس کا انداز خود دکلائی جیسا ہو گیا تھا۔

”سائیس تو یوں بھی پوری ہو رہی تھیں اور اب تو کوئی گھڑی بھی آخری ہو سکتی ہے۔ شاید آپ ہی کے ویلے میری مشکل آسان ہو جائے..... سکون کا کوئی بہانہ بن جائے..... بہانہ بن بھی تو جاتے ہیں نا دُر نہ کہاں سادات اور کہاں یہ گناہوں کی دلدل..... ایک سید زادی سیدی بی بی اور یہاں..... خدا کی کون جانے کون سمجھے۔“ حجاب کی آنکھوں میں نمی اترائی ادب و عقیدت کا یہ رنگ اس کے

لیے یا تو نہیں تھا البتہ یہاں اسے کسی سے ایسے اظہار کی توقع نہیں تھی، گزشتہ کچھ دنوں سے وہ مسلسل جس ذلت اور عذاب ناک کا شکار تھی اس میں قطعی غیر متوقع طور پر اچانک اس قدر عزت افزائی اس کے لیے ایسے ہی تھی جیسے جہنم میں جنت کی کوئی کھڑکی کھل آئی ہو۔

”بی بی جی! آپ میری اس محبت اور عقیدت سے بدگمان نہ ہوں اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔“
حسن آرا حجاب سے مخاطب ہوئی۔ اس کی آنکھیں اور لہجہ اب بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔

”نہیں خالہ! بدگمانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ تو میری محسن ہیں۔ آپ یہاں نہ ہوئیں تو میں تو جیتے جی ہی مر گئی ہوتی۔ بس آپ بزرگ ہو کر مجھے اتنی عزت دے رہی ہیں تو۔۔۔۔۔ مجھے عجیب سی شرمندگی ہو رہی ہے۔“

”بوزمیا ضعیف کہہ لیجیے بزرگی سے میرا بھلا کیا واسطہ؟“
اور آپ ادھر ٹیک لگا لیجیے لیٹ جائیے۔“

حسن آرا نے دوبارہ بازو پکڑ کر حجاب کی فیک لگوادی۔
چھت والا نکھلا چل رہا تھا، کمرے کی بٹنی دیوار میں موجود کھڑکی اور اوپر چھت کے قریب موجود روشندان سے موسیقی کی آواز کمرے کے اندر آ رہی تھی۔

”کھانا لاؤں آپ کے لیے؟“
”نہیں خالہ! کچھ دیر پہلے ہی تو کھایا ہے۔“

”دودھ؟“
”نہیں! ابھی کسی چیز کی طلب نہیں! آپ بس میرے گھر تک اطلاع پہنچا دیں اب۔“

”وہ تو کل پہنچ جائے گی۔“
”ہاں نہیں وہ سب کس حال میں ہوں گے! کیا گزری ہوگی ان سب پر؟“

”خدا بہت غفور و رحیم ہے وہ سب ٹھیک کر دے گا! آپ اب سوچ سوچ کر خود کو مزید ہلکان مت کریں۔“

حجاب کو معلوم بھی نہیں ہوا اور کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ حسن آرا نے بھی اس کی بے آرمی کے پیش نظر اسے نہیں چھیڑا، بس خاموش بیٹھی گہری سنجیدہ نظروں سے اس کی اجلی اور بھولی صورت کو دیکھنے لگی۔

تین بار آنکھ لگی تھی اور تینوں بار خواب میں ایک ہی

صورت دکھائی دی تھی ایک ہی چہرہ مختلف زاویوں سے روشن ہوا تھا، آدھی صورت، ایک رخ، آنکھ کے قریب رخسار کی ہڈی پر کسی چوٹ، کسی ضرب کا ٹینگوں ہلائی نشان، سرخ انگوڑی جیسے ہونٹ کا درم زدہ گوشہ۔ سنجیدگی، سادگی اور۔۔۔۔۔ اور پھر پورے چہرے پر چھائی ہوئی دہشت، وحشت اور ہراس بھری آنکھیں۔۔۔۔۔!

اذان میں ابھی دیر تھی مگر مرشد اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ اس کے برابر چبوترے پر سداوں لینا سوراہا تھا، مراد اور جعفر کی آج چھت پر ڈیوٹی تھی۔

چبوترے سے دو قدم آگے لنگھان شیرے کے سے انداز میں بیٹھا تھا، اس کی پشت چبوترے کی طرف تھی اور منہ بیرونی دروازے کی طرف۔۔۔۔۔ وہ بھی جیسے چوکس بیٹھا اپنی کوئی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔

مرشد نے جب سے اس لڑکی کو دیکھا تھا، اسے ذہن سے جھٹکنے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر اب۔۔۔۔۔ رات کے اس آخری پہرہ وہ اس چبوترے پر بیٹھا شعوری طور پر اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا کس خرابی بات کیا وجہ ہے جو وہ لڑکی اس کے دماغ سے چپک کر رہ گئی ہے؟ جس طرح دھول مٹی میں پڑا گلاب کا پھول پاپھولوں کی چادر پر پڑا کوئی پتھر دوسری سے صاف اور واضح دکھائی دے جاتا ہے وہ لڑکی بھی اس ماحول، اس بازار میں کچھ ایسی ہی تھی۔۔۔۔۔ مرشد بچپن سے جو نسوانی چہرے اور آنکھیں دیکھتا پڑھتا آیا تھا، ان کے دونوں رنگ وہ بخوبی جانتا پہچانتا تھا، گھماگھما اور خرافات اور تجربہ کار چہرے، حیا کی پاکیزگی سے عاری آنکھیں۔۔۔۔۔ پھٹکی بھدی مسکرائیں، گھناہوں کے کچھڑ میں تھڑپے رنگ دروہ، اس سب کے بیچ وہ لڑکی یوں دکھائی پڑی تھی جیسے کچھڑ میں کنول کا کوئی نوخیز پھول۔ بالکل ان چھوٹا۔۔۔۔۔ دو تیز کی اور کوتاہی کی ایک ایسی جیتی جاگتی اور بولتی ہوئی صورتی جس کا سراپا پاکیزگی اور تقدس کا این محسوس ہوتا تھا، دوسری بات یاد ہے جو اسے سمجھ آئی وہ اس لڑکی کے چہرے پر پھٹکی گھبراہٹ و پریشانی اور آنکھوں میں بھرا خوف تھا جسے مرشد یہ سمجھتا رہا تھا کہ شاید وہ اسی سے خوف زدہ ہے، لیکن جب مرشد نے پہلے اسے بھی کہیں دیکھا ہی نہیں تھا تو پھر وہ بطور خاص اس سے خوف زدہ بھی نہیں تھی بلکہ اس کے رخسار کی ہڈی پر دکھائی

دینے والا چوٹ کا نشان اور دم زدہ ہونٹ غمازی کرتا تھا کہ وہ خوف زدہ کیوں ہے!

مرشد کو سمجھا گئی کہ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی بلکہ خود کو درپیش حالات و واقعات نے اس کے دل و دماغ میں خوف بٹھا دیا تھا جس کی ایک جھلک مرشد کو کل شام اس کے چہرے اور آنکھوں میں دکھائی دی تھی۔

کچھ دیر وہ یونہی چپوڑے پر چپ چاپ بیٹھا رہا پھر نہانے کی نیت سے اٹھ کر ہاتھ روم میں جا گھسا۔

نہانے کے بعد مرشد وہی دھوئی اور کرتا پہن کر واپس چپوڑے پر آ بیٹھا تھا، کنکان فوراً سرک کر اس کے پیروں میں آ گیا اور مرشد پیر سے اس کی گردن سہلانے لگا، کس محسوس کرتے ہی کنکان نے گردن بالکل ہی زمین پر ڈال دی۔ البتہ اس کی دم خوش گواری سے رقص کرنے لگی تھی۔

اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کچھ آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں..... چند مردانہ آوازیں تھیں، مرشد نے توجہ سے سننے کی کوشش کی..... باہر گلی میں دائیں طرف کچھ فاصلے پر شاید چند افراد آپس میں الجھ رہے تھے۔ رات کا

آخری پہر تھا، کچھ ہی دیر میں اذان ہونے والی تھی۔ ساری رونقیں کب کی خاموشی اور اندھیروں میں گم ہو چکی تھیں اور اب اس وقت باہر کچھ پھل کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔

مرشد نے ہاتھ بڑھا کر تنکے کے نیچے سے ٹول کر پھل نکالا، اسے دب میں لگایا اور دھوئی کی طٹائی میں کستا ہوا اٹھ کر بیر دنی دروازے کی طرف بڑھ گیا..... ساون بے سدھ سو

رہا تھا، البتہ کنکان فوراً اٹھ کر مرشد کے پیچھے لگا تھا..... وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، سارا ہا زار مکمل طور پر خاموش اور سناں پڑا تھا..... بس دائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر جہاں یہ

راستہ دو شاخوں میں تقسیم ہوتا تھا وہیں فیروزہ پانی کے کوٹھے کے بالکل سامنے پانچ چھ افراد موجود تھے اور ان کی آپس میں تو تکرار چل رہی تھی، دو کو تو مرشد نے پہچان لیا تھا، ان میں سے ایک لگا تھا اور دوسرا الیا سا چوٹی۔

”اوچوٹی! کیا بات ہے کیا ذرا امہ لگا رکھا ہے؟“

مرشد نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے بلند آواز میں

پوچھا۔

”کچھ نہیں باواجی! بس یہ باؤ صاحب کو تھوڑی چڑھ گئی ہے۔“

مرشد نے الیا سے اور بگے کی طرف دیکھتے ہوئے

استفسار کیا۔

”وہ..... فیروزہ کا عشق دماغ کو چڑھ گیا ہے ان بابو

”الو کے ٹھے! جاہل! کینے اور کن ملے بد معاش۔“

مرشد نے آواز کی سمت دیکھا، بائیں طرف ایک دکان کے سامنے فرش پر موالی ملک لیٹا ہوا تھا اور غالباً ان آوازوں سے اپنی نیند میں خلل پڑنے کی وجہ سے ناگواری اور بیزاری کا اظہار کر رہا تھا۔

مرشد اس پر توجہ دینے بغیر الیا سے لوگوں کے پاس پہنچ آیا۔ ان کے سامنے تین خوش لباس اور خوش شکل آدمی کھڑے تھے..... تینوں نشے میں تھے البتہ ایک کچھ زیادہ ہی دھت تھا اور وہی بگے اور الیا سے کے ساتھ الجھ رہا تھا۔

”تم پیسہ بولو..... صرف پیسہ بولو..... جتنا بولو..... میں دیتا ہوں..... پیسے میں تول دوں گا تم سب کو..... فیروزہ کے وزن کے برابر تول..... تول کے دوں گا میں..... بولو۔“

”او بابو صاحب! جاؤ اب اپنے گھر جاؤ یا ر..... ہماری کھوپڑی مت لگاؤ۔“

”زریون! ابھی چلو پلیز..... صبح ہونے والی ہی کل دوبارہ آ جائیں گے اور نسلی سے ساری بات چیت کر لیں گے۔“

اس کے ایک ساتھی نے اسے بازو سے پکڑ کر سمجھایا تو اس نے ساتھی کو جھڑک دیا۔

”شٹ اپ۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے زریون! ابھی، ہمیں چلنا چاہیے کل پھر آ جائیں گے۔“

”شٹ اپ اور باؤ تھوڑو ڈبو۔“

دوسرے ساتھی کی مداخلت پر اس زریون نامی شخص نے اسے بھی جھاڑ پلا دی۔

”نیمری زندگی میں، کل کبھی نہیں آیا، سمجھے تم؟ کل نہیں آیا..... کل..... مجھے اس سے آج ملنا ہے ابھی ملنا ہے۔“

ان تینوں کے رنگ روپ، پہناوے اور لب و لہجے سے بالکل واضح تھا کہ تینوں جوان اعلیٰ طبقے اور اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ الیا سا اور بگے بھی شاید اسی وجہ سے کوئی سخت رویہ نہیں دکھا رہے تھے۔

”کیا مسئلہ کیا ہے؟“

مرشد نے الیا سے اور بگے کی طرف دیکھتے ہوئے

استفسار کیا۔

”وہ..... فیروزہ کا عشق دماغ کو چڑھ گیا ہے ان بابو

کے..... ساری رات خدمت کی ہے اور اب یہ ذلیل ہی کرنے پر تل گئے ہیں..... جان ہی نہیں چھوڑ رہے۔“
 ”تم لوگ صرف سیسے کی بات کرو..... ابھی ختم ہو گئے تو کیا..... میں ابھی منگوا بھی لوں گا..... جتنے تم بولو۔“
 نشے کی زیادتی کے باعث اس کی زبان لڑکھرائی تھی۔
 آواز ہی کی طرح وہ خود بھی کھڑا کھڑا جیسے ڈنگا رہا تھا ہولے ہولے جھول رہا تھا! اچانک وہ مرشد سے مخاطب ہوا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”تم مجھے شکل سے شریف اور..... اور سمجھدار آدمی دکھائی دیتے ہو..... تم بتاؤ! تم بتاؤ! کہ کیا میں..... میں غلط کہہ رہا ہوں..... میں وقت کی قیمت..... دینے کو تیار ہوں۔“
 چند قدم کے فاصلے پر ادھر ادھر سوگھتا پھرتا کنگان ٹھٹک کر زریون کو کھورنے لگا تھا۔ اس نے سفید کلف لگے کاشن کے شلوار قمیض پر ایک قمیض قسم کی سیاہ واسنٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ سر کے بال منگڑیا لے تھے اور چہرے پر مشین سے رشی ہوئی باریک اسٹائلش داڑھی..... مرشد نے اس کے خوب رو چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”رب نے تمہیں اچھی پر وقار شخصیت دی ہے جوان! کیوں اس وقار کو یہاں یوں پامال کرنے کی ضد پر تلے ہو..... ہوش کرو۔“

”کیا!.....! اس نے بغور مرشد کی طرف دیکھا پھر تعجب سے باقی لوگوں کی طرف۔

”کیا..... میں نے کچھ غلط کہا ہے کیا؟ کیا غلط..... کہا ہے میں نے!“

”مرشد کوئی رولا ہے کیا؟“

مراد کی آواز پر مرشد نے رخ پھیر کر دیکھا..... مراد اور جعفر بیٹھک کے دروازے کے سامنے کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ جعفر کے ہاتھ میں رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”کوئی رولا نہیں، سکون کرو۔“

مرشد اسے جواب دے کر دوبارہ زریون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جاؤ جوان! گھر جا کر آرام کرو رات کے لیے حوصلہ اکٹھا کرو اور پھر آ جاؤ..... ابھی جا کے آرام کرو۔“

”حوصلہ بہت ہے..... بہت حوصلہ ہے، یہاں.....

ادھر۔“ اس نے اپنی چھاتی ٹھونکتے ہوئے کہا۔
 ”تم لوگ اب ادھر سے دفع ہوؤ گے یا پھر میں جوتا لے کے آؤں ادھر؟“ مرشد نے دیکھا موالی ملک اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور اس کی گھسی پٹی چپل اس کے دائیں ہاتھ میں دبی تھی۔

”ایں..... اب اس موصوف کو کیا..... تکلیف ہوئی ہے۔“ زریون منہ میڑھا کر کے موالی کی طرف دیکھنے لگا۔

”زریون! اب چل پڑو۔“ اس کا سامھی دوبارہ بولا تھا۔
 ”کدھر کو چل پڑو؟“

”دیکھو زریون! اگر تم نے ہماری بات نہیں سنی مانی تو پھر ہمیں اجازت دو ہم آئندہ تمہارے ساتھ کوئی فنکشن یا پارٹی اسٹینڈ نہیں کریں گے۔“ دوسرا سامھی بھی بول پڑا۔

ان دونوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اب یہاں صورت حال خراب بھی ہو سکتی ہے۔ لہذا دونوں ہی کے چہروں پر فکر مندی اور تشویش کے آئینہ بھرا آئے تھے۔

”تم دونوں کو کیا براہم ہے؟“
 ”یہاں سے چلوں..... ورنہ ہم یہاں سے سیدھے جاتے ہیں آغا جی کے پاس اور پھر وہ خود ہی آ کر لے جائیں گے تمہیں۔“

”دھونس دے رہے..... ہو مجھے۔“

”ابے! تم لوگوں کو سمجھ نہیں آئی، میں نے کیا بکواس کی ہے؟ اگر بڑی میں بھونکوں کیا؟“ موالی نے دوبارہ آواز لگائی اور گھسنے ہوئے قدموں سے دو تین قدم گے چلا آیا۔
 ”او موالی..... تیرے کو کیا جوش چڑھ رہا ہے بیٹھ جا سکون سے۔“

جعفر نے موالی کو مخاطب کیا..... تو وہ وہیں سے جعفر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ذلیل کر مارا ہے انہوں نے میرے کو روز روز کا تماشا ہے۔ جدر بھی جاؤں سر پہ سوار ہوا ویں ہیں۔ نہ خود سوویں مریں ہیں نہ میرے کو سکون سے مرنے دیویں ہیں۔“

”جاؤ جوان! گھر جاؤ۔“ مرشد نے زریون کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا پھر اس کے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔
 ”چلو لے جاؤ اسے..... تم لوگ بھی جاؤ اب۔“

اس نے آخری جملہ بگے اور الپا سے سے کہا اور خود بھی

موالی نے بغیر ہلنے کہا..... مرشد مراد اور جعفر تینوں کے
چروں پر مسکراہٹ تھی۔
”کیا مسئلہ تھا دھڑ؟“
”کچھ نہیں، طرف سے زیادہ چڑھائے پھر رہے تھے
بس۔“

مراد کے سوال پر مرشد نے کہا اودھو اندے سے اندر
داخل ہوا۔ بھی اذان کی آواز بلند ہوئی، سادوں ویسے ہی غٹ
پڑا سو رہا تھا، مراد اور مرشد تو اس کے قریب ہی چپوترے
پر بیٹھ گئے البتہ جعفر جھٹ پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف
بڑھ گیا۔
باہر سے کسی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی جو فاصلے سے
قریب آئی اور پھر آگے نکل گئی۔

مرشد حسب عادت سر جھکا کر بیٹھا اذان سن رہا تھا۔
مراد سولے پڑے سادوں کے ساتھ چھپر خانی میں مصروف
ہو گیا اور جعفر بیڑیوں پر پہنچ چکا تھا کہ چاک فضا فائرنگ کی
آواز سے کوچ آگئی۔ جعفر ٹھٹک گیا، مرشد اور مراد بھی بری
طرح جھپک پڑے۔ آواز باہر سے بلند ہوئی تھی۔ اوپر تلے
تین فائر ہوئے تھے۔ موالی کی بے مٹی آواز کے ساتھ ساتھ
کھان کی ٹیڑی ہوئی چیخ نما آواز بھی سنائی دی تھی۔ اگلے ہی
لمحے مرشد ڈب سے چٹل نکالتے ہوئے اٹھ کر بیرونی
دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

”بادا جی باہر مت جاؤ۔“
”مرشد رک جاؤ۔“

جعفر اور مراد نے ایک ساتھ اسے پکارا تھا مگر مرشد اتنے
میں دروازے تک پہنچ چکا تھا، سادوں بھی ہڑ بڑا کر اٹھ
بیٹھا۔ ٹھیک اسی وقت یکے بعد دیگرے تین چار فائر مزید
ہوئے اور انہوں نے مرشد کو منہ کے بل کرتے ہوئے
دیکھا۔ سادوں مراد اور جعفر تینوں دیوانہ وار دوڑتے ہوئے
مرشد کی طرف لپکے تھے۔

(ان شاء اللہ بابتی آئندہ ماہ)



واپس بیٹھک کی طرف چل پڑا۔
”چلو رین! گاڑی تک تو چلنا پڑے گا۔“
”کیسے دوست ہو تم لوگ..... میری..... میری فیلنگو
کو نہیں سمجھتے تم۔“
”فی الحال تم ہماری فیلنگو کو سمجھو پلیز۔“
”اودھ..... اس طرف۔“

مرشد عقب میں ان کی آواز سن رہا تھا واپس آ گیا۔ اس
کے قریب آ جانے پر موالی اس سے مخاطب ہوا۔
”اؤے مرشد! تو بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ یعنی
اب تو بھی میرے ساتھ دشمنی کرے گا؟“
”کیا پریشانی ہے تجھے، کیا ہو گیا ہے؟“
”تم لوگ میرے کو سونے کیوں نہیں دیتے؟“
”کس نے منع کیا ہے تجھے سونے سے؟“
”تم لوگ زیادتی کر رہو میرے ساتھ۔“
”ابھی کوئی زیادتی ہوئی تیرے ساتھ۔“
مرشد کے ساتھ ہی موالی بھی بیٹھک کے سامنے جعفر
اور مراد کے قریب چلا آیا۔

”دیکھو جب میری نیند تم لوگوں کے جگا رہے میں
رکاؤٹ نہیں بنے ہے تو پھر تم لوگوں کا جگا را میری نیند میں
رکاؤٹ کیوں بنے ہے؟“

وہ اپنے جھاڑ جھکاڑ چہرے پر گہری سنجیدگی لیے
”مفسر اند نظروں سے مرشد کی صورت تک رہا تھا۔
”تو سونے سے پہلے توڑی افیم کھالیا کرتا۔“
مراد کے مشورے پر موالی نے سخت ناگواری سے اس کی
طرف دیکھا۔

”تیری ماں بیچے ہے کیا؟ اگر بیچے ہے تو لا دے
کھالیا کروں گا۔“
”تو اس کے منہ نہ لگ آ تجھے کھانا کھلاؤں۔“ مرشد
نے فوراً مداخلت کی تھی۔

”اس کو کھلا دے۔“

موالی نے مراد کی طرف اشارہ کیا اور جھٹکے سے پلٹ کر
اپنی جائے آرام کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں پڑے ایک بوے
سے ریڈیو اور ایک ٹیڑی کا کھان جائزہ لیتا پھر رہا تھا۔

”اچھا آ جائے پلاتا ہوں۔“

”وہ اس کی ماں کو پلا دے..... افیم والی کو۔“